# خطبات حکیم الاسلام

نعمانی پبلشنگ کمپنی
یوسف مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار
لاہور ٥ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحفہ از
جناب پروفیسر مظفر محمود خان

# خطباتِ حکیم الاسلام

جلد ہفتم

افادات

از


حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نوراللہ مرقدہ
سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند



ناشر
نعمان پبلشنگ کمپنی

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون : 7241703 فیکس :

نام کتاب خطبات حکیم الاسلام کامل جلد ہفتم

ازافادات قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ **دارالنشر** یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون :7356963

کمپوزر دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائنگ حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون نمبر 7241703 فیکس نمبر

قیمت ..................


## ملنے کے پتے


☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب فائر بیگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ ۱۷ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ مکیہ 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحیمیہ چونگی نمبر 2 اڈہ بازار اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد

☆ عزیز کتاب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱


## سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات


☆ مکتبہ المیزان القرآن رزمک اڈہ میرانشاہ صوبہ سرحد

# فہرست مضامین خطبات حکیم الاسلام جلد ہفتم

# خطبہ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاهد و مدارس دینیہ ہی بر صغیر میں در حقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔
اسی طرز فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے --- اور آج بحمد اللہ تعالیٰ ایشیاء افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علماء دیوبند علمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## خطبۂ استقبالیہ

**الحمدللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفی اما بعد**

صدر محترم! حضرات گرامی، علمائے کرام، مہمانان عظام و معزز حاضرین!!

ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو بر صغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ "جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیوبند" میں بین الاوطانی انداز سے منعقد ہو رہا ہے جس میں تقریباً تمام اسلامی منطقوں کے فضلاء اور ارباب دانش جمع ہیں، سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات، ربط باہمی اور اسلامی اخوت و مودت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقعہ عطاء فرمادیا۔ ہم اس موقع پر اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج یہ کبرائے ملت، ہم غرباء امت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے، نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت، مساوات اور مودت باہمی کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں، جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مَااَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ.

اس پر جتنا بھی؟ شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

ہم بصمیم قلب دعاء گو ہیں کہ اہل علم کی ہمت افزائی اور ملت اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمین علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں! آمین

## شکر و سپاس

اس کے بعد میرا سب زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ' اپنے ادارہ کے اساتذہ' شیوخ' طلبائے عزیز' فضلاء گرامی' مسلمانان ہند' جمیع کارکنان' ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کروں' جنہوں نے مشرق و مغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیت اور اجتماعیت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پر از مودت واخوت چہروں کو چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں' جس میں علماء و عرفاء بھی ہیں اور اصحاب حدیث و تفسیر بھی' ارباب فقہ واصول بھی ہیں اور دانایان فلسفہ وکلام بھی' علوم شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علوم جدیدہ کے دانشور بھی' عمائد ملک وملت بھی زعماء ممالک واقوام بھی' جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی موقر خدمت سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں۔ جب کہ الفاظ تو جذبہ امتنان و منت پزیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں' لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے۔

داماں نگاہ تنگ گل حسن تو بسیار

ہم زبان و بیان بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روح اسلامی سے مملو پر خلوص جذبات تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ!

"جزاکم اللہ فی الدارین خیرا" وابقاکم فی عزعلی الدوام

(آمین!)

## دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی

حضرات محترم!

"یہ بستی "دیوبند" جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانے سے یہ بستی برادران وطن کی ایک زبردست تیر تھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو "دیوی کنڈ" کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیت کی حامل ہے، اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام "ڈیبی بن" تھا جو کثرت استعمال سے "دیوبند" کے نام سے مشہور ہو گیا"۔

اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے، سو سے اوپر سجدیں ہیں جن میں متعدد مساجد شاہی زمانوں کی یادگار ہیں، آدینی مسجد "یعنی قدیم جامع مسجد" پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے جس کے سنگین کتبے پر بہلول شاہ ثبت ہے۔ مسجد خانقاہ عہد اکبری کی یادگار ہے "مسجد سرائے پیرزادگان عہد جہانگیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸۷ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۵۳ دقیقہ طول البلد ہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم، جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے اس بستی سے ہو کر گزرتی ہے، اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن قدرت کو اس کی مرکزیت سے شرعی مرکزیت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر اہل دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے "جس کی تفصیل تاریخ دارالعلوم" میں دی گئی ہے ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں، فاضلوں، قادر الکلام ادیبوں، آزادی کے جانبازوں اور دینی میدان کے، سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی، یا باسباب ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں، ذکر ا تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کے جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی گن میں ہونے والا تھا۔

### قیام دارالعلوم کا پس منظر اور اسباب تاسیس

وقت آیا تو ۱۸۵۸ء کے ہنگامہ رست وخیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی وعرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا جبکہ ہندوستان کی باگ انگریز کے ہاتھ میں جا چکی تھی،

اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا' جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بزوال تھے' دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے دینی شعور رخصت ہو رہا تھا' جہالت وضلالت کی گھٹائیں افق ہند پر چھا چکی تھی' سنن انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم ورواجات' مشرکانہ بدعات وخرافات اور ہوا پرستی زور پکڑتی جا رہی تھی جس سے دہریت والحاد فطرت پرستی' آزاد فکری' بے قید نفس اور فوضویت کی وباء پھوٹ پڑی تھی چمن اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ وروغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی' مسلمان مضطرب وبے چین اور مایوسی کا شکار تھے' علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلاوطنی کے مصائب اس وقت چند نفوس قدسیہ نے اپنے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملی وجود کے تحفظ اور علوم نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں دینی شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیات نو کس طرح بخشی جائے؟ تو یہ صلحائے امت کمر ہمت باندھ کر میدان میں آئے جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم وتربیت اور علم وعمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمان کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۲۲ کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاء دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ کی مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آچکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا' دونوں کا نام محمود تھا۔۔۔ایک محمود معلم تھا اور ایک محمود متعلم۔۔۔جو بعد میں شیخ الہند امولانا محمود حسن کے نام سے معروف زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ' نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار واعلان کا تخیل' صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ جس کی تلقین اور تاکید خود بانی اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے ہشتگانہ اساسی اصول میں بار بار بشد ومد کی گئی ہے۔

## دارالعلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک

غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا جس کے دوررس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے' چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی' اس طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاء دین تحریک جو "محمودین"

سے شروع ہوئی' ابتداً محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی' مگر اہل نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی سے ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشاۃ ثانیہ کا مصدر و منشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں یہ تعمیری تحریک بھی بانی اعظم کے فکر پر علمی رنگ سے اٹھی جو نہ صرف علم دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آنکہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد ہندوستان کو آزاد کرالیا وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے' تخریب اگر عالمی انداز کی تھی تو اس کے رد عمل کے طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ و امریکہ تک اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں' ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا' جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی و سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ء ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیمہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے' ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداء آہنی تلوار سے کیا پھر امن اور علم کی ناقابل شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دور رس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے مؤسسین' فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

## دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد

اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اصل مقصد کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج' اس کی ملی تمرین اور عمومی اشاعت اور تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ منافرتوں کا استحصال کر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتب فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف موانست و محبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہنے پائے' نصاب میں حفظ قرآن سے لے کر تفسیر' اصول تفسیر' حدیث' اصول حدیث' فقہ اصول فقہ کلام بلاغت و بیان' حقائق و اسرار اور ان منقولات کے ساتھ علوم معقولہ' منطق فلسفہ' ریاضی' ہیئت' عروض و قافیہ مناظرہ اور اختیاری فنون' مبادی سائنس' معلومات عامہ' علم طب' صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصاب درس میں شامل کیں تاکہ

کوئی بھی علمی، عملی، اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ وکلیہ کی حیثیت وصورت دی گئی ہے۔ جیسے مدرسۃ القرآن، مدرسۃ التجوید، مدرسۃ فارسی وریاضی، کلیۃ الطب، کلیۃ الصنائع، کلیۃ اللغۃ العربیہ اور کلیۃ التفقہ والافتاء وغیرہ، اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کرلی اور الحمدللہ ہر ہر فن کے متخصص تاحال اس سے ۱۶ ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بسال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرسین بھی ہیں اور مبلغین بھی، خطباء بھی ہیں اور مقررین بھی، زعماء بھی ہیں اور مفکرین بھی، مصنفین بھی ہیں اور مورخین بھی، اطباء جسمانی بھی ہیں اور مصلحان روحانی بھی۔ فضلا دارالعلوم کی مذکورہ ۱۶ ہزار تعداد بلاواسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیوبند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں مستفیدین نہ صرف برصغیر میں بلکہ ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانی دارالعلوم اور جملہ بزرگان دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے، چنانچہ حضرت الامام بانی دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کے علاوہ جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے۔

دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد مدارس دینیہ ہی برصغیر میں در حقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہین۔ اس طرز فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمد اللہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علمائے دیوبند علمی تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہ تعلیم وتربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباع سنت نبویؐ کے راستے پر مسلمان کو قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیت اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

**انما بعثت معلماً... بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔**

یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے۔ جو حدیث اول کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے۔ اس لئے علماء دارالعلوم نے دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں!

**ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا ماتمسکتم بھما کتاب اللہ و سنت رسولہ (ابن ماجہ)**

## دار العلوم کی تصنیفی خدمات

اس مکتب فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے تو اس سلسلے میں علماء دیو بند کے قلم حقیقت رقم نے پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برصغیر کے ہر اسلامی مکتب فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ آغاز دار العلوم ہی سے شروع ہو گیا تھا خود حجۃ الاسلام حضرت بانی اعظم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصانیف ۲۵ سے زائد ہیں، جن میں علم کلام، عقائد اور فقہیات وغیرہ کو عقلی اور حسی دلائل سے مبرہن کیا ہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنا دیا، دار العلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے ان میں سر فہرست نام مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے جو موصوف نے ہر علم و فن میں نثر و نظم میں عربی، فارسی اور اردو میں مدون فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دار العلوم دیو بند، حضرت مولانا عبد العزیز صاحب گوجرانوالہ پاکستا، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سابق مدرس دار العلوم دیو بند و محدث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دار العلوم دیو بند پھر ان کے تلامذہ میں "حضرت شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی" "صاحب فتح الملہم"۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدث مدرسہ امینیہ دہلی و صدر جمعیت علماء ہند حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مدیر رسالہ "القاسم" و "الرشید" دیو بند، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیو بند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب سابق صدر مفتی دار العلوم دیو بند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دار العلوم دیو بند، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی محدث دار العلوم دیو بند، پھر حضرت علامہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے تلامذہ میں۔

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدیر برہان دہلی، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" "لکھنوی"، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے جس کی تصنیفات سو ۱۰۰ سے اوپر ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحق صاحب بانی دار العلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سید محمد میاں صاحب محدث مدرسہ امینیہ دہلی مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزارہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلے میں بھی یہ مکتب فکر برصغیر کے تمام مکاتب فکر سے آگے اور ممتاز ہے۔ جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دار العلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عمل صالح، اخلاق فاضلہ اور کثرت ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جو فی زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم وبدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزت نفس، وقار، استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری تواضع، زہد وتقویٰ اور صلاح ورشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

دار العلوم دیوبند برصغیر کے مدارس وجامعات میں ام الجامعات ہے اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے جس کے فیضان سے ہزارہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بیشمار افراد طریق سنت پر لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگری محسوسات چونکہ نقلیات دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی۔ اس لئے انہی فضلائے دار العلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصیفیں سطح پر لا رکھیں جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات، تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ چاک ہو گیا۔

ان فضلائے گرامی کو اگرچہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن بہت پہلے سے اپنی خدمات وتعلیمات سے خود سند ومستند ثابت ہو چکے ہیں۔

## جامعہ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز

اس دار العلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے جو قرآن حکیم کی اولین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اولین سرچشمہ ہے اس لئے کہ فن حدیث کی تکمیل سے قرآن مبین اور فقہ فی الدین کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام وبلاغت ومعانی، ادب عربی اور صرف ونحو مبادی واسباب یا بطور آثار ونتائج

پڑھائے جاتے ہیں۔

## دار العلوم دیو بند کا سلسلہ سند

اس دار العلوم کا سلسلہ سند اساتذہ دار العلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تک' اور ان سے سند متصل کے ساتھ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے۔ دار العلوم کی جماعت خالصۃً اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور فقہ پر قائم ہے۔ اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔ اس لئے فضلائے ادارہ کتاب و سنت کی مرادات اقوال سلف سے' ان کے متوارث تعامل و ذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ شیوخ کی تربیت و صحبت اور معیت و ملازمت سے حاصل کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی مکتب فکر عقل و درایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہم کتاب و سنت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

## جامعہ دار العلوم کا انتظامی طریقہ کار

انتظامی حیثیت سے اس دار العلوم کی تعلیمات و انتظامات کی نگران اعلیٰ ایک موقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء اور ارباب فکر و نظر فضلاء شامل ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں۔ ساٹھ اساتذہ اور دو سو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیم کار کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل اور نظام کی استواری ہے جس پر سالانہ ۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے۔ اس لئے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہو کر مجلس شوریٰ سے منظور کرلیا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرلیا جاتا ہے۔

## ملی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دار العلوم کی تاریخی خدمات

اس کے ساتھ دار العلوم کی سرگرمیاں محض درس و تدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی ملکی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدود شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا وہ ہر وقت علماء دیو بند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دار العلوم اور حضرت قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہی سرپرست اعظم دار العلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی' حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ مجاہدین کے قائد تھے' پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ سابق صدر مدرسین دار العلوم دیو بند اسی قیادت کو لے کر اٹھے

اور آزادی ہند کے لئے وہی ۱۹۱۵ء کی ریشمی خطوط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے، جس کا مرکز افغانستان اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور احمد انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے سرفروش مجاہدان کے دست راست تھے، اس راہ میں ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے، اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوش جہاد سے جمعیت علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاء دارالعلوم ہی کے تحت مصروف خدمت رہی۔

۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحری آزادی میں کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرہ عرب میں اسلامی حکومت کا پرداز ڈالا تو علماء دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صیہونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علمائے دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلاف سے بالاتر ہو کر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ و متفرق کرنے کے لئے جب بھی نزاعی مسائل کھڑے کیے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلائے دیوبند آگے بڑھے۔ چنانچہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم کی گئی، جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم کرتے رہے ہیں اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدنی اور اجتماعی میدان میں علمائے دیوبند اور مسلمانان ہند سے تعاون کریں، تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہو گی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا مذہبی معاملات مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا تو علماء دیوبند نے بیرونِ ملک بھی اس کے سدباب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرون ملک ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

### جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ

انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں، مگر دارالعلوم اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا

اور بحمد اللہ ان کی کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکمت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ بعض باطل پسندانہ تحریکات حضرت بانی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی لیکن حضرت بانی دارالعلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے خلاف ایک مضبوط بند باندھ کر انہیں ختم کر دیا۔

انکار حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہیں فضلائے دیوبند جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ اور راقم الحروف نے نہایت مدلل کتابیں تالیف کر کے اس کا سدباب کیا اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان کی مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیات اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاء شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مہتمم خامس دارالعلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمہ قضاء شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا، جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہو گئی۔ ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئی تو دارالعلوم ہی کی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برصغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماء ربانین اور فضلاء صالحین نے درس و تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو کبھی مکدر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلل تحریر و کتاب اور تقریر و خطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ دیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم و برقرار رکھا ہے۔

اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے کہ جن کی خدمات سے اطراف عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

### عصری بین الاقوامیت کے تقاضے

یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرہ عمل اپنی ہی

حدود تک محدود رہتا تھا لیکن آج وسائل نقل وحمل اور ذرائع علم وخبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں' اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالک ملک واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آگئی ہے اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی' سب بین الاقوامی رنگ ہی سے نمایاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں بھی مقامیت سے آگے بڑھ کر بین لاقوامیت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی' گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات واجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا' مؤتمر عالم اسلامی مصر' رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ' مؤتمر السیرت والسنہ "دوحہ وقطر" مؤتمر الجعرفی ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب عرب اور امارات متحدہ بھیجا نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلے میں متعدد اہل قلم نے مقالات ارسال کئے۔ اور آج دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم پر آشکارا کیا جائے' نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشتراک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجال علم وفضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراء گرامی سے استفادہ کیا جائے' ان خدمات کے پیش کرنے کا منشاء ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خودستائی کرنا نہیں حاشا وکلا بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کار فرما ہو' جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آسکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی علم اثر ڈال سکیں' اور وہ ایمانی اخوت' باہمی تعاون' علمی اشتراک اور فکری یکسانئ ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لاسکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرن اول کا نصب العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پست ہمتی دور نہیں ہو سکتی' جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے۔

اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد' آج اجتماعی آواز' اجتماعی شعور' اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر چل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع نہیں بنتی جب تک اس میں ہمہ گیری اور عالمیت نہ ہو اس لئے کہ آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی' تمدن ومعاشرت ہے تو بین الاقوامی' تجارت وصنعت ہے تو بین

الاقوامی، صلح وجنگ ہے تو بین الاقوامی، حتی کہ کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔

اس لئے قدرتی طور پر طبائع میں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پر دار زڈالا ہے۔ اس لئے یہ یہ سمجھتے ہیں۔ "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ" کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرت اسلام پکار رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی فلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی علمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید وسنت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالات وقت کے پیش نظر جامعہ دارالعلوم کی یہ خواہش بجا اور بر محل ہے کہ اس نئی صدی میں امت اسلام کے علمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تاکہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

## عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت

ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب زیادہ اہم مسئلہ دعوت اسلام سے بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے، عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم ورواجات اور کورانہ تقلید سے نشو نما پا رہا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اور بر سر اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندہ اور ہواء نفسانی سے ابھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدرانہ رابطہ قائم کر کے انہیں راہ پر لگانا ہے اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے بر سر اقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلا کر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصد دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کر سکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہر حال تقسیم عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی مناسب حال اصلاحی افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور فکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل کے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملی مشترک فنڈ کا وجود بھی بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاج اعتناء ہے اس عظیم دینی وملی مقصد وخدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر عملی اور علمی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے ہم اس کے آرزومند ہیں کہ ارباب علم وفضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے موقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا علوم اسلام کے تعلیمی جامعات ومعاہد سے ممکن حد تک یکسانیت تعلیم کے

ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہو جائیں اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہو جائیں' غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوت ایک بڑی قوت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی' تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے۔اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیا کریں وہیں معاندین اسلام کی لٹریچری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدباب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دارالعلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیش کش کے ساتھ چند مشورہ طلب نقاط بھی پیش کر دینے ضروری سمجھے' تا کہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آیندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوں۔

اس کے بعد میں اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدر معظم اور مہمانان کرام اور معزز حاضرین کا تہہ دل سے مکرر شکریہ تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

والحمدللّٰہ کثیرا اوّلاً واٰخراً

دعاجو ودعاگو

محمد طیب

رئیس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

۲۵؍ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

# اساس توحید

شریعت اسلامیہ کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے۔۔۔ مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو۔۔۔ تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے۔ مالک کے ارادے سے نفع ونقصان پہنچتا ہے۔۔۔ خود ہتھوڑا نفع ونقصان نہیں پہنچاتا' خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی' مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔۔۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔۔۔ جو مسبب الاسباب ہے' اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اس لئے عبادت اس کی' کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع نقصان ہے' نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے۔۔۔ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے' نفع ونقصان کا خالق نہیں ہے محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق بننا لازم نہیں ہوتا۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا............ اَمَّابَعْدُ............

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانبیاء پ ۱۷)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

# مدار حیات انسانی

**بزرگان محترم!**

کائنات میں زمین سے لے کر جس قدر بھی مخلوقات ہیں اور جس قدر اللہ نے اشیاء پیدا فرمائی ہیں وہ سب انسان کے لئے بنائی ہیں اور انسان کے کار آمد ہیں' کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان کا نفع یا نقصان متعلق نہ ہو۔

انسانی زندگی کا دارومدار انہی کائناتی اشیاء کے اوپر ہے' اگر زمین نہ ہو تو انسان کس چیز کے اوپر رہے' گزر بسر کرے؟ اگر آسمان اور اس میں ستارے' چاند اور سورج نہ ہو تو روشنی کیسے ہو؟ سورج کی گرمی نہ ہو تو کھیتیاں کیسے پکیں' چاند کی ٹھنڈک نہ ہو تو پھلوں میں رس کیسے پیدا ہو؟ اور ہڈیوں میں گودا کیسے پیدا ہو؟ ستارے نہ ہوں تو راستوں کا تعین کیسے ہو۔؟ جہازرانی کس طرح سے ہو؟ سمتیں کیسے معلوم ہوں؟ غرض زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے کار آمد نہ ہو۔

حیوانات ہیں تو وہ انسان کے کام آتے ہیں' کوئی انسان کو سواری دیتا ہے کوئی انسان کے کھانے کے کام میں آتا ہے' کسی جانور کی ہڈیاں انسان کو کام دیتی ہیں' کسی جانور کا چمڑہ کام آتا ہے' چمڑوں کے اوپر کا اون اور پشمینہ انسان کے کام میں آتا ہے غرض کوئی جانور ایسا نہیں جس سے انسان کا نفع متعلق نہ ہو۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں میں کوئی درخت اور جڑی بوٹی ایسی نہیں ہے جو انسان کے نفع کے لئے نہ ہو۔۔۔ سب سے زیادہ وہ چیز جس کو انسان نفرت سے پھینک دیتا ہے وہ فضلات' گندگی اور نجاست ہے وہ بھی انسان کے کار آمد ہے' اگر کھاد نہ ہو انسان کی کھیتی نہ اگے' تو وہ بھی کام دیتی ہے اور اس کی بھی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔ چنانچہ کھاد بھی ہزاروں روپے کے حساب سے بکتا ہے اور انسان کے کام آتا ہے۔۔۔ تو پاک چیز ہو یا ناپاک چیز ہو انسان کے لئے کار آمد ہے اور انسان کی زندگی ان چیزوں کے اوپر اٹکی ہوئی ہے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہو گی۔ انسان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔۔۔ سورج نہ ہو تب زندگی ختم' چاند نہ ہو تب ختم' ہوا نہ تب ختم' زمین نہ تب ختم' اس کی غذائیں نہ ہوں تب ختم' دوائیں نہ ہوں تب ختم' تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کی زندگی اس پر اٹکی ہوئی نہ ہو۔

## کائنات کی انسان سے بے تعلقی

لیکن ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہو گئی ہو' اگر سارے انسان ختم ہو جائیں تو سورج کا کچھ نہیں بگڑتا' چاند کا نہیں بگڑے گا' ایک بھی انسان باقی نہ رہے تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہیں' آسمان کا کوئی نقصان نہیں' پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔۔۔ درخت اور جڑی

بوٹیاں اپنی جگہ قائم رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو' اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں سوال یہ ہے کہ کیا انسان بیکار پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ نہ زمین کے کام کا' نہ چاند کے کام کا' نہ آسمان کے کام کا' آخر یہ انسان کس کام کے لئے بنایا گیا ہے' ان میں سے تو کسی کے کام کا نہیں ہے۔ کسی کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کو بیکار پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اللہ کی حکمت پر حرف آتا ہے حالانکہ وہ اس سے بری ہے کہ اس کی حکمت پر کوئی عیب یا حرف آئے۔ جب کھاد جیسی گندی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی تو کیا انسان جیسی اشرف المخلوقات کو اللہ نے بیکار پیدا کیا ہے؟ یہ کس مرض کی دوا ہے' غرض جب کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں تو انسان بھی بیکار تو نہیں ہو سکتا جبکہ یہ سب سے اونچا اور افضل ہے۔

## تخلیق کائنات وانسان میں باہمی ارتباط

اگر ان میں سے کسی چیز کے کام کا نہیں' پھر کس کام کا ہے۔ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مخلوق میں سے کسی کے کام نہیں تو پھر خالق کے کام کا ہو گا۔ اور کسی کے کام کا نہیں ہو سکتا۔

اب آگے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خالق کا کونسا کام انسان کے اوپر اٹکا ہوا ہے؟ اس کی مخلوق کا تو کوئی کام اٹکا ہوا نہیں تو خالق جو غنی ہے اور ہر برائی اور محتاجگی سے بری ہے' اس کا کونسا کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے جس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے اور طلب کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں ہر چیز ہے' اس کے خزانے بھرپور ہیں مگر ایک چیز اس کے خزانے میں نہیں ہے' اس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے۔ اللہ کے خزانے میں علم ہے' کمال ہے' عروج ہے' رفعت اور بلندی ہے' غناء اور استغناء ہے' مگر اللہ کے یہاں محتاجگی نہیں ہے۔ ذلت نہیں ہے' جھکنا نہیں ہے پس ماندگی نہیں ہے' انسان کو اس لئے بنایا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکے' اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے' اور اپنی محتاجگی نمایاں کرے تاکہ اس کی عزت وعظمت دنیا کے اوپر واضح ہو' اور اس کی رفعت وسر بلندی دنیا کے اوپر نمایاں ہو جائے' تو انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جھکے یعنی عبادت کرے' عبادت کے معنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اس لئے بنایا کہ یہ اللہ کے آگے اپنی انتہائی ذلت کرے تاکہ اللہ کی انتہائی عزت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ یہ یوں عرض کرے کہ ۔

> "اے اللہ! جیسے تیری عزت کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے' تیرے سامنے میں وہ ذلت پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حد ونہایت نہیں ہے انتہائی طور پر تیرے آگے پست ہوتا ہوں"۔

انسان میں سب سے زیادہ عزت کی چیز اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ اگر کوئی ذلیل بن جاتا ہے

تو کہا کرتے ہیں کہ "فلاں کی ناک کٹ گئی" یعنی وہ ذلیل ہو گیا' فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا' یعنی اسے ذلت پہنچ گئی' تو ناک اور پیشانی سے زیادہ بلند اور باعزت چیز انسان میں اور کوئی نہیں' انہی کو اللہ کے سامنے زمین پر رگڑا جاتا ہے تاکہ انسان کی انتہائی ذلت ظاہر ہو جائے۔

غرض اللہ عزت مطلقہ رکھتا ہے اسکے سامنے جو مخلوق مطلقہ پیش کرے وہ انسان ہے' اس کے بنانے کی غرض وغایت یہ ہے کہ یہ اللہ کے آگے جھکے اور ساری کائنات اس کے آگے جھکے' ہر چیز اس کے آگے چاکر اور نوکر بن کر پیش ہو' اور یہ اللہ کا نوکر بن کر اسکے سامنے کھڑا ہو۔

ان الدنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للاٰخرۃ۔(الحدیث)

"ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی اور تم آخرت کے لئے بنائے گئے"۔

تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے' دنیا تو تمہارے لئے بنائی گئی ہے' تم درخت اور پتھروں کے لئے نہیں ہو' درخت اور پتھر تمہاری چاکری کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تم چاند اور سورج کے لئے نہیں' چاند اور سورج تمہاری خدمت کے لئے بنائے گئے' تو

خَلَقَ لَكُمْ مَافِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا

"جو کچھ زمین میں ہے وہ سب انسان کے لئے ہے اور انسان پروردگار کے لئے ہے"۔

## کائنات میں انسان کا مرتبہ

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک شخص عظیم الشان بلڈنگ تیار کرے' کیوں۔۔۔؟ اس لئے کہ اس نے ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا جس سے اس کو محبت پیدا ہوئی۔ نکاح کر کے اس نے عورت کی ضرورت سے ایک بلڈنگ بنائی۔ تاکہ وہ راحت سے اس میں رہے اور گزر بسر کرے۔

بلڈنگ کے اندر اس نے ملازم رکھے' فراش رکھے' جھاڑو اور صفائی کرنے والے رکھے تاکہ مکان صاف ستھرا رہے' اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے' اس نے باورچی رکھے تاکہ بیوی بھوکی نہ مرے' اس کے لئے کھانا پکائیں' اس نے مشعلچی رکھے تاکہ رات کو مکان میں روشنی کریں' تاکہ اندھیرے میں رات کو اسے تکلیف نہ پہنچے۔۔۔ غرض جتنی بھی خدمت کی اشیاء ہیں وہ سب مہیا کیں' اور ہر خدمت کے خادم مہیا کئے۔۔۔ یہ سب بیوی کے لئے' اور بیوی کاہے کے لئے ہے۔۔۔؟

بیوی ان خادموں کے لئے نہیں ہے۔ فراش اور باورچی کے لئے نہیں ہے' مالک نے بیوی اپنے لئے رکھی ہے تاکہ ساری ضرورتیں اور خدمتیں بیوی کی ہوں اور بیوی میرے کام آئے۔

اگر بیوی خاوند کی خدمت سے انکار کر دے یا سرکشی دکھلانے لگے یا خاوند کو آنکھ دکھانے لگے۔ تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا بلکہ گولی مار دے گا' اس مکان کو بھی ترک کرے گا' اسے بڑھا دے گا' خادم بھی ختم کر دے گا' اس کی ضرورت سے یہ رکھے تھے' جب یہ میری وفادار نہ ہوئی تو

مجھے نہ بلڈنگ کی ضرورت ہے نہ خادموں کی ضرورت ہے' نہ فراش کی ضرورت ہے' اس پر تین طلاق' یہ اس قابل نہیں ہے کہ یہ یہاں رہے بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔

## خالق کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ

یہ صورت بعینہ انسان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی محبوب ترین مخلوق بنایا' اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا کہ کائنات کی کسی چیز کے ساتھ اس محبت کا برتاؤ نہیں کیا' عزت اسے دی' کھانے پینے کی اشیاء اسے دیں' دریا اور پہاڑ اس کے لئے بنائے' آسمان وزمین کی بلڈنگ تیار کی' اس میں سورج اور چاند کے ھنڈے لٹکائے تاکہ روشنی ہو' اس میں بادل بنائے تاکہ پانی برسے' ہوائیں چلائیں تاکہ مکان صاف ستھرا رہے۔ یہ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان مالک کے لئے اگر مالک کے کام نہیں آئے گا یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہوگا۔ اور اگر سارے انسان مل کر سرکش بن جائیں تو اس خیمے ہی کو بڑھا دیا جائے گا کہ نہ آسمان کی ضرورت ہے نہ زمین کی' جب یہ ہی قابل گردن زدنی بن گیا تو اب اس کے خدام کی ضرورت باقی نہیں رہی' تو یہ انسان کا نقشہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے کائنات انسان کے لئے بنائی گئی۔

ان الدنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للاٰخرۃ.

اب اگر وہی جس کے لئے بلڈنگ بنائی تھی اور خادم رکھے تھے۔۔۔ ایک تو یہ تھا کہ خاوند کی خدمت نہ کرے چھوڑے' تب بھی قابل گردن زدنی تھی۔۔۔ اور اگر اس سے بڑھ کر بیوی یہ حرکت کرے کہ کہیں اس نے کسی خادم سے آنکھ ملانی شروع کر دی' کہیں اس نے فراش سے آشنائی شروع کر دی' کہیں باروچیوں سے اس نے دل لگی کی باتیں شروع کر دیں تو اب زندہ رکھنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔۔۔ خاوند اس کو گولی مار دے گا کہ یہ تو بدکار اور فاحشہ ہے' یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔۔۔ جہاں تک میری خدمت ترک کر دی تھی' بری تو بنتی تھی مگر خیر۔۔۔ چھوڑ دینے کے قابل تھی' اسے چھوڑا جا سکتا تھا۔۔۔ جب مجھے چھوڑ کر اس نے دوسروں سے آشنائی شروع کی۔۔۔ اور وہ بھی اپنے باندی غلاموں سے' اب تو یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔

یہی حال انسان کا ہے۔۔۔ کہ اللہ نے یہ بلڈنگ بنائی اس میں خادم رکھے۔۔۔ کس طرح سے خادم رکھے۔؟

**کائناتی خدام** فراش رکھے تاکہ مکان صاف ہو۔ یہ ہوا جو ہے یہ اس کائنات کی فراش ہی تو ہے۔ اگر ہوائیں نہ چلیں تو کوڑا کرکٹ نہیں جا سکتا' تو اس بلڈنگ کے صاف کرنے کے لئے اللہ نے ہوائیں پیدا کیں تاکہ فراش کا کام دیں۔ اور مکان کو صاف ستھرا رکھیں۔

یہ سورج کیا ہے۔؟

یہ آپ کا باورچی ہے جو آپ کی کھیتیاں پکاتا ہے'اس کی گرمی سے آپ کے دانے پکتے ہیں اور ۔یوں سمجھنا چاہئے کہ سورج فی الحقیقت ایک باورچی ہے جو اللہ نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ بادل کیا ہیں۔۔۔۔؟

یہ بہشتی ہیں جو پانی بھر بھر کے لاتے ہیں اور آپ کی کائنات کو سیراب کرتے ہیں ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے کہ اس وقت آ کے آپ کے تالابوں کو بھریں۔ آپ کی نہروں کو چلائیں۔اور آپ کے کنوؤں کو پانی دیں۔ تاکہ سال بھر تک یہ خزانہ پانی سے بھرپور رہے اور انسان کو تکلیف نہ ہو۔۔۔۔ تو کوئی بہشتی ہے کوئی باورچی ہے کوئی فراش ہے جو کام کر رہا ہے۔۔۔ اب اگر یہ انسان مالک کو چھوڑ کر کہیں باورچی سے آنکھ ملانا شروع کرے اور سورج کے آگے ڈنڈوت کرنے لگے اور باورچی کے آگے جھکنے لگے'کہیں فراش جو ہوا ہے اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے اور ہوا پرستی کرے'کہیں آپ کے لئے پانی برسانے کا بادل سامنے آئے'اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو اور منتیں مانگنے لگے۔۔۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی بہشتی سے آشنائی کرلے۔یا فراش سے آشنائی کرلے۔ تو گولی مار دینے کے قابل ہوگی'اس قابل نہیں ہے کہا سے بلڈنگ میں رکھا جائے۔

**مخدوم کائنات کی بے عقلی**

بلکہ جب وہ اس درجہ پر ہے تو یہ بلڈنگ بھی منحوس ہے۔ اسے بھی بڑھا دو۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کے لئے ہوں اور یہ اللہ کے لئے ہو۔ یہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ انسان کی کم حوصلگی نہیں ہوگی۔ کہ وہ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے'وہ پانی کے آگے ڈنڈوت کرنے لگے'انکے سامنے ہاتھ جوڑنا'کھڑا ہونا قلب موضوع ہے کہ جو مخدوم تھا وہ خادم بن گیا'جو خادم تھا اسے مخدوم بنالیا گیا۔ گویا عقل کو اس نے الٹ دیا کہ جس کو اپنے سامنے جھکانا چاہئے تھا۔ اس کے سامنے یہ خود جھک گیا یہ تو وہ ہیں کہ جب اللہ والوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو یہ خدمت کرتے ہیں جناب رسول ﷺ نے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے'اسے پھٹتے بن پڑی حضرت یوشع ابن نون علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے جنگ کے موقع پر سورج روک دیا گیا تاکہ دن دن میں فتح ہو جائے تو دن کو ٹھہرا دیا تھا'سورج خادم تھا تو اسی لئے روکا گیا۔۔۔ لیکن حضرت یوشع علیہ السلام کے کام کو نہیں روکا گیا۔ کہ وہ مقصود تھا اور سورج اس کا وسیلہ تھا۔ وسیلے پر پابندی عائد کی گئی'مقصود پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔۔۔۔ غرض بادل ان کے لئے آتے ہیں سورج ان کی خدمت کے لئے آتا ہے'چاند ان کے سامنے اطاعت کرتا ہے'ذرات کائنات اطاعت کرتے ہیں۔

**کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد**

انسان کو دیکھو سمندروں میں اس کا تصرف ہے' پہاڑوں میں اس کا تصرف ہے' زمین اس کی

خدمت میں لگی ہوئی ہے چاہے زمین کو کھودے' چاہے سڑکیں بنائے فرمایا گیا۔

هُوَالَّذِی جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ.

"وہ' وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے ذلیل بنادیا' تاکہ اس میں کھیتی کرو' دانہ ڈالو' سڑکیں بناؤ' کنویں کھودو' ذلیل ہے زمین چوں نہیں کرسکتی انسان کے سامنے اُف نہیں کرسکتی"۔

مگر انسان کس لئے ہے۔۔۔؟

وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ.

تاکہ یاد رکھے کہ اسے اپنے مالک کے آگے جانا ہے اور اس کے آگے جوابدہی کرنی ہے۔۔۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ حشر ونشر کو سوچے' قیامت کے دن کو سوچے' اور ان چیزوں کا کام یہ ہے کہ انسان کی چاکری میں لگی رہیں جو خدمت یہ لے' اف نہ کریں' چپ چاپ اس کے کام میں لگی رہیں۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

وَالْاَ نْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔

یہ چوپائے اور مویشی خلقھا لکم تمہارے لئے پیدا کئے ہیں فِیھَا دِفْءٌ "بعضوں سے تم گرمی حاصل کرتے ہو' اونی کپڑے بنا کر ان سے گرمی حاصل کرتے ہو۔ وَمَنَافِعُ اور مختلف منافع ہیں' وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ اور بعض جانوروں کے گوشت سے تمہارے کھانے پینے کا تعلق ہے۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ۔

بعضوں سے تم کروفر اور حشم وخدم حاصل کرتے ہیں جب ہاتھی اور گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر جلوس نکالتے ہو اور اپنا کروفر دکھلاتے ہو اور اپنے حشم وخدم کی نمائش کرتے ہو۔

اور فرمایا۔

وَتَحْمِلُ اثقالكم اِلٰى بَلَدٍ لم تكونوا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُس۔

بعضے جانور وہ ہیں کہ ان پر مال کو لاد کر بستی سے دوسری بستی تک لے جاتے ہو۔ غرض مختلف منافع فرمائے گئے۔

وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔

یہ وہ چیزیں ہیں کہ آج سواریاں بن گئی ہیں۔ فرماتے ہیں۔۔۔اور تمہیں کیا خبر ہے کہ آئندہ ہم نئی نئی قسم کی سواریاں پیدا کردیں جن پر چڑھ کر انسان منزلیں طے کریں۔ چنانچہ موٹر سائیکلیں' ہوائی جہاز اور دخانی جہاز۔۔۔ غرض مختلف قسم کی سواریاں انسان کے لئے نکلیں تاکہ وہ احترام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ چوپائے اور جانور کو یہ عزت نہیں بخشی گئی' چوپایا جہاں بھی

جائیگا اپنے پیروں سے چل کر جائے گا اور انسان سوار ہو کر جائے گا' کبھی چوپائے کے سر پر کبھی جمادات کے سر پر اور کبھی نباتات کے سر پر ہر چیز انسان کے لئے سواری بنادی گئی۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ انسان اللہ کے لئے ہے اور کائنات انسان کے لئے ہے۔

### معیار عبادت

یہ اللہ کے لئے کیوں ہے۔؟
اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نفع اور نقصان کے معیار پر کی جاتی ہے جس کے قبضے میں انسان کا نفع اور نقصان ہے۔اس کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ' کے ہاتھ میں انسان کے نفع اور نقصان کی باگ ڈور ہے نفع دے جب بھی اس کے قبضے میں ہے' نقصان پہنچائے جب بھی اس کے قبضے میں ہے۔ خواہ نعمتیں دیدے' خواہ مصیبت ڈالدے' نعمت دیکر چھین لے' یا چھینی ہوئے نعمت پھر واپس کردے ہر صورت میں اس کی دست قدرت میں ہے۔

### معطی حیات

مادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے زندگی ہے' اس پر انسان کا کوئی بس نہیں ہے صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے زندگی دیدے اور جب چاہے زندگی چھین لے۔ جب تک زندگی نہیں آتی' ایک انسان چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جائے۔۔۔ لیکن زندگی ہاتھ میں نہیں ہے تو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے کہ جب چاہے پیدا کرے۔ وہ دینا چاہے تو دیدے' نہ دینا چاہے تو انسان کو تمنائیں کرتے کرتے اور اسباب مہیا کرتے کرتے برس گزر جاتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی' اس لئے کہ زندگی ہاتھ میں نہیں ہے' غرض زندگی کی نعمت اسی کے ید قدرت میں ہے۔۔۔ جب چھننے پر آتی ہے اور موت کا وقت آتا ہے تو آدمی ساری دنیا کے خزانے علاج پر صرف کردے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی آدمی زندگی کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے جانے کا وقت ہے اس پر جا کر رہتی ہے غرض نہ زندگی کو لانا قبضے میں ہے' نہ روکنا قبضے میں اور نہ واپس لے آنا قبضے میں ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہے وہ سب سے بڑا نافع ہے جس کے قبضے میں نفع کی باگ ڈور ہے۔

### معطی صحت

آپ زندہ موجود ہیں۔۔۔ زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت تندرستی ہے۔ تندرستی آپ کے بس کی چیز نہیں ہے' جب تک مالک تندرست رکھنا چاہے آدمی تندرست رہتا ہے۔ چھیننا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ لوگ اسباب مہیا کرتے ہیں اور صحت کا تحفظ کرتے ہیں لیکن قابو نہیں ہے کہ اس کو حاصل کرلیں' آج شہر کے اندر انفلوائنز پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ بھی سعی کر رہی ہے۔ مونسپلٹیاں بھی سعی کر رہی ہیں۔ شخصی طور پر ڈاکٹر بھی مطب کھولے ہوئے ہیں۔ پبلک بھی ایک دوسرے کی خدمت پر کھڑی ہوئی ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ منٹ

بھر میں مادہ رفع ہو جائے۔۔۔ لیکن قبضے میں نہیں ہے۔ جب مالک کا حکم ہو گا جب ہی یہ بیماری واپس جائے گی۔ خواہ کتنا ہی جتن کیا جائے اپنے وقت تک رہے گی۔

## مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت

جیسے حصرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' فرماتے ہیں کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے' جب اس کا وقت ختم ہو گا' جبھی ٹلے گی۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اسباب کے درجے میں کچھ نہ کچھ اجمالی طور پر تحفظ کی فکر کی جائے۔ اسباب میں زیادہ مبالغہ نہ کرے ورنہ الجھ کر مصیبت کی عمر بڑھ جاتی ہے فی الجملہ یہ سمجھ کر تحفظ کا سامان کرتا رہے کہ میں بندہ ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسباب اختیار کروں تو واجملوا فی الطلب و توکلوا علیه

اجمال کے ساتھ اسباب کو طلب کرتے رہو' اللہ کے اوپر بھروسہ رکھو' اسباب پر بھروسہ مت کرو۔ اجمالی طور پر آدمی کچھ تحفظ کا سامان کرتا ہے' دوا پی لی۔ طبیب کو دکھلا دیا' لیکن طبیب کے اوپر توکل کر بیٹھے' یا دواؤں پر توکل کر بیٹھے یا ہمہ تن دل کو ڈال دے کہ یہی چیز شفا دینے والی ہے۔ یہ غلط ہے' دواؤں میں شفاء نہیں ہے اور طبیب کے قبضے میں شفا نہیں ہے یہ تو وسائل اور اسباب ہیں۔ وسائل کے اندر تاثیر رکھنا مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

## تاثیرات اسباب کی حقیقت

یہ آگ پانی' ہوا' اور مٹی بھی اسباب ہیں۔۔۔ آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلائے' لیکن یہ اسکی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھ دی ہے۔ وہ یہ تاثیر دکھلاتی رہتی ہے لیکن قبضے میں مالک کے ہے۔۔۔ اگر وہ آگ کی تاثیر کھینچ لے تو آگ جلانے کا ارادہ بھی کرے تو اس کے قبضے میں جلانا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالدیا گیا' جلانے کی تاثیر سلب کر لی گئی' آگ جھک مار کر بیٹھ گئی' آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی' غرض آگ نہیں جلاتی مشیت خداوندی جلاتی ہے۔ جب مشیت تقاضا کرتی ہے آگ جلانا شروع کر دیتی ہے۔

یہ پانی اصل میں ٹھنڈک بخشنے والا نہیں ہے' مشیت الٰہی ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اگر پانی میں سے تبرید کا مادہ نکالیں لیں اور وہ خود بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے تو قابو نہیں پا سکتا' جب تک مالک اسکی تاثیر کو نمایاں نہ کر دے ہر چیز کے افعال اور خاصیتیں یہ مخلوق خداوندی ہیں۔ جب وہ چاہتے ہیں' نمایاں نہیں ہوتیں' اسلئے اصل موثر کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ یہی مجھے شفا بخشنے والی ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔

## موہم شرک عنوان سے احتراز کی تاکید

اسی واسطے شریعت نے بہت سے عنوانات کی اصلاح کی ہے۔۔۔ مثلاً یہ عنوان کہ انسانوں کو چاہئے کہ اولاد پیدا کیا کریں۔۔۔ شرعی اعتبار سے یہ عنوان غلط ہے' شرعی طور پر اس عنوان کو بے ادبی کہا گیا ہے۔۔۔ پیدا کرنا خالق کا کام ہے' ماں باپ کا کام نہیں ہے کہ اولاد پیدا کریں۔ ماں باپ کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب کے درجے میں باہم مل جائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ اولاد پیدا کر دی جائے۔۔۔ اگر حق تعالیٰ شانہ' پیدا نہ کرنا چاہیں تو ہزار دفعہ خاوند بیوی ملا کریں' کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مانگنا بھی اسی سے ہے۔ بھروسہ بھی اسی پر ہے' ملتا بھی اسی سے ہے۔۔۔ جب اسباب اور وسائل میں وہ اثر ڈالتے ہیں تو اثر آجاتا ہے۔ اور اگر آدمی مطلقاً اسباب کی طرف رجوع کرے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

## معرفت توحید و تصرف

حضرات انبیاء علیہم السلام ہی فی الحقیقت حق تعالیٰ شانہ' کی توحید اور تصرف کو پوری طرح سمجھتے ہیں' وہ مانگتے بھی ہیں تو اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ فریاد بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں' کسی مصیبت کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

## بارگاہ حق میں سوال کا طریق کار

حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ انہیں بیٹا مانگنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی نبوت کا مشن آگے چلے اور بڑھے۔ تو بیٹا مانگا۔

اس مانگنے کو حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ مانگنا بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ مانگنے کا ڈھنگ بھی حقیقتاً انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ انکے بتلانے ہی سے دوسروں کو آتا ہے۔۔۔ غرض ذکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا۔ ؟ اس دعا کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے اور واقعی اس طرح سے مانگنے کا انہیں کا حق تھا دوسرے تو اس طرح سے سوجھ بھی نہیں سکتے۔

اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَاءً خَفِیًّا.

فرماتے ہیں اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت ذکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے اپنے دل میں اللہ سے مانگنا شروع کیا اور چھپی ہوئی آواز سے اولاد کی طلب کی۔ جس کو وہ سنتے تھے اور ان کا اللہ سنتا تھا کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں تھی' اس طرح سے مانگنا شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ مانگنے کا پہلا ادب تو یہ ہے کہ آدمی زیادہ چلا کر نہ مانگے۔

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً

"اللہ کے سامنے دعائیں کرو چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ"۔

غرض آہستہ آہستہ مانگنا شروع کیا۔
کس طرح سے مانگا۔۔۔؟ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّی وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ.

”اے اللہ! میری ہڈیاں خشک ہوگئیں“۔

بڑھاپے کی انتہا یہ ہے کہ ہڈیاں بھی خشک ہوگئیں' ان میں گودا تک باقی نہیں رہا۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ جب گودا تک باقی نہیں رہے گا' تری اور روغن باقی نہیں رہے گا' ہڈیاں خشک ہوگئیں تو گوشت کہاں باقی رہے گا؟ حاصل یہ نکلا کہ ہڈی سے چمڑا الگ چکا ہے کوئی طاقت میرے اندر باقی نہیں ہے۔۔۔ اور عرض کیا۔

وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا.

”اور سر سفید ہوگیا ہے جیسے آگ جلا کرتی ہے“۔

تو اندر بھی بڑھاپا سرایت کر گیا کہ ہڈیوں میں روغن تک باقی نہیں۔ اور اوپر بھی بڑھاپا چھا گیا کہ بالوں میں سیاہی نہیں ہے۔ غرض اوپر سے سفید ہوگیا ہوں اور اندر سے خشک ہوگیا ہوں۔۔۔ یہ میری حالت ہے۔

یعنی بیٹا مانگنا چاہتے ہیں اور حالت وہ پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسباب کے درجے میں بیٹا ہونا ناممکن ہے۔۔۔ جب بڑھاپے کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ اندر روغن تک باقی نہ رہے' ہڈیاں تک خشک ہو جائیں اور بڑھاپا چھا جائے تو اولاد کہاں سے ہوگی۔؟

مگر یہ مانگنے کا طریقہ ہے کہ وہ اسباب جن کے ذریعے سے اولاد ہوتی' وہ موجود نہیں' تو خود ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ سبب بھی اندر موجود نہیں' یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں' تاکہ جواب یوں نہ آجائے۔۔۔ کہ اگر یوں مانگتے کہ یا اللہ! مجھے بیٹا دیدیجئے۔۔ تو یہ ہوسکتا تھا۔ کہ جواب یوں آجائے کہ نہیں تم بوڑھے ہوگئے ہو' عادت الہٰیہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں بیٹا نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا خاموش ہو جاؤ۔ تو پہلے ہی ان چیزوں کو پیش کر کے دفع دخل مقدر کر دیا' جو جواب آگے ممکن تھا میں وہ جواب خود ہی نہ دے دوں تاکہ آئندہ کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ تو کہا کہ

اے اللہ! میری ہڈیاں تو خشک ہوگئیں اور سر کے بال سفید ہوگئے' بڑھاپا چھا گیا۔
اور بیچ میں ایک لفظ یہ بھی کہہ دیا۔

وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا

اے اللہ! میں کبھی بھی آپ کے سامنے سے نامراد واپس نہیں گیا' جب گیا ہوں کچھ نہ کچھ لے کے گیا ہوں یہ کبھی نہیں ہوا کہ مایوس گیا ہوں۔۔۔ یہ بھی بیچ میں کہدیا۔۔۔ حاصل یہ کہ اسباب کے درجے میں کچھ موجود نہیں اور آپ کے در سے کبھی مایوس گیا نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین

رکھنا چاہئے کہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دعاء اس طرح سے مانگو۔

اَلِحُّوا۔

الحاح کرو' اتنی زاری کرو کہ لیچڑ بن کے مانگو کہ بے لئے ہم نہیں ٹلیں گے کلام بھی ایسا ہی عاجزانہ ہو' جھکنا بھی ایسا ہی ہو اور بیٹھنا بھی ایسا ہی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کریم کے دروازے پر آئیں اور خالی ہاتھ واپس جائیں۔ ہم لے کے ہٹیں گے۔۔۔ اور آگے عرض کیا۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِن وَّرَآئِیْ.

"مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈر بھی ہے۔ اور کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے' بلکہ میرے مقصد کو ضائع کر دیں گے"۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں۔

وَ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا.

یا اللہ میاں! میں ہی بوڑھا نہیں میری بیوی بانجھ بھی ہے اور اس کے اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔۔۔ یہ بھی ساتھ میں عرض کر دوں۔۔۔ تو میں بوڑھا ہوں' مجھ میں اولاد کی صلاحیت نہیں' بیوی بانجھ ہے اس میں اولاد ہونے کی قابلیت نہیں' رشتہ داروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔۔۔ تو ہوا کیا؟

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا.

پس اللہ میاں! ایک بیٹا مجھے عطاء کر دیجئے' جو میرے ان کمالات کا وارث بنے اور ان کو آگے بڑھائے۔۔۔ تو حقیقت میں مانگنے کا ڈھنگ بھی انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ بارگاہ حق میں کس طرح سوال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول ﷺ نے دعاء کے آداب ارشاد فرمائے ہیں کہ دعائیں مانگو مگر اس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

چنانچہ کسی شخص نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ ﷺ! لوگ دعائیں مانگتے ہیں' قبول نہیں ہوتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔۔۔"۔

فرمایا۔۔۔۔

مطعمه حرام و ملبسه حرام يقول يارب يارب انى يستجاب له'۔

کھانا دیکھو تو حرام کا' لباس دیکھو تو حرام کا' کمائی دیکھو تو وہ مشتبہ اور آدمی کہہ رہا ہے۔ یارب یارب انیّٰ یستجاب لہ' دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی؟ یہ تو دل لگی اور مذاق کرنا ہے۔ پاک بن کر اللہ کے آگے آئے تب دعا سنی جائے گی' ناپاک بن کر آئے تو دعا کیوں سنی جائے گی؟

بادشاہ کے دربار میں جب جاتے ہیں تو پاکیزہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ عطر لگا کر جاتے ہیں، معطر ہو کر جاتے ہیں۔ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ دربار میں سیٹ دی جاتی ہے اگر دربار میں عرض و معروض کریں تو اس کی شنوائی ہوتی ہے۔۔ اور اگر کوئی میلے کپڑے پہن کر اور اوپر سے نجاست مل کر چلا گیا تو دربان دھکے دے کر نکال دیں گے کہ یہ پاس کھڑے ہونے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اسے دربار میں سیٹ دی جائے۔ اور چہ جائیکہ اسی کی بات مانی جائے۔۔۔ تو اسے نکال دیں گے کہ یہ آداب دربار کے خلاف ہے۔۔۔ تو حرام کی غذا کھا کے اور حرام کا لباس پہن کر جانا اور پھر یا اللہ یا اللہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نجاست لیپ کر دربار میں جائے اور بادشاہ کے سامنے عرض و معروض کرے، تو شنوائی ہو گی یا دھکے دیئے جائیں گے؟ تو قبولیت ہو گی یا نا مقبولیت ہو گی۔

## کسب حلال کے آثار

غرض بتلایا گیا کہ دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے پہلے اپنے ضمیر کو پاک کرے کہ میں آج سے حرام کی غذا سے تائب ہوتا ہوں اور اور مشتبہ کمائی سے تائب ہوتا ہوں کہ اگر کمائی مشتبہ ہو گی تو اس سے قلب کے اندر ظلمت پیدا ہو گی اور اس توفیق سلب ہو جاتی ہے حلال کی کمائی کا اثر قلب میں نورانیت پیدا ہونا اور توفیق کا پیدا ہونا ہے۔ حرام کی کمائی کا اثر سلب توفیق ہے۔ قلوب کے اندر سے توفیق نکل جاتی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہمارے دیوبند میں ایک بزرگ "شاہ جی عبداللہ" تھے۔ اور عوام میں شمار ہوتے تھے لیکن صاحب نسبت بزرگ اور درویش تھے، انہوں نے کمائی کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ گھاس کھود کے لاتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی بیچ کر اپنا گزر اوقات کرتے تھے، صاحب نسبت تھے، اوقات کے پابند تھے، ان کے ہاں گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر تھی، تو دیوبند میں جتنے گھاس خریدنے والے لوگ تھے وہ قطار باندھ کر کھڑے رہتے تھے کی شاہ جی کہ گٹھڑی ہم خریدیں گے، ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر میں نے خرید لی تو میرے مویشی میں بھی برکت ہو گی، میرے گھر میں بھی برکت ہو گی۔

اس لئے جہاں شاہ جیؒ سامنے آئے۔ لوگ دوڑتے تھے، جس نے ہاتھ پہلے لگا دیا انہوں نے گٹھڑی وہیں ڈال دی اور چھ پیسے لے لئے۔ سردی ہو گرمی ہو، برسات ہو۔ نہ سات پیسے نہ پانچ پیسے چھ پیسے متعین تھے۔

جب چھ پیسے لے لیتے تو ان کے خرچ کا ان کے ہاں کیا طریقہ تھا؟

دو پیسے تو اسی وقت فقیروں میں صدقہ کر دیتے تھے۔۔۔ اس زمانے میں کوڑیاں ہوتی تھیں۔۔ گنڈے ہوتے تھے۔ پانچ گنڈے کا ایک پیسہ ہوتا تھا۔ تو دو پیسے کے گنڈے لے کر کسی یتیم کو، کسی غریب کو، کسی بیوہ کو تقسیم کر دیتے تھے۔

اور دو پیسے روزان کے گھر کا خرچ تھا۔ اس میں کچھ نمک لے لیا اور کچھ تیل لے لیا کچھ ترکاری لے لی۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جو آج دو روپے میں کام چلتا ہے۔ وہ دو پیسے میں چل جاتا تھا' تو دو پیسے ان کے گھر کا خرچ تھا۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب دو پیسے روز کے جمع کرتے کرتے سات آٹھ روپے ہو جاتے تو ان کا کھانا پکا کر ہمارے ان سب بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے دار العلوم دیوبند قائم کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم دیوبند' مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔ ان تمام بزرگوں کو جمع کر کے دعوت کر دی۔ تو میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور بڑے صاحب نسبت ولی کامل گزرے ہیں کہ ۔

"سال بھر تک ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ شاہ جیؒ کے گھر کا کھانا کھائیں"۔

اور فرمایا کہ ۔

"جس دن کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور رہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھیں' جی چاہتا تھا کہ تلاوت کریں۔ دل میں طاعت و عبادت اور زہد و ریاضت کی امنگ پیدا ہوتی تھی"۔

یہ اس حلال کی کمائی کا اثر تھا۔۔۔ تو جتنی پاک کمائی ہوتی ہے قلب میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

## حرام کی نحوست

جتنی ناپاک یا مشتبہ کمائی ہوتی ہے توفیق سلب ہوتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ کام نیکی کا ہے۔ مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے کرنے کی امنگ نہیں ہوتی جسے غالب نے کہا کہ ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زھد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے' یہ برا ہے۔ اور اچھے کو کرنا چاہئے مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا تو دل میں جب ناپاکی گھس جاتی ہے تو وہ اچھے کام کیلئے ابھرتا نہیں۔۔۔ آج جو ہم اور آپ معصیت میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں' علم تو بڑا وسیع ہو چکا ہے حلال و حرام کا امتیاز' اچھے اور برے کی تمیز اتنی ہو چکی' ہر شخص شریعت میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار ہے۔ جہاں کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے' بس اس نے قرآن و حدیث میں رائے زنی شروع کر دی گویا مجتہد بن گیا۔۔۔ تو علم کی کمی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہے۔ علم موجود ہے۔ پھر بھی مبتلا ہیں۔ توفیق کے سلب ہونے کی

وجہ سے ہیں۔اور توفیق اس لئے سلب ہوگئی کہ ہماری کمائی مشتبہ ہے' حلال کی غذا اندر نہیں پہنچتی۔ معدہ حوض بدن ہے جو اس میں بھر دیں گے' رگ وپے میں وہ چیز پھیلے گی۔پاک کمائی بھریں گے' پاکی کے اثرات رگ وپے میں بھریں گے۔ناپاک چیزیں بھریں گے ناپاکی کے اثرات پھیل جائیں گے' تو حلال کی کمائی کا ایک اثر ہوتا ہے۔

## لقمۂ حلال کی علمی وعملی برکات

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ہے۔یہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔امام شافعیؒ بھی جلیل القدر امام ہیں۔۔۔۔چار ہی بڑے امام ہیں جن کی فقہ آج کل رائج ہے۔امام ابو حنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ اور بھی صاحب فقہ آئمہ گزرے ہیں لیکن ان کی فقہ ختم ہوگئی۔من جانب اللہ ان چار فقہوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کروڑہا کروڑ اانسان ان کی فقہ پر چل رہے ہیں۔ ہندوستان' پاکستان' افغانستان اور ترکستان یہ سب حنفی المذہب ہیں اور سب میں فقہ حنفی رائج ہے۔ مصر قریب قریب کل کا کل شافعی فقہ پر چل رہا ہے۔حجاز بھی قریب قریب شافعی فقہ کا پابند ہے۔نجد وغیرہ ممالک یہ فقہ حنبلی کے پابند ہیں۔مغربی ممالک جیسے الجزائر وغیرہ میں مالکی زیادہ ہیں تو دنیا کے اکثر حصوں میں یہی چار فقہ رائج ہیں۔انہیں چار اماموں کے مسلک پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ان میں سے ایک امام احمد بن حنبلؒ ہیں' جلیل القدر امام ہیں' مگر امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔۔۔امام شافعیؒ کا قیام مصر میں تھا۔امام شافعیؒ نے انہیں لکھا کہ بہت عرصہ ہوگیا ملاقات کئے ہوئے۔اگر کوئی ملاقات کا موقع ہو تو کوشش کر کے آجاؤ' مصر میں ملاقات ہو اور علماء آپ کے منتظر ہیں۔

امام احمدؒ نے لکھا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ معین کردی کہ فلاں تاریخ کو پہنچوں گا۔

مقررہ تاریخ پر امام احمدؒ پہنچے۔۔۔تو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے' بادشاہ وقت چونکہ امام شافعیؒ کا معتقد تھا وہ بھی ساتھ ہوگیا۔جب بادشاہ آیا تو وزراء' امراء علماء اور زعماء غرض پورا مصر استقبال کے لئے نکل آیا۔۔۔اور بڑے عزت واحترام سے امام احمدؒ کو لے کر آئے۔

امام شافعیؒ کے مکان میں عید کی سی خوشی تھی۔امام شافعیؒ کی بچیاں کودتی پھرتی تھیں کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہا ہے۔ایک عجیب خوشی تھی۔

غرض ان خوشیوں کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ تشریف لائے۔

علماء وزعماء اور سب اکابر ملت لنے کیلئے آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو امام شافعیؒ نے دستر خوان بچھایا۔۔۔امام احمدؒ کو بٹھلایا گیا۔اور بھی لوگ بیٹھے۔۔امام احمد حنبلؒ نے جو کھانا شروع کیا۔تو اس طرح سے کھایا جیسے کوئی بہت حریص آدمی کھایا

کرتا ہے۔اور جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کھایاور جلدی جلدی کھایا جیسے معلوم ہو کہ کھانے کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

امام شافعیؒ جب کھانے کے بعد گھر پہنچے توامام شافعیؒ کی بچیوں نے امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ امام وقت ہے۔ یہ کیسا امام وقت ہے جو عوام الناس کی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے۔اتقیاء کی شان تو یہ ہے کہ وہ کم کھاتے ہیں طاعت زیادہ کرتے ہیں۔یہ پیٹ بھر کے کھانااور وہ بھی ناک تک کھالینا یہ عوام کا کام ہے خواص کا نہیں۔ خواص میں بھی جو شخص امامت کے رتبہ کو پہنچاہوا ہو'اس کا کام یہ نہیں ہے کہ اس طرح سے انسٹھ کھالے' جیسے اناڑی کی بندوق بھری جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک' یہ اونچے طبقے کے لوگوں کا کام نہیں جو دیانت میں اونچا مقام رکھتے ہوں۔۔۔ توامام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑااور یہ فرمایا کہ محسوس تو میں نے بھی اس کو کیا مگر یوں بول نہیں سکتا تھا کہ میں میزبان ہوں۔اگر میں یوں کہتا کہ تم زیادہ کیوں کھاتے ہو' تو تہمت آتی کہ شاید میں مہمان سے اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں' اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں تھا مگر محسوس میں بھی کر رہا تھا کہ یہ احمد بن حنبل کو ہو کیا گیا۔اس طرح سے پیٹ بھر کے کھانا ؎

اندرون از طعام خالی دار
تانور معرفت درو بینی

پیٹ کو کھانے سے خالی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ نور معرفت پیدا ہو' نہ یہ کہ آدمی اتنا بھرلے۔۔۔ بہر حال امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا بچیوں نے اعتراض کیا تو چپ ہو گئے۔۔۔ وہ وقت گزر گیا۔اور امام احمدؒ عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد چھوٹی بچیوں نے بستر بچھایا۔اور پانی کا لوٹا بھر کے رکھا کہ امام جب تہجد کے لئے اٹھیں تو پانی لانے کی دشواری نہ ہو۔اطمینان سے وضوء کر لیں۔

امام احمدؒ صبح کی نماز کے لئے جب اٹھ کر گئے تو بستر وغیرہ اٹھانے کے لئے بچیاں آئیں۔دیکھا کہ لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔اب تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ کیسا امام ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے' رات کا کوئی وقت عبادت کا اسے نصیب نہ ہو۔ وضو یہ نہ کرے' تہجد یہ نہ پڑھے۔۔۔ یہ خواہ مخواہ ہی دنیا میں غلط شہرت ہو گئی کہ اپنے وقت کا بڑا امام ہے۔

جب امام شافعیؒ پہنچے تو بچیوں نے دامن پکڑ لیا کہ آپ نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ احمد ابن حنبلؒ رأس الاتقیاء متقیوں کا سردار ہے۔یہ کیسا امام ہے۔؟ناک تک یہ کھانا کھاتا ہے اور تہجد کی توفیق اسے نہیں۔رات بھر پڑ کر یہ سوئے۔

اب امام شافعیؒ سے بھی رہا نہ گیا اور باہر آکر امام احمدؒ سے کہا کہ ؎

"اے احمد بن حنبلؒ! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔؟ مجھے تو اس کی توقع نہیں

تھی۔ یہ تمہاری حالت کسب سے بدلی‘ پیٹ بھر کر تم کھانا کھاتے ہو۔ تہجد کی توفیق تمہیں نہ ہوئی۔۔۔ رات کو تم نہ اٹھے‘ وضو تم نے نہ کیا آخر یہ تغیر تمہارے اندر کیسے پیدا ہوا؟“۔

امام احمدؒ مسکرائے۔ اور عرض کیا حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں فرمایا‘ واقعہ کیا ہے۔؟

”عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے آج عشاء کے وضو سے تہجد اور صبح کی نماز کی نوبت آئی ہے۔ اور عرض کیا کہ قصہ یہ ہوا کہ جب دستر خوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے دنیا میں اتنی حلال کی کمائی نہیں دیکھی۔ اس کھانے کے اوپر آسمانوں سے انوار وبرکات کی اتنی بارش تھی کہ مکان منور تھا اور کھانے پر نظر ڈال کر قلب میں ذکر اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی‘ اتنی حلال اور پاک کمائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی‘ تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جتنا کھا سکوں کھالوں‘ چاہے بعد میں مجھے سات دن فاقہ کرنا پڑے‘ پھر یہ نورانی کھانا مجھے کہاں نصیب ہوگا‘ اس واسطے میں زیادہ کھایا“۔

اور عرض کیا۔

اس کھانے کی دو برکتیں نمایاں ہوئیں‘ ایک علمی برکت اور ایک عملی برکت۔ عملی برکت تو یہ ہوئی کہ عشاء کے وضو سے میں نے صبح کی نماز پڑھی‘ اور تہجد پڑھا۔ مجھے وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اور علمی برکت یہ ہوئی کہ چارپائی پر لیٹ کر قرآن کریم کی ایک آیت سے آج میں نے فقہ کے سو مسئلے نکالے‘ جو اب تک مجھے سمجھ نہیں آئے تھے‘ علم کے دروازے میرے قلب کے اوپر کھل گئے۔ اور سو مسئلے ایک ہی آیت سے میں نے استنباط کئے‘ یہ علم کی برکت ہوئی۔

تب امام شافعیؒ کی ڈاڑھی کا بال بال خوشی سے کھل گیا۔ اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا کہ ہم نہیں کہتے تھے کہ امام وقت ہے۔

تب بچیوں کو تسلی ہوئی۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حلال کی کمائی کا اثر یہ ہے کہ معرفت بڑھتی ہے علم الٰہی کی برکت پیدا ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ آج ہمارے میں عمل کی کوتاہی اس وجہ سے نہیں کہ آج ہمیں مسائل کا علم نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ علم کے وسائل اتنے عام ہو گئے کہ پہلے زمانے میں نہیں تھے‘ کتابیں چھپی ہوئی الگ‘ اخبار الگ‘ رسالے الگ‘ پیپر الگ اور ہر چیز میں شریعت پر ہی مشق کی جارہی ہے سب مسائل ہی کو موضوع بحث بنا رہے ہیں۔ تو اختلافی مسائل ان کے علم میں نہ

ہوں مگر اس کے باوجود کہ زبان، علم کے بارے میں کافی چلتی ہے۔ ہاتھ پیر عمل کے لئے نہیں چلتے۔

## نمائش علم

علم کو بھی اگر لوگ استعمال کر رہے ہیں تو اس انداز سے جیسے حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اخیر زمانے میں علم تجمل کے لئے رہ جائے گا۔

جس طرح سے لوگ کپڑوں سے زینت حاصل کرتے ہیں' اچھی بلڈنگ سے تجمل حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم سے بھی اپنی زینت اور نمائش کریں گے کہ ہم بھی پڑھے لکھے ہیں' ہم بھی عالم ہیں اور ہم بھی مسائل پر عبور رکھتے ہیں۔ تو علم عمل کے لئے نہیں رہے گا نمائش کے لئے رہے گا کہ اپنا جمال دکھلایا جائے' اپنا کمال دکھلایا جائے۔

## کثرۃ علم کے باوجود قلت عمل

غرض علم کی کمی نہیں' اگر کمی ہے تو عمل کی کمی ہے۔۔۔ اگر علم کی کثرت سے عمل نصیب ہو جایا کرتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ عمل کرنے والی ہوتی' کیونکہ علم کی کمی نہیں ہے۔ مگر جتنا علم بڑھتا جا رہا ہے عمل گھٹتا جا رہا ہے۔ اس واسطے کہ علم تجمل کے لئے ہے۔ اسباب علم بڑھتے جاتے ہیں علم کی حقیقت دلوں میں ختم ہوئی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اخیر زمانے میں علم گھٹ جائے گا' اور ایک میں خبر دی گئی کہ قرب قیامت میں علم بڑھ جائے گا۔

علماء نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے وہ یہ کہ اسباب علم بڑھ جائیں گے اور علم کی حقیقت دلوں میں گھٹ جائے گی۔۔۔ اسباب اتنے کہ قدم قدم پر علم کے نقشے سامنے ہوں گے اور ظلمت اتنی کہ قلب کے اندر نورانیت کا نشان نہیں کہ آدمی حق و باطل کا پورا امتیاز کر سکے۔ اور اس کے اندر عمل کا جذبہ اور امنگ پیدا ہو۔

## آثار علم

علم کے آثار میں سے ہے۔۔۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اہل علم میں جو علم ہوتا ہے کہ ان میں خشیت الٰہی اور خوف خداوندی ضرور پیدا ہوتا ہے یہ علم کی تاثیر ہے اور جو خوف آخرت ہوگا اور اپنے مرنے کا ڈر ہوگا اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ہوگا تو عمل کا جذبہ انسان میں پیدا ہوگا۔۔۔ لیکن جب علم سے خشیت اور خوف پیدا نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں ہے، رسمی علم ہے، لفظی علم کے لئے خشیت کا وعدہ نہیں ہے۔

## ابتلاء معصیت کے اسباب

غرض آج کی معصیت اور گناہ قلت علم کے سبب سے نہیں ہے کہ بلکہ قلت اخلاق کے سبب سے ہے۔ قلت نورانیت کے سبب سے ہے' اور قلت توفیق کے سبب سے ہے اور توفیق سلب ہونے کے اسباب میں سے مشتبہ کمائی حرام کمائی اور ہے کہ آدمی احتیاط سے نہ کمائے حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہ کرے' مشتبہ اور غیر مشتبہ کو نہ دیکھے۔ پیسہ مقصود ہو جائے۔ کہ جس طرح ہو پیسہ بٹور لو۔ ڈکیتی سے ہو' چوری سے ہو' رشوت سے ہو' کسی بھی انداز سے ہو پیسہ آنا چاہئے' ایسے پیسے کا اثر تو یہی ہوتا ہے کہ توفیق جاتی رہتی ہے۔

بہر حال حاصل یہ نکلا کہ عبادت اور زہادت کی جب توفیق ہوتی ہے جب قلب میں نور ہو' اور نور قلب میں جب ہوتا ہے جب کمائی ٹھیک ہو۔ حلال کی ہو حلال کا لقمہ میسر ہو۔

## رزق حلال میں قلت و برکت

نیز حلال کی کمائی ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ حرام کمائی تو ہو سکتا کہ زیادہ ہو لیکن عادتاً حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ الا ماشاء اللہ' اللہ تعالیٰ کسی کو بڑھا دے' مگر عادتاً لازمی بات یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ملتا ہے' مگر برکت اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی خیر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

## بناء عبادت

غرض انسان عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اور عبادت جب ہوگی جب اس کے وسائل اور اسباب درست ہوں۔۔۔ اس لئے فرمایا گیا۔

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنَ.

ساری چیزیں اس کے لئے بنائیں۔ اسے اپنے لئے بنایا تاکہ میری یاد میں لگے' ساری دنیا اس کے لئے مددگار بنے۔ یہ دنیا سے نفع حاصل کرے مگر کہنے کے مطابق جو حدود کے اندر میں جائز طریقے سے بتلاؤں اس طریق پر نفع حاصل کرے۔ تو نفع اور نقصان سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' عبادت کی بنیاد۔۔۔ نفع اور نقصان ہے جو میں عرض کر رہا تھا۔۔۔ اسی کو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ.

اپنی قوم کو خطاب کیا' کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جو تمہیں ادنیٰ درجہ میں ضرر نہیں پہنچا سکتے؟ ان مورتیوں کو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں' جن کو تم خود ہی اپنے ہاتھ سے بناتے ہو اور خود ہی تصور کر لیتے ہو کہ یہ ہمارے معبود ہیں۔ یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو مصنوع تمہاری اور تم اس کے صانع' اس کے باوجود تم نے اپنے لئے مالک تجویز کر لیا۔۔۔ یہ چیزیں تمہیں نفع بھی نہیں پہنچا سکتیں اور نقصان بھی نہیں پہنچا سکتیں۔

حاصل یہ نکلا کہ عبادت کی بنا نفع اور نقصان کا مالک بننا ہے۔

### اہل شرک کا دھوکہ

اہل شرک کو یہیں سے دھوکہ لگا ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع نقصان پر ہے تو دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان کا کچھ نہ کچھ نفع نہ ہو' یا کچھ نہ کچھ نقصان نہ ہو' دنیا کی کوئی چیز نہ محض نفع ہی پہنچاتی ہے نہ محض نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر چیز سے کچھ نفع پہنچتا ہے کچھ ضرر پہنچتا ہے۔ غرض ہر چیز میں نفع ضرر موجود ہے۔

یہ روٹی جو آپ روز کھاتے ہیں نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی پہنچا دیتی ہے اگر ذرا حدود سے زیادہ کھالی' بیماری پیدا ہو گی' حدود کے اندر کھائیں گے نفع دے گی۔ یہی پانی اگر اعتدال کے ساتھ پئیں گے نفع دے گا' اگر بے اعتدالی کے ساتھ پانی چڑھاتے چلے جائیں گے بارد امراض پیدا شروع ہو جائیں گے۔

یہی ہوا ہے نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی دیتی ہے۔ بے اعتدالی کے ساتھ ایسی چیزیں کھائیں گے جس سے فاسد ہوا پیدا ہو' نفخ کی بیماری پیدا ہو گی' اعتدال کے ساتھ کھائیں گے تو ہوا نفع دے دے جائے گی۔ غرض ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے نباتات ہوں جمادات ہوں' حیوانات ہوں' ہر ایک میں نفع و نقصان مشترک ہے جب عبادت کی بنیاد نفع و نقصان پر رہی اور دنیا ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے' تو مشرکین نے ہر چیز کو پوجنا شروع کیا کہ جب عبادت کی بنیاد نفع و ضرر پر ہے اور نفع و ضرر دنیا کی ہر چیز میں ہے تو کہیں پانی کو پوجنا شروع کیا اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے۔ تو ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں۔

اسی طرح ستاروں کو' پتھروں کو' مورتیوں کو' سونے اور چاندی کو پوجنا شروع کیا۔۔۔ تو پوجنے والا ایک ہے اور تینتیس کروڑ اس کے خدا ہیں' جتنی دنیا کے اندر انواع ہیں کہ ان میں سے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نفع و نقصان موجود ہے۔

### آلات صنعت کی پرستش

حتیٰ کہ اگر بعض قومیں صنعت و حرفت بھی رکھتی ہیں تو جتنے ان کی صنعت و حرفت کے آلات ہیں وہ ان کو پوجتی ہیں کہ یہ ہمارے نفع کا ذریعہ ہیں اور یہی نقصان کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔۔۔ مثلاً کاتب ہے تو وہ قلم کے آگے بیٹھ کر ڈنڈوت کرتا ہے۔ اگر کوئی تلوار کا دھنی ہے تو وہ تلوار کو پوجتا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے تو وہ بسولی کو پوجتا ہے کہ میرا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے۔۔۔ غرض دنیا کی ہر چیز کو معبود بنا لیا' کیونکہ عبادت کی بنیاد نفع و نقصان ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔

مشرکین نے یہ اصول تو صحیح اختیار کیا کہ عبادت کی بنیاد نفع و ضرر پر ہے لیکن یہ غلط سمجھا کہ

ہر چیز میں نفع وضرر ہے۔

## اسلام کا دعویٰ توحید

شریعت اسلام یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے مگروہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو' تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع و نقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے' یہ مالک کے ارادے سے نفع و نقصان پہنچتا ہے۔ خود ہتھوڑا نفع نہیں پہنچاتا خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی' مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کے ہاتھ میں نفع و نقصان پہنچانا نہیں۔۔۔ اس لئے عبادت اسی کی' کی جائیگی جس کے قبضے میں نفع و نقصان ہے' نہ اس کے جو نفع و نقصان کا صرف سبب ہے۔ نفع و نقصان کا موجد نہیں ہے' نفع و نقصان کا خالق نہیں ہے محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجود یا خالق ہونا لازم نہیں آتا۔

## استحقاق عبادت

انسان اولاد کے پیدا ہونے کا سبب ہے لیکن اولاد کے حق میں اس کو خالق تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟ کاشتکار کھیتی اگ جانے کا سبب ہے لیکن کھیتی کو اگانے والا کاشت کار تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟

اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ' اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ.

تم کاشتکاری کرتے ہو یا ہم کاشت کاری کرتے ہیں۔۔۔؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ تم کھیتی کے اگ جانے کا سبب بن جاتے ہو' کھیتی کے اگانے والے نہیں ہو اگانے والے ہم ہیں' منوں مٹی میں جو بیج چھپا دیا جاتا ہے۔ تو زمین کو تہہ میں سے کون کونپل نکالتا ہے' کیا تم نکالنے جاتے ہو یا ہماری قدرت نکالتی ہے۔؟ ماں کے پیٹ میں نطفہ پہنچتا ہے تو اس پانی کے اوپر صناعی کر کے نقشہ تم کھینچتے ہو یا ہم کھینچتے ہیں۔۔۔؟ ہم اسے مضغہ بناتے ہیں اور بڑھاتے ہیں یا تم بڑھاتے ہو۔۔۔؟ غرض تم سبب خلقت ہو خالق نہیں ہو' کاشت کار زراعت کا سبب ہے خود کاشت کار زراعت پیدا نہیں کرتا' تو دنیا میں جتنی بھی اشیاء ہیں یہ نفع و نقصان کا سبب بنتی ہیں' نفع و نقصان کو پیدا کرنے والی اور ایجاد کرنیوالی نہیں ہیں۔ نفع و نقصان مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے' جس کو چاہے زندگی دیدے جس کو چاہے اولاد کی نعمت دیدے اور جب چاہے چھین لے' ہاتھ میں اسی کے ہے' اسباب میں نہیں ہے۔۔۔ اگر تم اولاد کے خالق ہوتے تو جیسے تم پیدا کرنے پر قادر تھے تو روکنے پر بھی قادر ہوتے' کوئی بھی ماں باپ اولاد کو مرنے نہ دیتے۔۔۔ لیکن بے بس ہیں۔ جب زندگی کے روکنے پر قادر نہیں ہو' تو زندگی ڈالنے پر انہیں قدرت کہاں آئی؟ تم زیادہ سے زیادہ سبب ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو۔ موت کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

آدمی کسی کو چھری مار دے تو وہ موت دینے والا نہیں ہے، سبب موت ہے، موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں۔۔۔ اگر کوئی چھری مار دے اور وہ چھری میں سے تاثیر نکال دیں اور موت نہ دیں، تو لاکھ ذبح کیا کرو، کبھی کوئی ذبح نہیں ہوگا۔۔۔ آگ سے جل کر اگر کوئی مر جائے تو مارنے والی آگ نہیں ہے، مرنے کا سبب ہے، مارنے والی اللہ کی مشیت ہے، آگ کو اس نے سبب بنا دیا اس لئے اسباب میں سے جو نفع و نقصان پیدا ہوتا ہے وہ مالک کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ خود یہ اسباب نفع و نقصان پر قدر نہیں ہیں، اس واسطے ان اسباب کی عبادت بھی جائز نہیں ہوگی، عبادت اسی کی کی جائے گی جس کے قبضہ میں قدرت میں نفع و نقصان ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔۔۔ تو نفع و نقصان کا سبب ساری دنیا بن جائے وہ پوجا کے لائق نہیں ہے۔ جو نفع و نقصان کو بھیج رہا ہے۔ وہ عبادت کے لائق ہے۔ تو اس میں گویا اصول بتلا دیا کہ

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.

”تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو کہ تمہیں نہ نفع پہنچا سکیں، نہ تمہیں نقصان پہنچا سکیں“۔

اُفٍّ لَّکُمْ تمہارے اوپر اُف ہے، تمہارے بنائے ہوئے ان فرضی معبودوں کے اوپر جن میں نہ نافع ہونے کی صلاحیت ہے، نہ مضر ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا

یٰاَیُّهَا النَّاسُ لَکُمْ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ.

”یہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کو پکارتے ہیں جن مورتیوں کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر ساری مورتیاں جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ایک مکھی کو پیدا کر دیں، ان کے بس میں نہیں ہے“۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# حج بین الاقوامی عبادت

حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال عظیم المرتبت نمونہ ہے، جس میں مرکز بھی ایک، عمل بھی ایک، فکر بھی ایک، لباس بھی ایک، وضع وہیئت بھی ایک، رخ بھی ایک، محبت بھی ایک۔۔۔اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے۔۔۔اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت وحقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔۔۔پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونۂ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں۔۔۔ورنہ مساوات اور بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر مت لائیں۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّ نَذِیْراً وَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اَمَّابَعْدُ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ٥ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ.

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

## اسوۂ مساوات

بزرگان محترم!

مساوات اور ایک رخی کو برنگ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی

عبادت مقرر فرمائی کہ اس قبلہ پر مشرق و مغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تا کہ ان میں سے اونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں' بلکہ اس مساویانہ اجتماع سے پیدا شدہ عملی مساوات کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی پوری زندگی اسی مساوات اور باہمی برابری کے ساتھ گزار دیں۔

اس بناء پر شریعت اسلام نے اس قبلہ کو اول تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا چنانچہ آثار و روایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب سارے انبیاءؑ اس بیت خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق و محبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں۔ تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

## عالمی ہدایت کا قبلہ

پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ قبلہ کی وضع دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ.

سب سے پہلا خدا کا گھر (کعبہ معظم) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔ آیت کریم میں اول تو وضع للناس کا لفظ لایا گیا' یعنی سارے انسانوں کے لئے وضع للعرب یا للعجم نہیں فرمایا گیا جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیت کریم ثابت ہوا۔ پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے ''عالمین'' کا لفظ استعمال فرمایا کہ وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اطراف و اکناف عالم سے تمام اصناف بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اسی کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیت کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

## امام ناس (علیہ السلام) اور مرکز ناس

اس لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنہیں قرآن نے امام الناس فرمایا ہے کہ اِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اور فرمایا وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ لوگوں کے لئے حج بیت اللہ کا اعلان عام کر دیں۔

تو یہاں بھی دونوں جگہ بلا تخصیص عرب و عجم ''الناس'' کا لفظ لایا گیا۔ یعنی موذن تو امام الناس بنائے گئے جنہیں بلا تخصیص تقریباً دنیا کی تمام بڑی قومیں امام تسلیم کرتی ہیں اور اس اعلان کا مخاطب بھی ''الناس'' ہی کو بنایا گیا جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو' اس لئے امام العرب یا امام الشام یا امام العراق نہیں بلکہ ''امام الناس'' کہا

گیا۔ جنہیں یہود و نصاریٰ بھی امام مانتے ہیں۔ اور مسلمان بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ مجوس اور فارسی قومیں بھی زرتشت کے نام سے انہیں امام تسلیم کرتی ہیں اور براہمہ بھی ابراہیم کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنا لقب براہمہ رکھا ہے۔ نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آجاتی ہیں جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے وہ بھی ان کی امامت کو تسلیم کرتی ہوں، غرض اعلان حج کے لئے امام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی علامت ہے کہ حج کا یہ اذان عام دنیا جہاں کے سارے انسانوں کے لئے تھا اور حج کے اس اعلان عام کا خطاب "الناس" کو بنایا جانا بھی جس میں کسی ایک یا قوم کی تخصیص نہیں، اس کی کھلی دلیل ہے کہ حج کا خطاب دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے جس سے صاف واضح ہے ہے حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدسہ کو مرکز ناس اور مرکز عالم بنا کر حج کے لئے ہے جس سے صاف واضح ہے کہ حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدمہ کو مرکز ناس اور مرکز عالم بنا کر حج کے لئے اس کے اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اذان عام دیا ہے جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہو جائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رجوع کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی ثابت ہوگا، کیونکہ مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں اور وہ یورپ، ایشیاء، افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بہ نوبت حج کے لئے آئیں گے تو بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی۔ اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہوگا۔

### عالمی مساوات

خلاصہ کہ حج بروئے قرآن اس دنیا میں ایک عالم اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ اس لئے ان میں قدرتی طور پر اخوت اسلامی عالمی مساوات، اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ ابھرنا چاہئے، پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے۔ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی یکساں رہیں، بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی رونما ہو، لباس بھی سب کا ایک ہو، وضع ایک اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہو، امیر و غریب، بادشاہ گدا، خواص و عوام، عالم و جاہل، نیک و بد، صالح و طالح، متقی اور فاسق، ایک ہی لباس میں، ایک ہی کفن میں، ننگے سر، ننگے پاؤں یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیت کریم کے اردگرد جمع ہوں، احرام بندھا ہوا ہو۔ اور ایک وضع اور ایک رخ ہو کر اس بیت کریم کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں، طواف کریں، اور اس پر جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

### بندگی میں یکسانی

عرفات کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بہ سر ہو کر اپنے رب کے سامنے گڑگڑائیں، فریاد کریں، مزدلفہ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ وزاری میں محو اور مست ہوں صفا و مروہ کے پہاڑوں کے درمیان بھی اسی ایک انداز گرویدگی

اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں‘ ایک قافلہ‘ دوسرے قافلہ کو دیکھے تو بجائے کسی دنیوی یا معاشرتی نعرہ کے ”لبیک لبیک“ کا نعرہ بلند کرے تا کہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے اور ایک ہی متواضعانہ اور سر فروشانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آئیں خواہ وہ حکمران ملک اور سربراہان ریاست ہوں‘ یا عوام الناس اور پبلک میں ہوں‘ ظاہر ہے کہ جب اسی طرح لاکھوں لاکھ انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی‘ ایک ہی سب کی نقل و حرکت‘ ایک ہی عمل ایک ہی مرکز اور ایک ہی رخ ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہو کر ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصور بھی باقی رہے دنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے؟ اور ظاہر و باطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کر کے دکھلایا ہے۔ یاد دکھلا سکتی ہے۔

## قلوب و قوالب کی یکسانی

پھر اسی کے ساتھ سب کی پارسائی اور زہد و قناعت کا یہ عالم کہ گھر وبار چھوڑے زر و مال بقدر ضرورت ہی لئے ہوئے‘ نہ رسمی عزت و جاہ کا تصور‘ نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم‘ نہ کسی میں اونچ نیچ کا وہم‘ نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش و بے حیائی کا کلمہ نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع‘ نہ جدال و قتال۔۔۔ بلکہ قلبی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی‘ خدمت باہمی کا جذبہ‘ ایثار و قربانی کا ہمہ وقت تصور اور ہر ایک میں بجائے نیچ ہونے کے غناء و توکل کا جذبہ‘۔۔۔ رسمی کر و فر اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دور۔۔۔ سادگی اور بے تکلفی سے مخمور اسی ایک کی محبت میں چور چور‘ اسی ایک سے مانگنا‘ اور اسی ایک کے آگے جھکنا‘ جو سب کا ایک ہی مرکز حقیقی اصل وجود اور خالق و مالک ہے۔ اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے ارد گرد گھومنا جو سب کا مرکز ظہور سب کی مادی اصل اور سب کے لئے مرکز کشش ہے۔

دنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی‘ قوالب کی یہ مساوات‘ افراد انسان کی یہ عالم موانست اور اولاد آدم کی یہ عالم اخوت دکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے جو اسلام اور مسلم نے اپنے رب سے جڑ کر دکھلائی اور نہ خود ہی دکھلائی بلکہ اسی نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے۔۔۔ اور کبر و غرور کا سر اس طرح توڑ دیا جاتا ہے۔

## مساوات و عبادت کی یکسانی

اسی توجہ الی اللہ اور ایک رخی کا قدرتی اثر ہے کہ لاکھوں لاکھ کے مجمع میں جس میں مرد عورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔۔۔ نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے۔۔۔ نہ بے حیائی کا وہم و گمان نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ‘ نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ۔۔۔ نہ طبقہ وارانہ فسادات نہ نزاع و جدال ہے نہ قتل و قتال‘ نگاہوں میں پاکی اور دلوں میں حق شناسی‘ اور ساتھ ہی عبادت اور اللہ سے وابستگی۔

یوں باہم کس نے کئے ساغر و سنداں دونوں

عملاً دکھایا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیونکر بچا جاسکتا ہے اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے

### عالمی اخوت

پھر حج میں عالمی اخوت و مساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کیساتھ تعاون باہمی۔۔۔۔ ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت و ہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے تاکہ یہ اخوت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسن سلوک اور احسان عام سے دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں' کیونکہ خصوصیت سے اس طویل و عریض سفر میں صرف امراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے جو اپنے ذوق و شوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامان سفر مہیا کر کے پہنچ پاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہو جائے۔ اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کر سکیں۔ اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں یا ضرورتکی حد تک رقم ہو مگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آجائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جیسے بیماری اور دوا دارو وغیرہ کی پریشانی۔ یا یہ بھی نہ ہو۔ مال چوری ہو جائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفر غربت میں فقیر بن جائیں۔ اور مستحق امداد بن جائیں یا ان میں کوئی بھی صورت پیش نہ آئے' وقتی حالات کے لئے تالیف قلوب ہی ضروری ہو جائے' ان تمام احوال کے پیش نظر حدیث نبوی ﷺ یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرم محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا' اس کا اجر ایک ایک لاکھ گنا ہوگا۔ یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقے کے مساوی ہوگا۔

### حج میں روحانی ترقی کے درجات

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر حرم میں تزکیہ نفس یا رذیلہ بخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرم محترم میں ایک روپیہ دے کر ہو جائے گا' اور روحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک پہنچ جائیں گے' سو کون ہو گا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔

### عالمی حسن سلوک

پھر قرآن کریم نے حج کی قربانیوں تک میں جو مناسک حج میں سے ہیں' غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسن سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنا دیا ارشاد حق ہے۔ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ

سوان قربانیوں کے جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔۔۔۔۔

غرض حج میں جیسے عالمی اخوۃ و مساوات رکھی گئی ہے ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنادیا ہے۔ کیونکہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے بلکہ دنیا کے کسی خطہ کے ہوں سب اسی میں داخل ہیں۔

### حج میں عالمی تجارت

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ وخیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور غریبوں کی امداد بھی کرنا چاہتا ہے لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے۔ تو قرآن حکیم نے اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔ ارشاد فرمایا گیا۔

"لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ" اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ".

اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ حج میں معاش کی تلاش کرو (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دوسری جگہ ایک دوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دھریا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہوگئی۔ جہاں ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلان کر دینے کا امر فرمایا گیا وہیں یہ بھی ارشاد حق ہے فرمایا۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ.

(اس اعلان سے لوگ پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی چلے آئیں گے) تاکہ وہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں۔

یہاں منافع کا لفظ عام ہے جس میں اولیت کے ساتھ حج کے اخروی منافع جیسے رضاء خداوندی اجر و ثواب اور آخرت کی ترقی درجات بھی داخل ہیں اور ثانویت کے ساتھ دنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت و فروخت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمال بھی شامل ہیں۔

### عالمگیر امداد باہمی

پس قرآن حکیم نے جیسے مناسک حج کے سلسلہ میں عالمی اخوت و مساوات کے رشتے قائم فرمائے' ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت و حرفت کے منافع کا راستہ بھی ہموار فرمادیا۔ تاکہ اخوت و مساوات حسن سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امداد باہمی بقائے باہم کے سلسلہ جاری رہیں تاکہ

مسلمان کے روابط صرف اپنے مالک کے مسلمانوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ دنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں

بہر حال ایک بین الاقوامی عبادت' بین الاقوامی مساوات' بین الاقوامی اخوت' اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے جس میں مرکز بھی ایک' محبت بھی ایک' اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے اور اونچ نیچ' چھوت چھات' نفرت و حقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ' مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں' ورنہ وہ بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات' اخوت اور بھائی چارہ کے الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔

جوہر تخلیق میں مساوات کا تقاضا' اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ ۔

"کلکم بنوادم وادم من تراب".

"تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیئے گئے"۔

تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے بلکہ سب اس کی مشیت و تخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت و محبت کے لئے بنائے گئے ہیں' وہ لوگ چاند اور سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اخوت و مساوات کا درس نہیں دے سکتے' بلکہ آدم خاکی کی اولاد ہو کر اور آدمیوں میں مل کر ہی سبق پڑھا سکتے ہیں۔ وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دنیا کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتے بلکہ ایک اور صرف ایک واحد قہار اور بے مثل و یکتا خدا کے بندے بن کے ہی مرکزیت کے نقطہ پر لا سکتے ہیں۔

## عالمی اخوت کے مرکزی نقاط

کیونکہ اسی خدائے واحد و بے مثال نے عالمی اخوت اور محبت کے لئے دنیا میں تین مرکز کلام اللہ۔۔۔ بیت اللہ۔۔۔ اور رسول اللہ بھیجے ہیں جنہیں عالمی مرکزیت دی ہے۔

قرآن کو ذکریٰ للعالمین بتلایا۔۔۔ بیت اللہ کو ھدی للعالمین فرمایا اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رحمت اللعالمین کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورت' قانون پھیلی' بیت اللہ سے عالمگیر اخوت و مساوات بصورت حج ابھری اور نبی خاتم ﷺ سے عالمگیر رحمت و محبت اور انسانیت بصورت عمل سامنے آئی۔

## طلب صادق

اس لئے جو قومیں صحیح ہدایت، صحیح اخوت ومساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ان تین مرکزوں سے چارہ کار نہیں ہے اور یہ پاک پونجی انہیں ان میں تین دروازوں سے مل سکتی ہے، اگر تعصبات کو چھوڑ کر طلب صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گی بلاشبہ کامیاب واپس ہوں گی، حاصل یہ کہ حج، جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے، ویسے ہی عالمی اخوت ومساوات اور عالمی امداد باہمی کا سرچشمہ بھی ہے۔

قرآن حکیم نے اخوت ومساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی مضمر تھا، اس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا، ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دنیوی فوائد اور منافع کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے، اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

وباللہ التوفیق

ماخوذ از ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (پشاور)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# اہمیت تزکیہ

اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے، پولیس نہیں بچاسکتی، اگر پولیس سے، ہتھیاروں سے اور فوجی قوت سے گناہوں روکا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی، اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی۔۔۔ زمانے میں اتنی فوج کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے، پولیس اتنی کبھی نہیں بنی جتنی آج ہے۔ حتی کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔ لیکن جتنی یہ چیزیں بڑھتی جارہی ہیں، جرائم بھی بڑھتے جارہے ہیں، بنا ہی ہے کہ جرائم کا روک لینا پولیس کا کام نہیں ہے، محض قانون کا کام نہیں ہے جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو۔ اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو، آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ، وَنَسْتَغْفِرُہٗ، وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ، لَاشَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ، وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہٗ، اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِلنَّاسِ بَشِیْرًاوَّ نَذِیْرًاوَّ دَاعِیاً اِلَیْہِ. بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً.............اَمَّابَعْدُ.............

فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا.
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

## حرف آغاز

بزرگان محترم!

یہ قرآن شریف کی چند آیات ہیں۔ جو اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں حق تعالیٰ

شانہ' نے اپنے دین کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جو اصل مقصد ہے اور انسان کی پیدائش کی بنیادی غرض وغایت ہے۔۔۔ قبل اس کے کہ ان آیات کی تشریح کی جائے پہلے بطور تمہید کے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے' پھر ان آیات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

## خیر وشر سے مرکب مخلوق

اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان میں اللہ نے دو مادے رکھے ہیں' ایک خیر کا مادہ ہے اور ایک شر کا مادہ ہے' خیر کے مادے سے وہ اچھے افعال انجام دیتا ہے اور شر کے مادے سے برائی' بدی اور معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کوئی انسان بھی اس سے مستثنٰی نہیں ہے کہ دو مادے اس کے اندر نہ ہوں۔ انسان' انسان بنا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ خیر محض ہوتا' تو وہ انسان نہ ہوتا' اس کو فرشتہ کہتے۔۔۔ اور اگر شر محض ہوتا تب بھی انسان نہ ہوتا' اس کو شیطان کہتے' تو جس میں شر کا نشان نہیں ہے فرشتہ ہے' اور جس میں خیر کا نشان نہیں ہے وہ شیطان ہے۔۔۔ انسان دونوں کا مجموعہ ہے۔ کہ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے۔ دونوں مادے اس کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔

## انسان کی ترقی کا راز

اور اسی لئے اسی میں ترقی ہے۔ نہ فرشتہ ترقی کر سکتا ہے نہ شیطان' مادی و روحانی جتنی ترقی کی ہے وہ انسان نے کی ہے۔۔ اس لے کہ اس میں دونوں مادے موجود ہیں۔ اور دو ضدیں جب ٹکراتی ہیں تب ہی کوئی تیسری چیز پیدا ہوتی ہے' اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ترقیات عطاء فرمائی ہیں کہ اس میں یہ دونوں مادے موجود ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہر انسان میں ایک لمہ خیر کا موجود ہے اور ایک لمہ شر کا موجود ہے۔ یعنی ایک جذبہ اور داعیہ بھلائی کا موجود ہے۔۔۔ ایک جذبہ اور داعیہ برائی کا موجود ہے۔ پھر ان دونوں مادوں کو امداد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ہی خزانے رکھے ہیں جن سے ان دونوں مادوں کو امداد پہنچتی ہے۔

## جذبات خیر وشر کا محرک

حدیث میں ہے کہ ہر قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے' جو بندے کو خیر کی طرف ابھارتا ہے' اور ہر قلب کی بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔۔۔ اس سے کوئی مستثنٰی نہیں۔

جب یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تو صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا کہ ۔

"یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا

گیا ہے۔۔۔؟

فرمایا ۔ بلى ولكنه اسلم

میرے قلب کی بائیں جاب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے مگر وہ میرے تصرف اور میری برکت سے مسلمان ہو گیا' اب اگر وہ بھی مجھے امر کرتا ہے تو خیر کی بات کرتا ہے' بجھاتا ہے تو خیر کی بات سمجھاتا ہے۔"

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر و برکت نے اس کی ماہیت بدل دی کہ بجائے شر کے خود اس میں خیر پیدا ہو گئی۔۔۔ مگر بٹھلایا گیا ضرور۔۔۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو یہ فرمایا گیا تھا۔۔۔ قران کریم سے بھی واضح ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ ۔

"جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چیختا ہوا اور روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔

فرمایا کہ کہ شیطان اس کو چوکے لگاتا ہے۔ اپنے اثرات پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی کوکھ میں اپنی چونچ مارتا ہے تاکہ اس کا اثر پہنچ جائے۔ صرف دو ہستیوں کو مستثنیٰ کیا گیا جن کو شیطان کوئی اثر نہیں پہنچا سکا۔۔۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ایک حضرت مریم علیہا السلام۔۔۔ ان کی پیدائش کے وقت شیطان اپنا کوئی اثر نہیں پہنچا سکا"۔

اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ بظاہر اس سے نبی ﷺ پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ صرف دو ہی انسان ہیں جن تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا۔۔۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام۔۔۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور اقدس ﷺ سے افضل ہیں بلکہ حضرت مریم علیہا السلام بھی۔

لیکن میں نے جو ابھی حدیث بیان کی اس سے حضور ﷺ کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا' اور حضور ﷺ کے شیطان پر حضور اقدس ﷺ کے اثر غالب ہو گیا' تو وہ شیطان ہی باقی نہ رہا۔ تو قوی تاثیر نبی کریم ﷺ کی نکلتی ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ وہاں بہت سے بہت دیہ ہوا کہ شیطان نہیں آسکا۔۔۔ یہاں آبھی نہیں سکا۔ اور خود آپ ﷺ نے اپنا اثر ڈال کر اسے بدل ڈالا' اس سے آپ کی افضلیت واضح ہوئی۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ ہر انسان میں دو مادے رکھے گئے ہیں' ایک خیر کا اور ایک شر کا' اور قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے۔ فرشتہ خیر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شیطان شر کی طرف۔

## محرکات خیر و شر کی جنگ اور ان کی مدد

یہ تو آپ نے بعض اوقات دیکھا ہوگا کہ ایک کام کرنے میں آدمی کو تردد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں۔۔۔؟ یہ شیطان اور فرشتے کی جنگ کا اثر ہوتا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ خیر کر' شیطان کہتا ہے کہ شر کر' آدمی تردد میں پڑتا ہے کہ کیا کروں جو چیز غالب آجاتی ہے وہی کرتا ہے۔۔۔ خیر غالب آگئی تو گویا فرشتے نے غلبہ پالیا' شر غالب آگئی تو گویا شیطان نے غلبہ پالیا' بہر حال ہر انسان میں دو مادے بھی ہیں اور ان دونوں مادوں کو امداد بھی پہنچتی ہے' اس لئے انسان دو ہی قسم کے افعال کرتا ہے یا برائی کے یا بھلائی کے' یا نیکی کرے گا یا بدی کرے گا

## اوامر و نواہی کی حکمت

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام دو حصے لے کر دنیا میں اتری' ایک حصہ اوامر کا ہے۔ حکم دیا گیا کہ یہ کام کرو' یہ تو خیر کو ابھارنے کے لئے ہے' ایک حصہ نواہی اور ممانعت کا ہے کہ ان کاموں کو مت کرو۔ یہ شر کو دبانے کا ہے تو شریعت کے دو حصے ہیں' ایک ماموات کا' ایک منہیات کا' ماموارت کا معنی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور منہیات کا معنی ہے جن کے نہ کرنے کا حکم دیا اور ان سے روکا گیا۔۔۔ ایک طرف کہا گیا تو نماز پڑھو' تم عبادت کرو' تم روزے رکھو' تم حج کرو' تم سچ بولو۔ یہ اوامر اور احکام خداوندی ہیں' اور ایک طرف نواہی ہیں' لاتقتلوا... لاتسرفوا... لا تزنوا نہ چوری کرو' نہ زنا کرو' نہ قتل کرو اور نہ شراب پیو' نہ بدکاری کرو۔۔۔ یہ منہیات کا حصہ ہے' اس لئے شریعت کے دو حصے ہو گئے' ایک امر بالمعروف یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور ایک نہی عن المنکر' یعنی برائیوں سے روکنا۔ یہ شریعت کی دو جانبیں ہیں ان دو کے بغیر انسان کو ترقی نہیں ہو سکتی' اگر وہ ساری نیکیاں کرتا رہے مگر بدیوں سے نہ بچے' ادھر نماز پڑھتا ہے' ادھر شراب خوری بھی کرتا ہے۔ ادھر روزہ بھی رکھتا ہے' ادھر معاذ اللہ زناکاری میں بھی مبتلا ہے' اسے کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی نیکیاں اکارت جاتی رہیں گی' دونوں چیزیں جب تک جمع نہ ہوں بچنے کی چیزوں سے بچتا رہے' کرنے کی چیزوں کو کرتا رہے' اسکے بغیر انسان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

## تقدیم نواہی

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص بیمار ہو' طبیب یہ کہے کہ یہ دوائیں پینی پڑیں گی۔۔۔ یہ امر کا حصہ ہے۔۔۔ اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا پڑے گا۔۔۔ یہ نہی کا حصہ ہے۔۔۔ تو علاج میں مدد دو چیزیں نکلتی ہیں۔ ایک دوا کا پینا' ایک پرہیز کرنا۔۔۔ اگر آدمی دوا پیتا رہے مگر پرہیز نہ کرے' بیماری رفع نہیں ہوگی' اطبا ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرہیز کرنا دوا پینے کی نسبت زیادہ مقدم ہے۔ بعض دفعہ دوا نہ بھی پئے۔ پرہیز کرنے سے آدمی سے زیادہ بیماری خود بخود

ختم ہو جاتی ہے' اسی لئے پرہیز مقدم ہے' اسی طرح سے شریعت میں بچنے کی چیزوں سے بچنا' کرنے کی چیزوں سے زیادہ مقدم ہے' اگر آدمی معاصی سے' بد عملیوں سے اور برائیوں سے بچتا رہا تو اس کے دین کا بہت سا حصہ محفوظ ہو جائے گا۔ اگرچہ کرنے کی چیزیں اس نے نہیں کیں۔۔۔ بہر حال انسان میں بہت حد تک پاکی پیدا ہو جائے گی۔ تو پرہیز دوا سے مقدم ہوتا ہے' مضرت سے بچنا' نفع حاصل کرنے سے مقدم ہوتا ہے۔

ایک تاجر کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجھے نقصان نہ پہنچ جائے جب نقصان سے بچ گیا تو دوسری سعی ہوتی ہے کہ نفع حاصل کرے۔ تو خسارے اور نقصان سے بچنا مقدم ہے۔۔۔ اسی طرح شریعت میں مقدم یہ ہے کہ آدمی بد عملی سے بچ جائے' اس سے کچھ نیکی کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور بد عملیوں میں مبتلا رہنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نیکی نہیں کرتا۔۔۔ یہ عقلی اصول ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہے۔ تو شریعت کے اعمال میں منکرات سے بچنا جتنا ضروری ہے' معروفات پر عمل کرنا اس درجہ کا نہیں' پہلے ضرورت ہے آدمی منکرات سے بچے۔۔۔ قتل ناحق ہے۔۔۔ شراب خوری ہے۔۔۔ جوا ہے۔۔۔ جھوٹ بولنا ہے۔۔۔ رشوت ستانی ہے۔۔۔ سود بٹے کا کاروبار ہے۔ ان سے بچنا مقدم ہے' اس کے بعد نماز سے بھی نفع پہنچ سکتا ہے' روزے سے بھی' حج سے بھی' زکوۃ سے بھی' اگر ایک انسان کی کمائی ناپاک ہے وہ سود خوری بھی کرتا ہے' نفلیں بھی پڑھتا رہے نفلوں کی تاثیر نہیں ہو گی' ممکن ہے فرض ادا ہو جائے' ممکن ہے کہ مفتی فتوی دیدے کہ فریضہ ادا ہو گیا لیکن قلب پر کوئی اثر پہنچ جائے؟۔ نہیں پہنچے گا جب تک اس چیز سے نہ بچے۔

آدمی چوریاں کرتا پھرے' اور ساتھ ہی روزے بھی رکھتا رہے' بے شک فریضہ ساقط ہو گیا۔۔۔ لیکن روزے کی وہ تاثیر کہ نفس پاک بن جائے' نہیں ہو گی۔ جب تک ایک طرف سے آلائش لگی ہوئی ہے کہ چوری' بدکاری کر رہا ہے' تو بد عملی سے بچنے پر ہی قلب میں نیکی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اس لئے شریعت کی تاکید ہے۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ پہلے منکرات سے بچنے کی کوشش کرے' بد عملی سے بچے تاکہ نیکی تمہارے لئے کار آمد اور مفید ثابت ہو۔

## وسائل منہیات سے احتراز

ان منکرات میں دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ تو آخری ہے جو اصل مقصد ہوتا ہے اور ایک درجہ اس کے وسائل کا ہے۔ شریعت وسائل سے بھی بچاتی ہے تاکہ مفسد سے آدمی خود بخود بچ جائے۔

مثلاً شریعت نے زنا سے روکا اور فرمایا

لَاتَقْرَبُوْا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیْلاً. زنا کے پاس بھی مت پھٹکو اس لئے کہ وہ

فحش اور بے حیائی کی حرکت ہے اور بدترین راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے مقصود اصلی زنا سے روکنا ہے۔۔۔ لیکن زنا تک پہنچانے والے جو افعال تھے شریعت نے ان سے بھی روکا۔

حکم دیا گیا کہ عورت پر بری نگاہ بھی مت ڈالو' اجنبیہ کی طرف چل کر بھی مت جاؤ اس کی خوشبو سونگھنے کی طرف بھی ناک کو متوجہ مت کرو' اس کی آواز پر بھی کان مت دھرو۔۔۔ حالانکہ آواز کا سن لینا کوئی گناہ نہ تھا' خوشبو کا ناک میں آجانا کوئی گناہ نہیں تھا' لیکن چونکہ یہ ایک گناہ کا ذریعہ بنتا ہے اس واسطے اس سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے رکو۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰی لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ.

”اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرما دیجئے اپنی نگاہوں کو نیچا اور پست کریں۔۔۔“

اسی طرح۔

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ

اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم کیوں بیان کیا گیا۔۔۔؟

اس لئے کہ نگاہ پڑے گی' تو قلب اس سے اثر لے گا' ممکن ہے کہ دل میں فتنہ پیدا ہو جائے یا برائی کا جذبہ پیدا ہو جائے' اس لئے وہیں سے روک دیا۔

اسی طرح سے عورت کی آواز کو بھی عورت کہا گیا ہے کہ اس کی آواز سننے کی بھی کوشش مت کرو۔۔۔ بعض دفعہ آواز کی تاثیر سے بھی آدمی کے قلب میں برے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں' اس لئے آواز سے بچایا گیا۔

**حکمت حجاب**

یہی وجہ ہے کہ عورتوں لئے حجاب رکھا گیا کہ باہر نکلیں تو نقاب ڈال کر نکلیں کھلے چہرے نہ نکلیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان المرائة عورة مستورة. اذا خرجت استشرفها الشيطن۔

عورت' مرد کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے' اس کا ناموس اور اس کی آبرو ہے' جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے کہ اب کتنوں کو مبتلا کروں گا۔ کسی کو بد نگاہی میں' کسی کو بدخیالی میں مبتلا کروں گا۔۔۔ اس واسطے ارشاد فرمایا گیا کہ جب عورت باہر نکلے تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلے۔

پھر یہی نہیں فقط۔۔۔ یہ بھی کہا گیا کہ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ خوشبو لگا کر نکلی تو خوشبو پھیلنے پر خیالات متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کو بھی ر[illegible] دیا گیا' بلکہ یہاں تک فرمایا گیا۔

من اصابت بخورا فھی کذا و کذا

جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلی، وہ بمنزلہ زنا کار کے ہے۔ گویا اس نے زنا کر لیا، اور زنا کا راستہ صاف کر دیا۔۔۔ حتی کہ بعض روایات میں یہاں تک بھی ہے وہ گھر میں آکر غسل کرے۔ اس نے ناپاکی کا راستہ اختیار کیا۔

### ممانعت اختلاط

پھر تاکید فرمائی گئی کہ جب عورت باہر نکلے اور نقاب ڈال کر نکلے تو راستے کے بیچ میں نہ چلے، کنارے پر چلے تاکہ مردوں سے اس کی مڈ بھیڑ نہ ہو۔۔۔ مسلم کا حق فرمایا گیا ہے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا۔۔۔ عورت کو ممانعت کی گئی کہ اجنبی مردوں کو نہ سلام کرے اور نہ اس کے سلام کا جواب دے۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مرد کا اختلاط پیدا نہ ہو۔ یہی اختلاط برائیوں اور بدعملیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد، عورت کا اختلاط بڑھ جائے گا یقیناً وہ سوسائٹی بدکار بن کر رہے گی۔ کتنا ہی وہ دعوے کرے کہ وہ تقوی شعار ہے مگر ناممکن اور محال ہے، اس لئے شریعت نے روکا اجنبی مرد عورت کا خلط ملط نہ ہو۔

اول تو بے ضرورت گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کسی ضرورت سے جائے تو نقاب ڈال کر جائے، نقاب بھی ڈال کر جائے تو راستے کے کناروں پر چلے وسط میں نہ چلے، کناروں پر بھی چلے تو خوشبو لگا کر نہ چلے کہ وہ خود کو لوگوں کی توجہات کا ذریعہ بنائے۔ سب چیزیں اس لئے کہ اختلاط نہ ہونے پائے۔

### مسجد نبوی میں صحابیہؓ کی شرکت جماعت کے لئے درخواست

حدیث میں ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ فرمایا گیا ہے جو ایک انصاری عورت ہیں۔ اور خیر القرون ہے۔ نیکی ہی نیکی مردوں اور عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زمانہ نبی کریم ﷺ کا ہے۔۔۔ غرض ام حمید ساعدیہؓ نے حضور ﷺ کے سامنے ایک درخواست پیش کی اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں مسجد نبوی میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں، حضور ﷺ کی امامت میں میری نماز ہو"۔

کتنی پاکیزہ درخواست پیش کی۔۔۔!

اول تو نماز افضل العبادات ہے کہ اس سے اونچی کوئی عبادت نہیں، اس کی درخواست کی۔۔۔ پھر اس عبادت کی درخواست بھی کہاں کی۔۔۔؟ مسجد نبوی میں۔۔۔ جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔۔۔ کون سے امام کے پیچھے درخواست کی۔۔۔؟ جو عالم میں سب سے افضل ہستی اور ذات بابرکات ہے۔۔۔ اور کس جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھنے کی درخواست کی۔۔۔؟ صحابہؓ کی جماعت میں۔۔۔ جن کے بارے میں مسلمانوں کا اجماعی

عقیدہ ہے کہ امت میں بڑے سے بڑا قطب، غوث کسی مقام پہ پہنچ جائے۔ صحابیت کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، تو صحابہؓ تمام امت سے بالاجماع افضل ہیں۔۔۔ تو کتنی پاکیزہ درخواست کی کہ افضل العبادات نماز کی درخواست تھی۔ بہترین اور اعلیٰ ترین مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست تھی۔۔ اعلیٰ ترین جماعت میں شامل ہونے کی درخواست تھی اور اعلیٰ ترین امام کے پیچھے نماز کی درخواست تھی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا:

**صلوٰتك فی دارك خیر من صلوٰتك فی مسجدی هذا**

تیرا نماز گھر میں پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

پھر فرمایا:

**وصلوٰتك فی مخدعك خیر من صلوٰتك فی بیتك**

"اور گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے دالان میں نماز پڑھنے سے۔"

گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ جس حصے میں پردہ بڑھتا گیا، اس حصے میں افضلیت بڑھتی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی بہ نسبت گھر میں عورت زیادہ پردہ نشیں ہے تو اس میں نماز افضلیت قرار دی گئی پھر گھر کے صحن سے دالان میں زیادہ پردہ ہے کہ آسمان سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں بہ نسبت صحن کے افضل ہے، پھر اندر کی کوٹھڑی دالان سے زیادہ افضل ٹھہرائی گئی کہ اس میں اور بھی زیادہ پردہ ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ جتنا زیادہ پردہ ہوگا، جتنا زیادہ چھپنا ہوگا اتنی ہی زیادہ افضلیت عورت کے لئے بڑھتی جائے گی۔

حتیٰ کہ مسجد حرام و مسجد ابراہیمی مکہ مکرمہ میں جس کے حج کے لئے عالم جاتا ہے۔ جو ہم سب کی عبادت کا مرکز ہے کہ جب تک ہماری اپنی مسجد کا رخ مسجد حرام کی طرف نہیں ہوگا اس وقت تک قبول نہیں ہوگا۔ گویا ہر مسجد، مسجد حرام کی طرف رخ کیے ہوئے ہے۔۔۔ اس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ:

"وہاں ایک نماز پڑھنا، ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے"۔

گویا ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے۔۔۔ لیکن عورت کے لئے یہ افضلیت نہیں رکھی گئی۔ عورت وہاں بھی اگر گھر میں پڑھے گی تو اس نماز سے زیادہ افضل نماز ہوگی جو کہ وہ مسجد حرام میں نماز پڑھتی۔۔۔ تبر کا آدمی عورت کو اجازت دے دے کہ وہ کسی نہ کسی وقت جا کے مسجد حرام میں نماز پڑھ لے۔ لیکن وہ اتنی پابندی نہ کرے کہ دھوپ ہو، گرمی ہو، کسی نہ کسی طرح پہنچے۔۔۔۔ فرمایا افضل یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھے اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ وہاں اجنبی مردوں کا ہجوم ہے، اختلاط زیادہ بڑھے گا، ممکن ہے کہ قلب میں کوئی فساد پیدا ہو جائے۔۔۔ ممکن ہے کوئی برائی آجائے، ممکن ہے کوئی

برائی پیدا ہو۔ تو شریعت چاہتی ہے کہ نفس انسانی کو پاک بنایا جائے جس میں خیالات بھی برے پیدا نہ ہوں اس لئے ان اسباب کو قطع کیا جائے گا جن سے کوئی بدخیالی پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ کیفیت کیوں ہے؟ دراصل اسے اسی بری حرکت سے بچانا ہے' یہ چیزیں اس برائی کا جسے زنا کہتے ہیں ذریعہ بن سکتی تھیں' تو یہیں سے روک دیا گیا۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ذرائع کہتے ہیں۔۔۔ یعنی وسائل سے روک دیتے ہیں تاکہ آدمی مقاصد سے بچ سکے۔۔۔ اگر وسائل اور ذرائع میں پھنس گیا تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور مقصد تک پہنچ جائے گا۔

## طریق تربیت

حدیث میں ہے کہ

**ماا سکر کثیره فقلیله حرام**

جس چیز کے بہت سے حصے میں نشہ ہے اس کا تھوڑا حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کا جیسے ایک گھونٹ ممنوع ہے' ایک قطرہ چکھنا بھی ممنوع ہے' حالانکہ ایک قطرہ پینے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا' اور شراب نشے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے' تو ایک قطرہ پی لینا جائز ہونا چاہئے' اس لئے کہ اس میں حکم کی علت نہیں پائی جاتی اور وہ نشہ ہے۔ جب ایک قطرہ چکھنے میں نشہ نہیں ہے تو جائز ہوتا' مگر اسے ناجائز قرار دیا گیا۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ اس لئے کہ جس نے آج ایک قطرہ چکھا ہے' وہ کل ایک گھونٹ بھی پئے گا۔ اور جو کل کو ایک گھونٹ پئے گا' وہ کل کو ایک گلاس بھی پئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پئے گا وہ چند دن کے بعد شرابی بن جائے گا۔ شرابی بننے سے روکنا اصل مقصود ہے۔ تو ایک قطرہ سے رکاوٹ شروع کی تاکہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حدیث میں ہے کہ

**من اتی عرافاً فقد کفر بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم**

"حدیث میں ہے کہ جو کسی جادوگر کے پاس گیا اس نے شریعت محمدی کے ساتھ کفر کیا"۔

حالانکہ کفر جب ہوتا ہے جب آدمی توحید کا انکار کردے' نبوت کا انکار کردے' قیامت کا انکار کردے' تب کفر لازم ہوتا ہے۔ جادوگر کے پاس جانے سے تو بظاہر کفر نہیں آنا چاہئے۔

مگر اسے کفر کیوں قرار دیا گیا۔۔۔؟

نتیجے کے اعتبار سے کہ جو آج جادوگر کے پاس گیا ہے تو اول تو اس کے دل سے جادو کی برائی نکلے گی۔ کل کو وہ فرمائش کرے گا کہ تو کچھ جادو کر۔ پرسوں کو وہ سیکھے گا کہ مجھے بھی یہ تعویذ اور منتر سکھلادے اور ترسوں کو اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔

اس سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے ہی سے روک دیا گیا۔ کہ جادوگر کے پاس جاتے ہی کیوں ہو۔۔۔؟ اور یہ نوبت آئے ہی کیوں۔۔۔؟ تو یہ سد ذرائع ہے کہ وسائل سے روک

دیتے ہیں تاکہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچ پائے۔

## آج کی عورت کا تمدن

اب آج کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو ہم سب سے زیادہ منکرات میں گرفتار ہیں۔ یعنی کہا تو یہ گیا ہے کہ اجنبی عورت باہر نہ نکلے' بے پردہ نہ نکلے 'آج عورتوں کا کیا' قوم کا شعار اور تمدن یہ بن گیا ہے کہ جتنی عورت زیادہ سے زیادہ باہر جائے اسے تہذیب سمجھا جاتا ہے۔۔۔ حالانکہ حدیث میں صاف فرمایا گیا اور خبر دی گئی کہ ۔

رب كاسيات عاريات مائلات مميلات لايدخلن الجنة

بہت سی عورتیں جو لباس پہنی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی ننگی ہیں۔ وہ نکلیں گی کہ لباس بھی پہنے ہوں گی 'مگر پھر بھی عریاں ہوں گی دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کریں گی ان کو جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جنت کا مقام کریم انکا ٹھکانا نہیں ہوگا جب تک انہیں سزا دے کر پاک نہ بنایا جائے یا جو بھی اللہ چاہے' ایکا ایکی وہ اس مقام کریم میں داخل ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

فرمایا گیا کہ ایک وقت آئے گا کہ عورتوں کے سر ایسے ہوں گے جیسے اونٹ کی کوہان حرکت کرتی ہوئی ہوتی ہے۔۔۔ یعنی بال اس طرح سے بنائیں گی جیسے اوپر ایک ٹوکرا سا رکھا ہوا ہو اور معلوم ہو کہ اونٹ کی کوہان ہے۔ آج ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔ اسی طرح سے مائلات بھی ہیں اور ممیلات بھی ہیں اور کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں۔

## لباس کی عریانی

لباس پہنے ہوئے ہیں اور پھر عریاں ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لباس ہی ناقص ہو۔ جیسے آج کل ہے کہ پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی ہیں بازو بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سینہ بھی کھلا ہوا پشت بھی کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ عورت کا بدن گردن سے لے کر ٹخنوں تک ستر قرار دیا گیا ہے کہ اس کو وہ نہ چھپائے تو نماز نہیں ہو سکتی۔ سوائے خاص حالتوں کے۔ تنہائی میں بھی اس کا چھپانا ضروری ہے۔ چہ جائے کہ بھرے مجمعوں میں عورتیں ستر کھول کر نکلیں۔ تو ایک تو لباس کے ناقص ہونے کی وجہ سے عریانی ہو اور لباس ہی ناتمام ہو کہ گھٹنے ٹخنے سب ننگے۔

اور ایک یہ کہ لباس تو پورا ہو 'گردن سے لے کر ٹخنے تک سب بدن چھپا ہوا' لیکن اتنا باریک ہو کہ چھپنے کے باوجود بدن اندر سے ڈھپک رہا ہے۔ یہ بھی کاسیات اور عاریات میں داخل ہے کہ لباس بھی ہے اور عورت پھر بھی ننگی ہے۔ اتنا باریک لباس نائیلون کا پہن لیا کہ وہ لباس نظر نہیں آتا' مگر بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس سر سے پیر تک ہو اور موٹے کپڑے کا ہو مگر بدن کے

اوپر اتنا چست ہو کہ بدن کی ساری حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ یہ بھی اس کا فرد ہے۔ جیسے آج کل ہم سنتے ہیں کہ ایک لباس چلا ہے جسے ٹیڈی کہتے ہیں کہ پاجامہ ہے تو وہ اتنا کسا ہوا اور چست ہے کہ اس میں ران اور پنڈلی کی پوری حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نظر نہ آئے۔۔۔ غرض ایک عریانی یہ ہے کہ لباس ناتمام ہو' اور ایک یہ کہ لباس پورا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ بدن کو چھپا نہ سکتا ہو۔ اور ایک یہ کہ لباس پورا بھی ہو اور موٹا بھی ہو مگر چست اتنا ہو کہ بدن کے حیثیت نمایاں کرتا ہو۔۔۔ یہ سب کاسیات وعاریات کہ لباس پہنے ہوئے ہو کر بھی عریانی کے افراد میں داخل ہیں۔

اس کو فرمایا گیا۔

**لایدخلن الجنة**

وہ جنت کی ہوا نہیں پائیں گی' مقام کریم تک نہیں پہنچیں گی۔ انہیں رضائے خداوندی کا مقام حاصل نہیں ہوگا'۔۔۔ آج نماز' روزہ جتنا ضروری ہے ان سے زیادہ ان چیزوں سے بچنا اور بچانا ضروری ہے کہ ہم خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی بچائیں اور اپنی عورتوں کو بچائیں۔

## اجتناب منکرات کی تاکید شریعت

نے یہاں تک اس کی تاکید کی ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہوں' ابھی جوان بھی نہیں ہوئے' دس گیارہ برس کے ہیں تو فرمایا گیا کہ دونوں کو تنہا مکان میں مت چھوڑو' ایک چارپائی پر شریعت نے دو بہن بھائی کو لیٹنے کی اجازت نہیں دی' حالانکہ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ابھی بالغ بھی نہیں ہیں۔ مراھقت کا درجہ ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر ہے۔

مثال مشہور ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ شیطان کو آتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ شریعت رحیم وکریم وہ ایسے اسباب ڈالتی ہے کہ ہر انسان مقدس اور منزہ بنے' پاک اور پارسا بنے' تو ان اسباب سے بچنا پڑے گا۔ جو تقویٰ وطہارت اور پارسائی میں حارج ہوتے ہیں۔۔۔ ان سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جتنا کہ فرائض کا انجام دینا ضروری ہے' ایک طرف آپ نماز پڑھیں اور ایک طرف گھر کی معاشرت جو بدکاری کی طرف جارہی ہو اسے نہ روکیں تو وہ نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھائے گی جب تک ان چیزوں سے بچاؤ نہ ہو' دوا اثر نہیں دکھلائے گی' جب تک پرہیز نہ کیا جائے' ایک طرف توزکام کی حالت میں آپ نے گل بنفشہ پیا اور دوسری طرف آپ نے سیر بھر دہی برف ملا کر پی لیا' تو گل بنفشہ کا ایسے میں کیا اثر ظاہر ہوگا۔۔۔؟

غرض منکرات سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے' جتنا کہ معروف چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

## سوسائٹی کی تباہی کے عوامل

اور منکرات میں بھی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچنا زیادہ

ضروری ہے۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ۔

ایاکم و محقرات الذنوب۔

اے لوگو! حقیر گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کرو' بڑے بڑے گناہوں سے تو آدمی کبھی وضع داری اور ظاہر داری کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ ایک اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے والا کبھی کھلے بندوں شراب نہیں پیے گا۔ اس کا جی تو چاہتا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ایسا بڑا آدمی اور شراب خانوں میں بیٹھا ہے۔ تو اس سے بچنا کبھی سوسائٹی کی وجہ سے بھی ممکن ہوتا ہے۔۔۔ لیکن چھوٹے چھوٹے گناہ جن کی طرف کسی کی بھی نگاہ نہیں جاتی' انہیں آدمی کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ سمجھتا ہے کہ وضع داری کے خلاف مجھ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔۔۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو' وہی آدمی کے قلب کا ناس مارتے ہیں آپ اجنبیہ کی طرف نگاہ ڈالدیں کوئی دیکھنے والا نہیں' کوئی بھی نہیں سمجھے گا' لیکن اس سے بچنا' اس سے زیادہ ضروری ہے جتنا زنا سے بچنا کیونکہ آگے بڑھنے کا یہی راستہ ہے۔ تو۔۔۔ کایاکم و محقرات الذنوب

سب سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو جن کو آدمی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور کر بھی لیتا ہے۔ اور انجام کار وہ بڑی برائی کی طرف پہنچادیتے ہیں۔ سوسائٹی جو تباہ ہوتی ہے۔ وہ منکرات سے تباہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ان سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

## اخلاقی جرات کے بغیر استحصال جرائم ممکن نہیں

اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ قلب کے اندر پارسائی کا جذبہ پیدا نہ کرلیا جائے یعنی دوسرے روکتے ہیں اور آپ رکتے ہیں۔ اسے رکنا نہیں کہتے یہ تو مجبوری کا رکنا ہے' آپ کے قلب کے اندر خود داعیہ پیدا ہو کہ مجھے رکنا چاہئے اگر قانون آپ کو روکے اور آپ رک جائیں' یہ مجبوری کا رکنا ہے۔ ہزاروں جرائم اور ہزاروں برائیاں ہیں کہ قانون سے ان کا استحصال نہیں ہوسکتا' قانون سے وہ جرائم بند نہیں ہوسکتے جب تک خود انسان میں بچنے کی اخلاقی جرات نہ ہو اور اپنے اندر جذبہ ہو۔

ایک تھیلی میں بھرا ہوا تین لاکھ روپیہ ایک تنہا مکان میں رکھا ہوا ہے وہاں پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں' سی آئی ڈی کا بھی کوئی آدمی نہیں۔ اگر آپ اٹھالیں کوئی روکنے والا نہیں۔ پھر بھی اگر آپ رکتے ہیں۔ تو کیوں رکتے ہیں۔۔۔؟ اللہ کا خوف آپ کو رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تو اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے' پولیس نہیں بچاسکتی۔۔۔

## قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہوسکتے

اگر پولیس سے' ہتھیاروں سے' اور فوجی

قوتوں سے گناہوں رو کا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی۔۔۔ زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں، فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے۔ پولیس اتنی کبھی نہیں جتنی آج ہے۔۔۔ حتی کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔۔۔ لیکن یہ چیزیں بڑھتی جا رہی ہیں جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ بنا وہی ہے کہ جرائم کا روک لینا، پولیس کا کام نہیں ہے، محض قانون کا کام نہیں، جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو، اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔۔۔

## تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے

حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ جو خود حضرتؒ نے ہی سنایا تھا کہ وہ سہارنپور کا سفر فرما رہے تھے۔ اور سہارنپور کے گنے مشہور ہیں بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ تو دو تین دھڑی گنے خرید لئے۔ اتفاق سے ساتھ میں دو ایک مسلمان چیکر بھی تھے جو حضرتؒ سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ

"بھائی! کانٹے پر جا کر انہیں تلوا دو۔ تا کہ محصول ادا کر دوں"۔

وہ جو چیکر ساتھ تھے، انہوں نے کہا، حضرت! اس کی ضرورت نہیں ہم ہی تو چیک کرتے ہیں اور ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ بے تکلف تشریف رکھیئے۔۔۔

فرمایا

"بھائی! مجھے آگے جانا ہے"۔

انہوں نے کہا، آگے آپ کہاں جائیں گے ؟

فرمایا

"فی الحال تو میں کانپور جا رہا ہوں۔ اور آپ لوگ غازی آباد میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دلی چلیں جائیں گے۔۔۔ پھر آگے کیا ہوگا؟ وہ دوسرے چیکر آئیں گے۔ اور وہ ڈبل محصول لیں گے، ممکن ہے کہ وہ جرمانہ بھی ڈالیں، تو آپ مجھے مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

انہوں نے کہا کہ ہم غازی آباد میں اس گاڑی کے چیکر کو کہہ دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں روکیں گے۔۔۔ فرمایا۔۔۔

"جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور دروازے سے باہر جاؤں گا تو وہاں ٹکٹ لینے والا کھڑا ہوگا وہ کہے گا۔۔۔'

انہوں نے کہا۔ ہم ان چیکروں کے ذریعے اس بابو سے بھی کہلوا دیں گے، وہ بھی آپ کو

نہیں چھیڑے گا۔۔۔۔

اس پر فرمایا

"بھائی! مجھے اور آگے جانا ہے۔۔۔۔"۔

انہوں نے کہا، حضرت! آگے اور کہاں جانا ہے۔ بس آپ گھر پہنچ گئے، فرمایا "اس سے بھی آگے جانا ہے"۔

"مجھے اللہ کے پاس بھی تو جانا ہے، مجھے اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، اگر چیکر نے چھوڑ دیا اور گھر تک پہنچ گیا، مگر قبر اور حشر میں میرا کیا حال ہو گا۔ پھر مجھ سے گرفت ہو گی کہ تم نے کیوں یہ ناجائز حرکت کی؟ تم نے قانون کی یہ چوری کیوں کی۔۔۔؟ اس وقت میں کیا جواب دوں گا؟ اس لئے آپ مہربانی کر کے تلوادیں، میں یہیں سے محصول دیئے دیتا ہوں، تاکہ میں دنیا اور آخرت کی گرفت سے بچا رہوں"۔

یہ چیز تھی جس نے حضرتؒ کو بچایا، اور ہر مسلمان کو بچانے والی چیز یہ "خوف خداوندی" ہے جو قلب کے اندر ہوتا ہے یہ جرائم سے بچاتا ہے، قانون منظر عام کی برائیوں کو روک سکتا ہے، اگر آپ کھلے بندوں ڈکیتی ڈال رہے ہوں یا کھلے بندوں بدامنی کی، پولیس آکر آپ کو پکڑ لے گی، مگر تنہائی میں چھپ کر بدامنی ہوتی ہے جہاں پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو، وہاں بچانے والا کون ہے، وہ تو وہی اپنا ضمیر اور اپنا قلب بچائے گا۔ تو سب سے بڑی پولیس وہ قلب کا جذبہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، ایک بھی پولیس نہ ہو اور قلب کے اندر موجود آدمی خود بخود بچے گا۔۔۔۔

## انسداد جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی

دو واقعے یاد آئے۔ اور دونوں میں فرق کا آپ اندازہ کریں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کچھ عرصہ ہوا ہے کہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا کر شراب کی بندش ہونی چاہئے۔ چنانچہ جتنے ذمہ داران حکومت تھے وہ اس پر متفق ہو گئے کہ شراب کو بند ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو شراب بندی کا قانون بنائے۔ اس کے لئے کتنے لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ برس ڈیڑھ برس میں وہ قانون تیار ہو گا، تو قانون بنانے والوں کی تنخواہیں دی جائیں گی، دفتری اخراجات ہوں گے، تو لاکھوں روپے کا بجٹ منظور ہوا۔۔۔ برسوں میں وہ قانون تیار ہوا۔۔۔ جب قانون بن گیا، اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا اس کی پہلی خواندگی ہوئی۔۔۔۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے منظور کر کے یہ حکم جاری کیا کہ پبلک میں اس کا اشتہار دیا جائے اور اس قانون کو عام کیا جائے، تاکہ اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو۔۔۔ اس کی لکھائی چھپائی اور رائج کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کا بجٹ منظور ہوا، تاکہ اس قانون کو چھاپ کر پورے ملک میں شائع کریں۔ تاکہ جتنے اہل فکر ہیں وہ اس پر رائے زنی کریں۔۔۔۔

ایک عرصے تک اس کو منتشر رکھا گیا اور پھیلایا گیا' تا کہ لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔

جب رائیں آگئیں پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا' پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا' اب اس کو چلانے کے لئے کئی کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ زائد پولیس رکھی جائے جو اسے جاری کرے اور نافذ کرے' تا کہ اہل ملک اس پر عمل کریں' گویا کروڑوں روپے خرچ کر کے قانون بنا اور وہ جاری کر دیا گیا۔

پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایک برس کے بعد رپورٹ کرے کہ اس پر عملدر آمد کیسا رہا' اور اس کے کیا اثرات نمایاں ہوئے۔۔۔؟

برس دن کے بعد پولیس نے رپورٹ دی کہ پہلے اگر شراب پینے والے پچاس ہزار تھے تو اب ایک لاکھ بن گئے ہیں۔۔۔ یہ اس کا اثر نمایاں ہوا۔۔۔ اور وہ کیوں نمایاں ہوا۔۔۔؟

اس لئے کہ پہلے شراب خانے کھلے ہوئے تھے' ہزاروں آدمی پیتے تھے۔۔۔ مگر بہت سے وضعدار لوگ اس لئے نہیں پیتے تھے کہ ہماری ساکھ پر دھبہ آئے گا لوگ ہمیں برا سمجھیں گے کہ یہ شرابیوں کی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں' وہ بچتے تھے اور اکا دکا آدمی چھپ چھپا کر پی لیتا تھا۔

لیکن جب قانون کی بندش ہو گئی' اور سب کو روک دیا گیا تو سب نے بلیک کر کے اسے چوری سے پینا شروع کیا' تو جو لوگ وضعداری کی وجہ سے کھلم کھلا نہیں پی سکتے تھے' انہوں نے کہا کہ اب جب سارے چوری سے پی رہے ہیں تو ہم بھی چوری سے پینے لگیں' تو پہلے پینے والے پچاس ہزار تھے' اب ایک لاکھ بن گئے۔۔۔۔ یہ گویا اس قانون کا نتیجہ نکلا۔ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔۔۔ اس نے کہا کہ یہ حکمت کے وقار کے خلاف ہے کہ اس قانون کو واپس لیا جائے۔ قانون جاری رہے اور پولیس دارو گیر کرتی رہے تو قانون بھی چلتا رہا۔ اور شراب خوری بھی چلتی رہی۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ رہیں۔ انسداد نہیں ہو سکا' بالکل شراب بند نہیں ہو سکی' پینے والے پیتے رہے' چوری سے پیتے رہے۔ گویا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اکارت گیا جو صرف کیا گیا تھا۔ جو پہلے صورت تھی وہی اب ہے بلکہ بری ہو گئی کہ چھپ چھپ کر لوگ پیتے ہیں۔

ایک تو یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔۔۔ اور ایک دوسرا واقعہ سامنے رکھیئے۔

## انسداد جرائم میں اسلام کا طریق کار

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب عام تھی' تمام عرب پیتے تھے شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی' حتی کہ بچہ پیدا ہوتا۔ تو پہلے اس کو شراب چٹاتے تھے۔ اتنی شراب عام تھی۔۔۔ اسلام آنے کے بعد بھی شراب رائج رہی' لوگ پیتے رہے۔۔۔ مسلم بھی ہیں اور پیتے بھی رہے۔۔۔ لیکن جب وقت آیا کہ کہ شراب کو بند کیا جائے' تو ایکا ایکی حکم نہیں دیا گیا کہ روک دو' سب سے پہلے چیز یہ تھی کہ قلوب میں ایک سوال پیدا ہوا۔ قرآن کریم نے اس کو نقل کیا۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

”اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں“۔

قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

آپ فرمادیں کہ جوئے اور شراب میں کچھ نفع ہے، کچھ نقصان ہے، مگر نقصان غالب ہے، نفع مغلوب ہے۔ نقصان زیادہ ہے نفع کم ہے۔

اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا

شراب اور جوے کا نقصان زیادہ ہے، نفع کم ہے۔۔۔ بس اتنی آیت نازل ہوئی، شراب پینے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، صرف اس کی مذمت بیان کی گئی، تو حدیث میں ہے کہ بہت سے وہ خواص صحابہ رضی اللہ عنہم جو منشاء نبوت کو سمجھتے تھے، انہوں نے آج ہی سے شراب ترک کردی کہ جب اللہ تعالیٰ نے نقصان بیان کیا ہے تو شراب پسند معلوم نہیں ہوتی۔

غرض بہت سے حضرات نے تو اسی دن ترک کردی تھی۔۔۔ لیکن کچھ لوگ پینے بھی رہے۔ چند دن کے بعد ایک دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور ایک دوسری آیت نازل ہوئی

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى

”اے ایمان والو! شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو“۔

تو نمازوں کے اوقات میں شراب ممنوع قرار دی گئی۔ نمازوں کے اوقات کے سوا لوگ پیتے رہے، نماز کی حالت میں شراب پی کر جانا حرام قرار دیا گیا، گویا پانچ اوقات میں بندش ہوئی، باقی اوقات میں جائز ہوئی۔۔۔ اس آیت کے اترنے کے بعد ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب ترک کردی کہ رخ یہ بتلا رہا کہ یہ ممنوع کی جائے گی اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد تیسرا حکم نازل ہوا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

”اے اہل ایمان! یہ شراب اور جوا، اور یہ فال نکالنے کے تیر و ترکش یہ شیطانی حرکتیں ہیں، ان کے پاس بھی مت پھٹکو۔۔۔ آج مکمل طور پر شراب حرام ہوئی“۔

حدیث میں ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے، جس کے گھر میں دس مٹکے تھے، اس نے وہ پھوڑ دیئے، جس کے ہاں ایک مٹکا تھا، اس نے وہ توڑ دیا، اور مدینے کی گلیوں میں، نالیوں میں شراب اس طرح بہتی پھر رہی تھی جیسے برسات میں پانی برستا ہے۔ ایک قطرہ کسی کے گھر میں باقی نہیں رہا۔ تو آپ نے فرق دیکھا کہ امریکہ نے کئی کروڑ کا بجٹ منظور کیا اور ثمرہ یہ نکلا کہ پینے والے

دو گنے ہو گئے' اسلام کے دور میں نہ بجٹ منظور ہوا' نہ ایک کروڑ کا' نہ ایک پیسے کا۔ ممانعت کا حکم بھی پوری طرح سے نہیں آیا کہ لوگوں نے شراب کو چھوڑنا شروع کر دیا۔۔۔ اور ایک ایک گھر پاک اور صاف ہو گیا۔۔۔

## قانون حکومت اور قانون الٰہی کا فرق

فرق کیا تھا۔۔۔؟

وہاں قانون کا دباؤ تھا' یہاں اللہ کا خوف تھا' خوف خداوندی آیا تو شراب کا استحصال ہو گیا اور جڑ کٹ گئی' وہاں قانون' محض کا دباؤ تھا۔ تو قانون محض سے جرائم بند نہیں ہوا کرتے جب تک اپنے قلب میں اللہ کا خوف اور ڈر موجود نہ ہو۔۔۔ تو شریعت اسلام برائیوں اور منکرات سے بچانا چاہتی ہے' مگر دباؤ سے نہیں۔ اس کے ذریعے بچانا چاہتی ہے کہ خود تمہارے ضمیر کے اندر دباؤ پیدا ہو۔ ضمیر خود کہے کہ یہ بری چیز ہے۔ ہم اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔

## حقیقت معصیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

**مالاثم یا رسول اللہ؟**

یا رسول اللہ گناہ کیا چیز ہے۔۔۔۔؟

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب پینا گناہ ہے' زنا کرنا گناہ ہے' چوری کرنا گناہ ہے' یہ نہیں فرمایا۔۔۔ کیا فرمایا۔۔۔؟

**ماحاك فی صدرك ....**

"تم پوچھتے ہو گناہ کیا ہے۔۔۔؟

جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے وہ گناہ ہے۔ اسے ترک کر دو' جس کو تم کھلے بندوں نہ کر سکو' لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماؤ' سمجھ لو' وہ برائی ہے اور گناہ ہے' بس اس سے بچنے کی کوشش کرو۔۔۔ گویا گناہ سے بچنے کا تعلق قلب سے رکھا گیا۔ ماحاک فی صدرک' جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کر دے' اس سے بچو۔ یہ نہیں کیا گیا جس سے پولیس روکے اس سے بچو' جس سے حکومت اور فوج روکے اس سے بچو' اس لئے کہ وہ منظر عام کی چیزوں سے روکیں گی' اور دل میں تمہارے کھوٹ رہا تو آنکھ بچا کے پھر تم وہی حرکت کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دل پاک ہو۔ فقط ہاتھ اور پیر کے پاک ہونے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ جب چور کو جیل میں بند کر دیتی ہے۔ وہ یقیناً اتنے دن چوری سے بچا رہے گا جتنے دن جیل میں رہے' لیکن اس کے قلب سے چوری کا جذبہ نہیں نکلتا وہ اس ارادے میں ہے کہ جب چھوٹوں گا پھر آ کر وہی حرکت کروں گا۔۔۔ بلکہ بعض چور تو یہ کہتے ہیں کہ گھر ویسی اچھی روٹی نہیں

ملتی جتنی آزادی سے جیل میں ملتی ہے‘ اس لئے ایک دفعہ پھر چوری کرو تاکہ بڑے گھر میں پہنچ جاؤں‘ بے محنت روٹی ملے گی۔۔۔۔ اسلام چاہتا ہے کہ قلوب پاک کئے جائیں قانون فقط بدن کو پاک کرے گا‘ قلب کو پاک نہیں کرے گا‘ دنیوی حکومتوں کا قانون بدن پر نافذ ہوتا ہے‘ لیکن اللہ کا قانون دلوں پر نافذ ہوتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی حکومت فقط ظاہر پر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکومت باطن کے اوپر بھی ہے‘ اس کا قانون جیسے ظاہر کو روکے گا‘ ویسے باطن کی برائی کو بھی روکے گا‘ تو شریعت تو یہی چاہے گی کہ فقط یہ نہ ہو کہ تم زنا سے بچ جاؤ یہ ہو کہ زنا کا خیال بھی نہ لاؤ‘ بلکہ یہ ہو کہ تمہارے قلب میں زنا سے اس طرح نفرت ہو جائے جس طرح نجاست سے نفرت ہوتی ہے‘ شراب خوری سے تمہیں اس طرح نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی ہے۔۔۔ یہ جب ہوگا۔ جب قلب پاک ہوگا۔

## تربیت کا مرکزی نقطہ

تو سب سے بڑی چیز اسلام میں ”تزکیہ قلوب“ یعنی دلوں کو پاک بنا دینا ہے تاکہ جذبات صالح پیدا ہو جائیں‘ برے جذبات مغلوب ہو جائیں۔ مطمئن ہو کر رہیں‘

اس لئے فرماتے ہیں کہ ؎

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا

فلاح وہ پائے گا جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ یہ نہیں کہ کہ فلاح وہ پائے گا جو برائی چھوڑ دے گا اور برے عمل سے بچ جائے گا‘ عمل چھوڑ دیا مگر دل میں کرنے کی تمنا ہے۔ جبری طور پر اس نے چھوڑ دیا‘ صلاح اور فلاح پانے والا وہ ہے جس کا قلب پاک ہو جائے‘ اس میں برائی سے نفرت بیٹھ جائے۔ اور قلب خود یوں کہے کہ اس برائی کو مت کرو ؎

اس کو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ گناہ‘ شراب اور زنا نہیں بلکہ ماحاك فی صدرك‘ جب تمہارا دل یوں کہے کہ یہ برائی ہے تو اس برائی کو چھوڑ دو‘ وہی فی الحقیقت برائی ہے تو انسان کی پاکی کا دارومدار اس کے قلب کے اوپر ہے‘ قلوب صحیح ہو گئے تو قالب بھی صحیح ہو گیا‘ قلب فاسد ہیں تو قالب بھی فاسد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ؎

وفی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله الا وهی القلب۔

انسان کے بدن میں گاجر کی شکل کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے‘ جو بائیں طرف لٹکا ہوا ہے‘ وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے۔ وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے۔۔۔ فرمایا ؎

الاوھی القلب

آگاہ ہو جاؤ' وہ انسان کا قلب ہے' اگر آپ کا دل درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور دل میں کھوٹ ہے تو سارے بدن میں کھوٹ ہے۔

اس لئے کہ دل ہی کے حکم سے آپ برا یا اچھا عمل کرتے ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے' خیال سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ ارادے سے عمل ظاہر ہوتا ہے اگر قلب میں فساد ہے تو خیالات بھی برے پیدا ہوں گے۔ برے خیالات سے برے ارادے پیدا ہوں گے۔ برے ارادوں سے اعمال بھی برے سرزد ہوں گے' اس لئے شریعت چاہتی ہے کہ بجائے اس کہ تم ہاتھ پیر کو مانجھو' دھوؤ اور صاف کرو تم قلب کو کیوں نہیں دھوتے' اس کو اگر تم نے دھولیا اور پاک کر لیا' تو سارا بدن خود بخود پاک ہو جائے گا

**تطہیر قلب**

اور قلب کی پاکی ذکر اللہ کی کثرت اور اللہ کے خوف کا مراقبہ کرنے سے ہے کہ آدمی سوچے' بہر حال ایک وقت مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اپنی زندگی کا جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں گا۔

حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کی حجت میں نے پہلے تلاش نہ کر لی ہو' تاکہ اللہ کے سامنے کہہ سکوں کہ فلاں بات فلاں حجت سے کی۔ محض نفسانی جذبہ سے نہیں کی تھی --- تو قلب حجت تلاش کرلے کہ جو بھی کرو' اس کی کوئی ایسی قابل قبول وجہ ہو کہ اللہ کے سامنے عرض کر سکو کہ یہ وجہ پیش آئی۔ تو اللہ سے زیادہ عذر کا سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا عذر لے کر پہنچیں گے' یقیناً آپ کی بات مانی جائے گی۔

کسی بھی گناہ کے کرنے پر یہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک دم سزا دے دی جائے' اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔ پوچھا جائے گا' اس کو کیوں کیا --- ؟ کوئی عذر تمہارے پاس ہے۔ ؟ اگر کوئی معقول عذر بیان کیا' معاف کیا جائے گا' کوئی عذر آدمی بیان نہ کر سکا' اور واضح ہو گیا کہ محض شقاوت نفس سے کیا جائے' اس وقت سزا جاری کریں گے' اس لئے آپ جو چیز کریں پہلے اس کی حجت تلاش کریں' اور حجت جب تلاش کریں گے جب قلب میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا

"صلاح اور فلاح وہ پائے گا جس نے اپنے قلب کو پاک کر لیا"۔

بدن کی پاکی کافی نہیں ہے --- کپڑوں کی پاکی کافی نہیں ہے۔ اصل پاکی دل کی ہے۔ وہ پاک ہے تو آپ بدن کو بھی پاک کریں گے' کپڑوں کو بھی پاک کریں گے۔

**درجات معصیت**

بہرحال فرمایا گیا۔ ایاکم و محقرات الذنوب

گناہوں سے تو بچو، مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہ نسبت بڑے گناہوں کے بہت زیادہ بچو، یہی بڑے گناہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اس واسطے شریعت اسلام نے گناہ کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک صغیرہ، ایک کبیرہ، مقصود کا درجہ وہ تو کبیرہ ہے اور وسائل کا درجہ صغیرہ کا ہے۔۔۔ زنا کا فعل یہ تو کبیرہ گناہ ہے، اور عورت پر نگاہ ڈالنا، تاک جھانک کرنا، اور اس کے پیچھے چلنا یہ صغائر ہیں۔

**درجات توبہ**

اگر کبیرہ سے بچ گیا، تو صغیرہ گناہ نیکیوں سے خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ.

نیکیاں، بدیوں کو خود مٹا دیتی ہیں۔۔۔ انسان جب نیکی کرے گا، جتنے صغیرہ گناہیں، کبیرہ سے بچنے کی وجہ سے وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ مگر کبیرہ معاف نہیں ہو گا جب تک آدمی توبہ نہ کرے، بلا توبہ کے اس کی گرد انسان کے قلب سے نہیں دھل سکتی۔۔۔

اور اس میں بھی اگر کبیرہ گناہ کیا اور اس میں مخلوق کی حق تلفی کی، وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہو گا۔ جب تک وہ خود حق معاف نہ کرے۔ اللہ کی آپ چوری کریں گے تو انسان ہے توبہ سے معاف ہو جائے گی۔۔۔ لیکن بندوں کی چوری کریں ہزار بار آپ توبہ کریں معاف نہیں ہو گی، جب تک اس کا مال اس کو واپس نہ دیدیں جس کا مال چرایا ہے۔۔۔ اگر کسی کو گالی دی ہے ہزار توبہ کریں معاف نہیں جب تک وہ معاف نہ کردے جس کو آپ نے ناحق گالی دی ہے۔ تو گناہ دو ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔۔۔ تو صغیرہ معاف ہو جاتا ہے جب آدمی کبیرہ سے بچ جائے، اور کبیرہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ اور وہ کبیرہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جس کا تعلق مخلوق سے ہو۔ جب تک اس کو صاحب حق سے معاف نہ کرائے۔

**قانونی سزا**

مثلاً زنا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں آدمی تین گناہ کرتا ہے اور تین کی حق تلفی کرتا ہے، چنانچہ زنا کرنے والے نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی اس نے حکم دیا تھا کہ زنا مت کرو، اس نے کیا تو خلاف ورزی کی۔ ایک گناہ تو یہ ہوا کہ اس نے قانون خداوندی کی خلاف ورزی کی۔

دوسرا اس نے پبلک کا گناہ کیا کہ امن اٹھا دیا اور ایسا راستہ پیدا کر دیا کہ لوگ زنا کرتے پھریں۔ تو یہ پبلک کا گناہ کیا۔۔۔

تیسرا گناہ اپنے نفس کا کیا کہ لازم تھا کہ نفس کو اس برائی سے پاک بناتا۔ اس نے زنا کر کے اپنے قلب کو، نفس کو، بدن کو، سب کو آلودہ کیا اور ملوث کیا۔ تو ایک خدا کی حق تلفی کی۔۔۔ ایک عوام کی حق تلفی کی۔۔۔ اور اپنے نفس کی حق تلفی کی، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے حق کو اگر چاہیں گے تو

معاف کر دیں گے ۔۔۔ لیکن یہ جو نفس میں گندگی بیٹھی ہوئی ہے اور یہ جو پبلک کا نقصان کیا ہے یہ توبہ سے ختم نہیں ہوں گے، جب تک سنگسار نہ کیا جائے اور رجم نہ کیا جائے، اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر توبہ کرنی ضروری ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ حد زنا جاری کر دی گئی، سنگسار کر دیا گیا، گناہ معاف ہو گیا۔۔۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ معاف نہیں ہوا۔ سنگسار کر دینے سے جو پبلک کی حق تلفی کی تھی وہ ختم ہو گئی، لیکن اللہ کی جو حق تلفی کی تھی وہ ابھی باقی ہے۔ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہو گی۔ اور نفس کی جو حق تلفی کی تھی وہ اس کے بغیر معاف نہیں ہوگی کہ آدمی آئندہ کے لئے عہد کرے کہ میں پھر اس حرکت بد سے بچوں گا۔

بہر حال حدود شرعیہ کی قانونی سزا بھی جاری ہو گی اور ساتھ ساتھ توبہ بھی ضروری ہے۔ اس قسم کے جرائم میں ایک انسان بہت سی حق تلفیاں کرتا ہے خدا کی حق تلفی الگ، عوام کی حق تلفی الگ، ملک کی الگ، اور اپنے نفس کی الگ ۔۔۔ تو توبہ سے خدا کا گناہ معاف ہو گا، حد جاری کرنے سے وہ گناہ معاف ہو گا جو پبلک کا ہے۔ وہ جو اس نے بدامنی کا راستہ ڈال دیا تھا، حد جاری کرنے سے امن قائم ہو گا۔

**نسخہ تطہیر**

مگر دیکھا جائے تو تینوں کا تعلق قلب ہی سے ہے۔ اگر قلب میں پاکی نہیں ہے۔ تو انسان نہیں بچے گا، اگر قلب میں پاکی ہے بے شک بچ جائے گا۔ اس واسطے سب سے زیادہ ضروری قلب کو صالح بنانا ہے، اس کے لئے شریعت نے ذکر اللہ کا نسخہ تجویز کیا ہے کہ یاد خداوندی ہمہ وقت تمہارے سامنے رہے، جتنا اللہ کی یاد سامنے ہو گی، اتنا ہی خوف خدا دل میں بیٹھے گا، اتنا ہی آدمی جرائم سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ذکر کی بجائے جتنی غفلت پیدا ہو گی، اتنی ہی معاصی اور گناہوں کی کثرت ہو گی ۔۔۔ اس لئے بنیادی چیز ی بتلائی گئی۔

اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

"یاد خداوندی اپنے اندر پیدا کرو ۔۔۔۔"

## ذکر معاشرت

اور ہمہ وقت یاد ہو ۔۔۔۔

نبی کریم ﷺ کی شان فرمائی گئی کہ

کان یذکر اللہ علی کل احیانہ

ہر دم اور ہر لحہ آپ ذکر اللہ کرتے تھے۔

امت کو بھی ایسا ہونا چاہئے ۔۔۔ لیکن آپ یہ کہیں گے کہ ہر وقت کس طرح ذکر کریں۔ دکان پر بھی جانا ہے، تجارت بھی کرنی ہے، زراعت بھی کرنی ہے، بال بچوں میں بھی رہنا ہے۔ ہر

وقت ذکر کرتے رہیں' یہ بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ سارے کام کریں پھر بھی آپ ہر وقت ذکر اللہ کر سکتے ہیں۔۔۔ ایک تو ذکر اللہ عرفاً ذکر ہے جیسے صبح و شام ایک ایک تسبیح پڑھی' یا نمازیں پڑھیں یہ تو ذکر ہی ہے۔۔۔ دوسرے اوقات میں' بال بچوں میں' دکان پہ جانا ہو' اس میں ذکر کی صورت یہ ہے کہ آپ دوکان پر جائیں' یہ نیت کر کے جائیں کہ میں اس لئے جارہا ہوں کہ چار پیسے ہاتھ لگیں تاکہ بال بچوں کی پرورش کروں یہ حکم خداوندی ہے' تو میں تعمیل حکم کے لئے جارہا ہوں اپنے نفس کے حظ کے لئے نہیں جارہا' اطاعت خداوندی کے لئے جارہا ہوں۔۔۔ زراعت کر کے اور یہ نیت کرے کہ چار دانے پیدا ہوں گے' بچوں کو بھی کھلاؤں گا' مخلوق کی بھی خدمت کروں گا' خدا کی مخلوق کی پرورش کروں گا'۔۔۔ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہو جائے گا' اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ بازار اور کھیت چھوڑ کے مسجد میں آکے تسبیح لے کر بیٹھیں' اسی بازار اور کھیت میں نیت کرلیں۔۔۔ اسی طرح سے ہر معاشرت کی چیز عبادت بن جاتی ہے اور اجر وہی ملتا ہے جو عبادت پہ ملتا ہے

حدیث میں ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے' ابتداء میں بسم اللہ کہے اور اخیر میں الحمد للہ کثیرا۔۔۔ فرماتے ہیں جب اس طرح سے اول و آخر میں ذکر کے ساتھ کھانا کھائے گا۔

غفر له ماتقدم من ذنبه.

اس کے اگلے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔

تو یہ کھانا' کھانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ مگر مغفرت گناہوں کی ہو رہی ہے جیسے نماز پر ہوتی ہے' ذرا سی نیت اور فکر کے بدلنے سے مغفرت مرتب ہو گئی۔

حدیث میں ہے کہ :-

من قاد اعمی غفر له ما تقدم من ذنبه۔

"جس نے اندھے کو راستہ دکھایا' جتنے اس کے صغیرہ گناہ ہیں بخش دیئے گئے"۔

اندھے کو راستہ دکھایا بظاہر کوئی نماز' روزہ نہیں کیا' لیکن ثمرہ وہی مرتب ہوا جو عبادت پر مرتب ہوتا تھا' اس لئے کہ نیت صحیح تھی۔۔۔ اسی طرح سے بہت سے اعمال فرمائے گئے ہیں جو معاشرتی ہیں اجر و ثواب ان پر طاعت و عبادت کا ملتا ہے' چونکہ وہ ذکر بن جاتے ہیں اس لئے کہ نیت صحیح ہوتی ہے۔

### ذکر دائمی

آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ نماز روزہ سے فارغ ہو کر آپ مسجد ہی کے اندر بقیہ سارے اوقات بیٹھے رہیں' یا ہمہ وقت ذکر کرتے رہیں۔۔۔ یہ نہیں۔۔۔ بلکہ دنیا کا جو کام ہو' نیت درست کرلو' اتباع سنت کرو' وہ سب ذکر میں شامل ہوتا جائے گا' تو آپ بھی ہمہ وقت ذکر اللہ کرنے والے بن گئے' جیسے حضور اکرم ﷺ ہمہ وقت ذکر فرماتے تھے' تمہیں بھی یہ مقام

میسر آسکتا ہے۔

اس طرح شریعت نے مختلف اوقات کی کچھ دعائیں بتلائی ہیں۔ انہیں یاد کرلو اور پڑھ لو تو پورے اوقات ذکر میں مشغول سمجھے جائیں گے، سورج نکلتے وقت یہ دعاء لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھ لی، استنجاء کو گئے تو یہ دعا پڑھ لی، بھائیوں سے مصافحہ کیا تو یہ دو جملے پڑھ لئے، یہ سب اذکار ہیں، ان کی عادت ڈالی جائے تو پوری زندگی ذکر اللہ میں گزر جائے گی۔۔۔ غرض ذکر اللہ ہمہ وقت ہونا چاہئے، اور ہمہ وقت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سب کھانے پینے کو چھوڑ دے، سب کاروبار چھوڑ دے، اس کھانے پینے ہی کو ذرا سی نیت کی تبدیلی سے ذکر بنائے تو پورے اوقات ذکر میں صرف ہو جائیں گے، اس سے قلب میں صفائی پیدا ہو گی، قلب میں جلا پیدا ہو گی۔

### تمرین ذکر

اور یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی مشق کر کے عادت ڈالیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان پر رہے، اوپر چڑھنے لگیں تو اللہ اکبر اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا، نیچے اترنے لگیں تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا۔ کوئی تعجب کی بات پیش آئی، آپ کہنے لگے سبحان اللہ، کیسی عجیب بات ہے، آپ نے کسی چیز کی قدر بڑھائی تو کہا ماشاء اللہ۔۔۔ اس کی اگر آپ عادت ڈالیں تو ابتداء میں تو ذرا تکلف ہو گا اور آپ کو تکلیف ہو گی۔ لیکن جب عادت پڑ جائے گی تو بے ارادہ بھی زبان پر ہر وقت اللہ کا نام جاری ہو جائے گا، عارفین اسی کی مشق کراتے ہیں، ابتداء میں ذرا سا تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ چیز بے ساختہ جاری ہو جاتی ہے۔

### دوام ذکر کا ثمرہ

اور اس کا ثمرہ کیا نکلتا ہے۔۔۔؟

پوری زندگی میں جب ذکر کی عادت پڑ گئی اور بلا اختیار زبان پر جاری ہوا تو مرتے وقت بھی اللہ ہی کا نام زبان پر جاری ہو گا، خاتمہ صحیح ہو جائے گا، اس خاتمے کے صحیح کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد اور محنت ہے کہ وہ آخری دم درست ہو جائے۔

من کان اول کلامه و اخر کلامه لا اله الا الله دخل الجنة.

تو جیسے حدیث میں ہے کہ اول کلام اور آخر کلام جس کا لا اله الا اللّٰه بن گیا ہے وہ شخص جنتی ہے۔۔۔ یہ آخر کلام لا اله الا اللّٰه کب ہو گا؟ جب زندگی میں خدا کا نام لینے کی مشق ہو گی۔

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا۔

تحشرون کما تموتون و تموتون کما تحیون

تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا جس حالت پر موت آئے گی، اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر تم نے زندگی گزاری ہے۔

غرض زندگی جس حالت میں گزاری ہے، موت اسی حالت پر آئے گی اور جس حالت پر

موت آئے گی میدان محشر میں اسی حالت پر آپ اٹھیں گے، اگر کسی نے زندگی میں یاد خداوندی کی مشق کی ہے، یقیناً مرتے وقت قلب میں اللہ کی یاد ہوگی، اور زبان پر اللہ کا نام جاری ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا۔

**قبر و حشر میں ذکر کا محافظتی کردار** یہی اذکار یہی کلمات اس کے لئے سنتری اور محافظ بنیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب آدمی قبر سے اٹھے گا تو لا الہ الا اللہ اس کے آگے آگے ہوگا۔ اللہ اکبر سر کے اوپر ہوگا، سبحان اللہ اس کے دائیں طرف ہوگا۔ الحمد للہ اس کی بائیں جانب ہوگا، اور یہ کلمات چاروں طرف سے گھیر کر آدمی کو اپنی حفاظت میں لے کر میدان محشر میں لے چلیں گے، ہر طرف سے عذاب سے بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے، اگر سر میں قرآنی آیات محفوظ ہیں جنہیں وہ یاد کرتا رہا تھا، وہ آیتیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔۔۔ دائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں فرمایا گیا الصلوٰۃ برھان۔۔۔ نماز انسان کی دستاویز ہے وہ دائیں جانب سے عذاب کو روک دیتی ہے۔۔۔ بائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ الصوم جنۃ "روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے"، بائیں جانب ڈھال کر کے ہی وار کو روکتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔۔۔ پیروں کی جانب سے عذاب بڑھے گا تو حدیث میں ہے کہ صدقات اور زکوٰۃ عذاب کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیونکہ یہ انسان کی چلت پھرت کی کمائی ہے اس لئے پیروں کی طرف سے عذاب کو روکتی ہے۔۔ غرض قبر میں بھی اگر عذاب کو روکنے والی کوئی چیز ہوگی تو وہ ذکر اللہ ہوگا۔ میدان محشر میں بھی اگر آبرو کے ساتھ انسان کو کوئی چیز لے جائے گی اور بڑھائے گی، وہ بھی ذکر اللہ ہوگا اور اللہ کا نام ہوگا۔ جو خاتمہ اچھا کرے گی وہ بھی انسان کا ذکر اور یاد خداوندی ہوگی۔

**مدار محافظت** مگر سب کچھ جب ہی ہوگا جب زندگی میں ذکر اللہ کی مشق کی ہوگی، اگر زندگی میں غفلت رہی ہوگی، تو موت کے وقت بھی قانوناً غفلت ہی ہوگی۔ ویسے اللہ جانتا ہے کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔۔ مگر حشر میں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو جزو نفس بنالیا تھا۔۔۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میت کو جب قبر میں لٹاتے ہیں اور منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور اس میں روح ڈالی جاتی ہے اسے یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلا ہوا ہے مگر غروب ہونے کے قریب ہے۔

یتمثل له، الشمس، آفتاب کی صورت مثالی سامنے ہوتی ہے' یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پر زردی چھاچکی ہے اور مغرب کا وقت بالکل قریب ہے۔ ملائکہ سوال کرتے ہیں۔

من ربك ---- ؟ تیرا رب کون ہے ؟ تو میت جواب دیتا ہے۔ دعونی اصلی---- میاں' پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو' میرا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز قضاء ہو جائے گی۔-- ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے' اس سے رب کا کیا سوال کرنا ہے جو رب میں اتنا فنا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے اس سے کیا پوچھتے ہو کہ تیرا رب کون ہے---

دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں تو ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جواب سچا دے گا' مگر پوچھنا ہمارا فرض ہے--- تو یہ جواب دینا کہ دعونی اصلی پرے کو ہٹو' مجھے نماز پڑھنے دو--- یہ کون کہے گا۔ جو دنیا میں مشق کر چکا ہو گا کہ میری نماز قضا ہونے نہ پائے یہ ادا ہو۔ اور اگر دنیا میں وقت گزارتے جاتے ہیں۔ وہ ادا چھوڑ قضا چھوڑ' سرے سے پڑھتا ہی نہیں وہ وہاں دعونی اصلی نہیں کہے گا' اس لئے کہ اسے نماز کی عادت ہی نہیں۔ غرض زندگی میں جو عادت ڈالی جائے گی' وہی عالم قبر اور عالم حشر میں قائم رہے گی اور وہی ذریعہ نجات بنے گی۔

### ذکر اللہ کے دو اجزاء

اس واسطے اتباع شریعت' ذکر اللہ' اور یاد خداوندی اس زندگی میں رکھی جائے اور اس کے دو جز ہیں۔ ایک منکرات سے بچنا اور ایک معروفات پر عمل کرنا' ایک امر پر عمل کرنا' ایک نہی پر عمل کرنا' اس میں مقدم یہ ہے کہ منکرات سے بچا جائے جن چیزوں کو شریعت نے گناہ قرار دیا ہے اور جن چیزوں کو کبیرہ اور صغیرہ کہا ہے ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کی جائے' تو یہ مامورات پر عمل کرنے کا ذریعہ بنیں گی' احکام شرعیہ کے اتباع کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ اور جو منکرات سے نہیں بچتا اسے نیکی کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر توفیق ہوتی ہے تو نیکی اپنا اثر نہیں دکھلاتی' اس لئے کہ مضر چیزیں' استعمال میں آ رہی ہیں--- اس مجموعے کو کہ نیکی کو کرنے لگے اور بدی سے بچنے لگے' اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں "تزکیہ" ہے کہ اس نے اپنے نفس کو پاک بنا لیا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔

اس انسان نے جس نے بدی چھوڑ دی' نیکی اختیار کی' اتباع شریعت اختیار کیا اور محرمات' مکروہات اور ممنوعات کو چھوڑ دیا' تو اس نے اپنے نفس کو پاک بنا لیا۔ وہ صلاح و فلاح کی منزل تک پہنچ گیا--- ان آیات کے شروع میں فرمایا گیا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا. فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا

"اس ذات کی قسم جس نے نفس کو صحیح صحیح بنایا' اس میں الہام کیا فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی"۔

نیکی کا بھی جذبہ ڈالا اور بدی کا بھی جذبہ ڈالا تاکہ دونوں کے ٹکراؤ سے انسان ترقی

کرے۔۔۔ یہی چیز میں نے ابتداء میں عرض کی تھی کہ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کے مادے ہیں۔ بدی بچنے کے لئے ہے، نیکی کرنے کے لئے ہے۔ دونوں کو ملا کر انسان میں ترقی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور صلاح وفلاح کی منزل سامنے آجاتی ہے۔ اس لئے اجمالی طور پر اصول عرض کر دیا۔ اور اس اصول کی قدرے تشریح عرض کر دی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کے امتثال کی اور بدیوں سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ آمین۔

دعاء

اللھم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا و ھب لنا من لدنك رحمة. انك انت الوھاب'

اللھم افتح لنا بالخیر. و اختم لنا بالخیر. اللھم نسئلك الخیر کله'

ونعوذبك من الشر کله'.

اللھم و توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین.

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعین

برحمتك یا ارحم الراحمین.

## تنبیہ

ایک مسئلہ سن لیجئے۔

بعض لوگوں کو عادت ہوتی کہ وہ وعظ میں بیٹھتے ہیں مگر کچھ وظیفہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ مکروہ ہے۔ آداب درس اور وعظ کے خلاف ہے۔ وعظ سننا یہ خود مستقل طاعت وعبادت ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز بھی پڑھے اور ساتھ میں دوسروں کو پیسے بھی تقسیم کرے، تو نہ نماز ہوگی نہ پیسے ہی صحیح تقسیم ہوں گے، تو آداب مجلس وعظ کے یہ چیز خلاف ہے۔۔ ہر شخص کا فرض ہے جو مجلس میں بیٹھے وہ استماع کرے اور سننے کی طرف توجہ کرے اور ان چیزوں کو قلب میں اتارنے کی فکر کرے جو کہی جا رہی ہیں۔۔۔ اور اگر وظیفے کا ضروری وقت ہے تو دوسرے مقام پر جا کر اپنا وظیفہ پڑھے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه مُحمّد واله وصحبه اجمعین.

(حررہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ بروز جمعۃ المبارک)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# جواہر انسانیت

انسانیت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے' ایک علم صحیح اور علم نافع' اور عمل صحیح اور عمل صالح اور اخلاص کامل اور ایک فکر سلیم۔
یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کی بجائے جہالت ہو' کہیں گے یہ حیوان ہے' علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے' گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے' مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے کہ نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو' عمل بھی ہو' اخلاص بھی ہو' اور آخرت کا فکر صحیح بھی ہو' کہا جائے گا یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جا سکے۔ اور کہا جا سکے کہ یہ انسان ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا...... اَمَّابَعْدُ........

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ.

(اَوْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

# سیرت نبوی ﷺ کی جامعیت

بزرگان محترم!

یہ جلسہ سیرت کے نام پر منعقد کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ بیان کی جائے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تاکہ سیرت کے مختلف گوشوں سے لوگ آشنا ہو سکیں۔۔۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ در حقیقت ایک ذات یا ایک شخصیت کی سیرت نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم انسانیت اور پورے عالم بشریت کی مقدس سیرت ہے۔۔۔ دنیا میں بہت سی ذوات ایسی گزری ہیں جو ایک ایک جماعت کے قائم مقام ہوتی ہیں یعنی پوری جماعت مل کر جن کمالات کا سبب بنتی ہے۔ بعض دفعہ حق تعالیٰ وہ سارے کمالات کسی ایک شخصیت میں جمع کر دیتے ہیں۔۔۔ بعض شخصیتیں وہ ہیں کہ جماعتوں کی نہیں بلکہ پوری پوری اقوام کے قائم مقام ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اور بعض شخصیتیں پوری ملت اور امت کے قائم مقام ہوتی ہیں۔۔۔ یعنی پوری ایک امت میں جو کمالات علم و عمل کے جمع ہوں، وہ ایک ذات میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِّلّٰهِ حَنِيفاً

ابراہیم علیہ السلام پوری ایک امت ہیں۔۔۔ یعنی ایک عظیم ترین امت میں جو اخلاق و کمالات جمع ہو سکتے ہیں وہ ایک ذات واحد میں اللہ نے جمع کر دیئے۔۔۔ تو آپ اندازہ کیجئے کہ جو ذات بابرکات ملت ابراہیمی کی تکمیل کرنے کے لئے آئے، وہ ذات بابرکات کتنی عظیم ہو گی۔ وہ ایک امت نہیں بلکہ دنیا کی ساری امتوں کی جگہ وہ ایک ذات واحد ہو گی اور جو ساری امتوں اور اقوام میں مل کر کمالات جمع ہیں وہ تنہا ایک ذات واحد میں ہوں گے اور وہ ذات ہے نبی ﷺ کی۔

## سیرت انسانیت

تو آپ کی سیرت در حقیقت مکمل انسانیت کی سیرت ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سیرت مقدسہ کے بیان کرنے سے پہلے انسانیت کی سیرت پر گفتگو کروں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی سیرت کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں؟۔۔۔ اگر وہ سمجھ میں آگئے تو جو ذات بابرکات پورے عالم انسانیت کی عظیم اور ہے۔ اس کی سیرت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ اس لئے میں نے نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث تلاوت کی ہے جس میں خود اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ انسان کے معنی کیا ہیں؟

## مادۂ انسان کے تخلیقی مراحل

اسے آپ اس طرح سمجھیں کہ انسانیت گویا انسان کو جو کچھ فوقیت یا عظمت یا شرف حاصل ہے۔ وہ انسانی مادے کی وجہ

سے حاصل نہیں ہے۔ انسان کی تمام کائنات پر جو کچھ بزرگی، بلند اور برتری ہے وہ اس کے مادے کی وجہ سے سے نہیں ہے۔۔۔ اس لئے کہ انسانی خلقت کے مادے جہاں بھی قرآن کریم نے ذکر کئے ہیں وہ نہایت ہی گندے اور نجس مادے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کو کوئی فوقیت یا فضلیت حاصل ہو۔ یہ نہیں۔

کہیں انسان کے بارے میں فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ

ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔

اور کہیں فرماتے ہیں۔

خَلَقْنٰهُ مِنْ نُطْفَةٍ

ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا

کہیں فرماتے ہیں۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ

"ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا"۔

تو کہیں مٹی، کہیں نطفہ، کہیں سڑا ہوا ہوگارا اور کہیں ذلیل پانی۔ یہ انسان کی پیدائش کے ذلیل مادے ذکر کئے ہیں تو جن میں خود ذلت اور خود گندگی موجود ہے۔ ان مادوں کی وجہ سے انسان کو کیا شرافت اور فضیلت حاصل ہو سکتی تھی۔

ایک موقع پر قرآن عظیم نے ان سب مادوں کو یکجا طور پر جمع کر کے ذکر فرمایا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النطفة عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَئْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.

"ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو نطفے کی شکل دے کر ایک منجمد پھٹک بنا دی۔ پھر اس کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیا۔ پھر اس میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور کھال بھر دی۔ اور پھر اس کی ایک اور خلقت تیار کی"۔

## تخلیق انسان کا پہلا مرحلہ

تو یہاں ترتیب وار چند مادوں کا ذکر کیا گیا۔ مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ مٹی کے اندر کون سی چمک دمک ہوتی ہے۔ مٹی تو وہ ہے جس کو ذلول کہا گیا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا

اس مٹی کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل کر دیا پست بنا دیا۔۔۔ تو بیچاری پامال ہوتی ہے

جوتیوں سے آپ اس کو روندتے ہیں لیکن یہ اف نہیں کر سکتی' تو اس کے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی چمک اور نورانیت نہیں۔ کوئی خوبصورتی نہیں ہے--- یہ گویا انسان کی پیدائش کا ابتدائی مادہ ہے۔

## تخلیق انسان کا دوسرا مرحلہ

اس کے بعد آگے ترقی کر کے فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ

پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر رحم مادر میں ٹھہرایا--- تو یہ اُور زیادہ گندگی کے اندر ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ مٹی ناپاک تو نہیں تھی۔ بہت سے بہت کوڑا کباڑ کی کثافت تھی۔ کپڑے پر لگ جاتی تھی تو دھوتے تھے' بدن پر پڑ جاتی تھی تو آدمی غسل کر کے بدن صاف کر لیتا تھا۔ تو کثافت تھی مگر نجاست نہیں تھی---- بلکہ ایک حد تک مطہر بھی ہے۔ یعنی دوسروں کو پاک کرنے والی بھی ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کی اجازت ہے۔ مٹی' پانی کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ غرض خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو پاک بنا دیتی ہے صرف اتنی بات تھی کہ ایک کرکٹ اور کوڑا تھا جو بدن پر پڑ جائے یا کپڑوں پر تو دھونے کی صورت پیش آتی تھی۔

## تخلیق انسان کا تیسرا مرحلہ

لیکن جب اس کو نطفے کی شکل میں منتقل کیا تو ناپاکی پیدا ہو گئی۔ غلاظت اور کثافت کے ساتھ ساتھ نجاست بھی پیدا ہو گئی--- اور اس درجے کی کہ اگر یہ قطرہ خارج ہو تو قرآن کریم پڑھنے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ مسجد میں جانے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ نماز آپ نہیں پڑھ سکتے۔ اس درجہ گویا گندگی ہے اسی لئے ایک موقع پر فرمایا۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ

"اس انسان کی جرات تو دیکھو کہ ہم نے اس کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا۔ ہمارے ہی مقابلہ پر جھگڑالو دشمن بن کر آتا ہے"۔ گویا اب تک تو مادے میں کثافت تھی اب نجاست بھی پیدا ہو گئی۔

## تخلیق انسان کا چوتھا مرحلہ

اور آگے ارشاد فرمایا۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً

تو نطفے کے اندر کم سے کم آئمہ کا اختلاف تو تھا--- بعض آئمہ اس کو پاک کہتے تھے--- کم سے کم اس کی نجاست متفق علیہ نہ تھی' مختلف فیہ تھی--- لیکن نطفہ جب خون کی شکل میں تبدیل ہوا تو خون کی پاکی کا کوئی بھی قائل نہیں تو متفق علیہ نجاست بن گئی۔ گویا نجاست کے اندر اور زیادہ ترقی ہوئی۔ مٹی کا خلاصہ ناپاک نہیں تھا۔ کثیف تھا۔ نطفہ کثیف بھی تھا اور ناپاک بھی تھا۔ مگر مختلف

فیہ تھا۔ اور خون بنا تو متفق علیہ ناپاکی ہوگئی۔۔۔ اس کے بعد میں لوتھڑا بنا کے ہڈیاں پہنائی گئیں۔۔۔ ان تمام چیزوں کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ کوئی پاکیزگی اور کوئی چمک دمک بھی نہیں۔۔۔ معنوی چمک تو کیا ہوتی' مادی چمک بھی نہیں کہ ظاہری طور پر کوئی شعاع تو نظر آجائے۔ یہ انسان کی پیدائش کے مادے ہیں۔

## تخلیق انسان کا پہلا ظلماتی مکان

اور پھر ان مادوں کے ساتھ انسان کو کہاں پیدا کیا گیا۔ وہ بھی گندی جگہ ہے جس میں تخلیق عمل میں آئی۔ بلکہ گندگی اور ظلماتی جگہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا۔

یَخۡلُقُکُمۡ فِیۡ بُطُوۡنِ اُمَّھٰتِکُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ

اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرتے ہیں تمہاری پیدائش پر مختلف دور آتے ہیں۔۔۔ کہاں پیدا کرتے ہیں؟۔۔ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۔۔۔ تین اندھیری کوٹھڑیوں اور تین ظلمتوں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔

سب سے پہلی ظلمت ماں کا پیٹ ہے جس کے اندر کوئی چاندنا نہیں۔ جس کے اندر کوئی آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی۔ اور اندر سے بھی کوئی شعاع نہیں اٹھتی۔

## تخلیق انسان کا دوسرا ظلماتی مکان

اس ماں کے پیٹ میں پھر جو اندر کوٹھڑی ہے وہ رحم مادر ہے۔ جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اور زیادہ اندھیری۔۔۔۔ ماں کے پیٹ میں ممکن تھا کہ مسامات کے ذریعہ ہی کوئی چیز پہنچ جائے۔ مگر رحم مادر تو پیٹ کے اندر ایک اور بند کوٹھڑی ہے۔ وہاں نہ باہر سے کوئی چیز پہنچے نہ اندر سے باہر آئے۔

## تخلیق انسان کا تیسرا ظلماتی مکان

پھر اس کے اندر ایک اور تیسری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی ہے جس کے اندر بچہ لیٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دلیا اس کو کاٹ کر بچے کو باہر نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ خود اندھیری کوٹھڑی' رحم مادر' اس کے اندر ایک اور اندھیری کوٹھڑی اور اس کے اندر جھلی ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔

## فضیلت یا ندامت

تین ظلمتیں ہیں اور تاریک گھرانے ہیں جس میں انسان کو تربیت دی جاتی ہے اور تخلیق کی جاتی ہے۔ ان تینوں اندھیری کوٹھڑیوں میں سوائے غلاظت کے اور کیا ہے؟ حیض کا خون غذا بنتا ہے۔ گندے پانی میں انسان تیر تا رہتا ہے۔۔۔ تو پیدائش کے مادے بھی نجس' مکان بھی گندا۔ پھر جس راستے سے اندر پہنچتا ہے وہ راستہ بھی گندا' جس راستے سے نکالا جاتا ہے وہ راستہ بھی گندا۔۔۔ تو راستے بھی گندے' مادے بھی گندے' مکان بھی گندا

اور جوہر بھی گندا۔۔۔ ان گندی چیزوں سے ان گندے مکانوں میں بن کر آپ اندازہ کیجئے کہ انسان میں کوئی فضیلت پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان کی فضیلت تو بجائے خود ہے اگر وہ ان مادوں کی طرف دھیان کرے تو ندامت سے اس کا سر نیچا ہو جانا چاہئے۔ یہ غلاظتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے لئے کوئی فخر اور غرور کا موقع باقی نہیں رہتا۔ کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ شیخی کرے یا اترائے۔۔۔ کیا گندگی پر اترایا جاتا ہے؟ کیا نجاست کے اوپر انسان فخر کرے گا۔۔۔؟

## انسان کی خود فریبی

کوئی بزرگ چلے جا رہے تھے' انکے سامنے ایک شخص جو بہت بڑا مالدار تھا۔ اور دنیا کی اصطلاح میں بڑا آدمی تھا۔ وہ چلا آ رہا تھا اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اتراہٹ کی چال چل رہا تھا۔ پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا' چھاتی ابھارے ہوئے' منہ ابھرا ہوا۔ غرض متکبرانہ چال سے چل رہا تھا۔۔۔ ادھر سے کوئی بیچارہ اللہ والا' سادہ زندگی والا درویش انسان آ رہا تھا۔ اس نے خیر خواہی کے طور پر اسے نصیحت کی اور کہا کہ ؎

"اے عزیز! خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چل۔ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحاً۔۔۔۔ اللہ کی زمین پر اینٹھ کر مت چل' اکڑ کر مت چل۔ یہ جو تو اینٹھ کر چل رہا ہے' چھاتی ابھار کر چل رہا ہے۔ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلاً ۔۔۔ تو اینٹھ کر زمین کو نہیں پھاڑ ڈالے گا۔ آسمان کو چیر نہیں ڈالے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا۔ جتنی جگہ میں ہے۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت برداشت کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کا کام نہیں ہے"۔

اس شخص کو بہت ناگوار گزرا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے ٹوکے میں تو سب سے بڑا آدمی ہوں۔ اس نے بہت ہی تنک کر اور بہت ہی غصے سے کہا کہ ؎

او جاہل درویش! تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟
اور میرے سامنے ایسا گستاخانہ کلام؟
تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟

یہ درویش بھی بگڑے ہوئے دل کا آدمی تھا۔۔۔ اگر یہ اپنے مال میں مست تو وہ اپنی کھال میں مست۔

## انسان کا حقیقی تعارف

وہ بھی آگے بڑھا اور اس نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں آپ کو نہیں' اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بتلاؤں آپ کون ہیں۔۔۔ یہ بھی سسک کر کھڑا ہو گیا کہ بھئی! یہ بھی عجیب درویش ہے۔۔۔ آخر آپ کیا بتلائیں گے کہ میں کون ہوں؟

"اس نے کہا میں جانتا ہوں آپ کون ہیں.؟ آپ ذرا سن لیجئے"۔

**اولك نطفة قذرة و اخرك جيفة مذرة و انت بين ذلك تحمل العذرة**

آپ کی ابتداء ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے جو بدن سے نکل آئے تو غسل واجب' کپڑے کو لگ جائے تو دھونا واجب۔ آدمی نہ نماز کا رہتا ہے نہ تلاوت کا۔۔۔ یہ تو آپ کی ابتداء ہے۔ انتہاء آپ کی یہ ہے کہ قبر میں پہنچ کر یہی بدن پانی ہو کر بہے گا۔ کیڑے اس میں پڑیں گے۔ نجاست یہ بنے گا۔ یہ آپ کی انتہاء ہے۔۔۔ اور درمیان میں حالت یہ ہے کہ سیروں گندگی اور نجاست آپ کے پیٹ میں بھری ہوئی ہے پاخانہ بھی ہے' پیشاب بھی ہے' اور خون بھی ہے یعنی دم مسفوح بھی ہے۔

تو ابتداء گندی' انتہاء گندی اور درمیانی حالت میں گند در گند۔۔ یہ ہے آپ کی حقیقت۔۔۔ اب فرمایئے آپ اپنی حقیقت سمجھ گئے کہ آپ کون ہیں؟

اس کی آنکھ کھلی۔ چونکہ کہنے والا حقانی آدمی تھا۔ دل سے ایک بات کہی تھی تو ع

از دل خیزد بر دل ریزد

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں' طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

دل پر اثر کیا اور اس شخص نے کہا کہ ۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی
مرا باجان جاں ہمراز کردی

خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میری آنکھ کھول دی' میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حقیقت ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے مادے کے لحاظ سے اتنا گندہ اور نجس واقع ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے مادوں پر دھیان کرے تو اس کے لئے منہ اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ آنکھ اونچی کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے آنکھ نیچی رکھے گا۔

**ستار العیوب کا احسان**

یہ تو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہماری گندگیوں کو چھپادیا ہے اور نہایت خوبصورت کھال کا پردہ ڈال دیا ہے جس سے یہ چیزیں چھپادی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کھل جائیں تو انسان' انسان کو دیکھ کر نفرت کھانے لگے۔۔۔ اسی گندگی کے اگر خدانخواستہ معدے سے بخارات اٹھنے لگیں اور منہ میں بدبو پیدا ہو جائے تو انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پاس کھڑے ہوتے ہوئے نفرت آتی ہے۔۔۔ وہ معدے کے بخارات ہوتے ہیں جو گندہ دہنی کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو جب وہ اجاگر ہوتے ہیں تو آدمی سے آدمی گھبرانے لگتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے گندگیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔۔۔ انسان کو موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں پر فخر کرے۔ یا شیخی بگھارے یا اتراہٹ کی چال چلے۔ گویا بتلادیا گیا کہ

انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے گندہ واقع ہوا ہے۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس میں کوئی کمال ڈال دے۔ مگر انسان کی ذات کا کوئی کمال نہیں۔ ذات تو انسان کی وہ ہے جو ہم نے پیش کی دی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ ان مادوں کے ہوتے ہوئے نہ انسانی سیرت بن سکتی ہے نہ انسان کو کوئی فوقیت اور فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ان مادوں کے لحاظ سے انسان کے اندر کوئی بھی خوبی نہیں۔

### ظاہری خوشنمائی کی حقیقت

اب آپ یوں کہیں گے۔ یہ تو چھپی ہوئی چیزیں ہیں لیکن ان کے اوپر شکل تو خوشنما پڑی ہوئی ہے۔ کسی جاندار کو وہ خوبصورتی عنایت نہیں کی گئی جو انسان کو کی گئی ہے۔ تو انسان اپنی صورت زیبا کے اعتبار سے افضل اور اونچا ہے اور جتنا بھی وہ دعوی کرے کم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صورت درحقیقت ایک عارضی چیز ہے جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا کہ تین دن آجاتا ہے تو ساری شکل بگڑ جاتی ہے۔ سارا حلیہ خراب ہو جاتا ہے، نہ رنگ باقی رہتا ہے، نہ روغن باقی رہتا ہے۔۔۔ اگر انسان کی شرافت کے یہ معنی ہیں کہ وہ خوشنما ہے تو تین دن بخار آنے کے بعد شرافت چھن جاتی ہے وہ رذیل بن جاتا ہے۔ تو یہ شرافت کیسی ہوئی کہ تین دن پہلے شریف اور تین دن بعد رذیل۔۔۔ پہلے اشرف المخلوقات اور اڑھائی دن گذرنے کے بعد ارذل المخلوقات۔ یہ شرافت کس کام کی ہے؟ یہ صورت کی زیبائی اور رعنائی۔ یہ ایک عارضی چیز ہے۔ بخار آجائے تو ختم ہو جائے، انسان کو کوئی غم لگ جائے تو تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ کوئی فکر پیدا ہو جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ تو جس چیز کو آنے والی کیفیت زائل کر دے۔ وہ شرافت کی بناء نہیں ہو سکتی۔۔۔ شرافت تو وہ ہے کہ جوہر میں پڑی ہوئی ہو تو جوہر گندہ ہے۔ تو شرافت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

اور اگر فرض کیجئے کہ کوئی بیماری بھی نہ ہو تو بڑھاپا تو کہیں نہیں گیا؟ بڑھاپا آتا ہے تو وہی صورت جو زیبا تھا، وہ بھیانک نظر آنے لگتی ہے۔ چہرہ شو مو ہو جاتا ہے۔ صورت اور ہیئت بگڑ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے اور مان لیجئے بڑھاپا بھی نہ آئے موت تو ہر صورت میں آئے گی؟ وہ بالکل ہی صورت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

### عقل کی گمراہی

یہ عقل کی گمراہی ہے کہ وہ اس صورت پر فخر کرنے لگے جو رات دن تغیر کے اندر رہے۔

ہم رات دن اس صورت کو سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کنگھی اور چوٹی۔ یہ اور وہ۔ اسے

آپ کہاں تک سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے جس چیز کو ہر چیز بگاڑ دے آپ اسے کہاں تک سنواریں گے؟ بیماری اسے بگاڑ دے' بڑھاپا اسے بگاڑ دے' فکر اور غم اسے گھلا دے' موت اس کا حلیہ بگاڑ دے' تو آپ ناحق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بگڑنے کے لئے بنی ہے۔ اسے سنوارنا کوئی دانائی کا کام نہیں ہے۔ اگر آدمی سنوارنے کی کوشش کرے تو اپنی سیرت کو سنوارنے کی کوشش کرے نہ کہ صورت کو۔ پائیدار چیز انسان کی سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو آپ کتنا ہی سجائیں گے' کتنا ہی زیبا بنائیں گے' کتنا ہی آپ آراستہ کریں گے بالآخر وہ ختم ہو گی۔ اس کی زیبائش بھی ختم ہو گی۔ اگر پائیدار چیز ہے تو وہ انسان کی سیرت ہے۔

## نجاست کا عشق

کسی بزرگ کا واقعہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ انکی خانقاہ میں لوگ اپنی تربیت کے لئے اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے' شیخ لوگوں کی تربیت کرتے تھے۔۔۔ اور شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ بیس بیس اور پچاس پچاس مرید اور متوسلین جمع ہو گئے' کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا' ایک باندی اس کام کے لئے متعین تھی' وہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی' ایک نئے مرید آکر بیعت ہوئے' مقصد تو یہ تھا کہ اللہ اللہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ باندی جب کھانا لے کر آئی تو وہ اتفاق سے کچھ ذرا قبول صورت تھی۔ ان مرید صاحب کی اس سے آنکھ لڑ گئی' اس پر کچھ فریفتہ ہو گئے۔ اب جب وہ کھانا لے کر آتی ہے تو بیٹھ کر اسے گھورتے ہیں۔ نہیں آتی تو منتظر رہتے کہ کب آئے گی۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آئی تو اسے گھورنا شروع کیا۔۔۔ شیخ کو اس حالت کی اطلاع ہو گئی۔۔۔ تو اہل اللہ علاج کرتے ہیں' وہ زبان سے نہیں ہوتا' طریق عمل سے علاج ہوتا ہے کہ مرض کا استیصال ہو جائے۔ شیخ نے چاہا کہ ان کا یہ مرض دور ہو۔ اگر زبانی نصیحت کر دیتے فہمائش کر دیتے' بے شک تھوڑا بہت اثر ہوتا مگر جب طبیعت مائل تھی تو طبیعت کا بدلنا مشکل تھا' شیخ نے ارادہ کیا کہ طبیعت ہی کو بدل دیا جائے تا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو۔

تو ایک عجیب و غریب ترکیب استعمال کی۔ اس باندی کو جو کھانا لے کر آتی تھی۔ اسے دستوں کی دوا کھلا دی' صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آ گئے' ایک جگہ متعین کر دی کہ اسی جگہ جانا' وہاں قدمچہ رکھ دیا۔۔۔ غرض شام تک اسے بہت دست آ گئے۔ اور شام کو حالت یہ ہوئی کہ نہ وہ رنگ باقی رہا نہ وہ روغن باقی رہا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس باندی کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ عجیب بھیانک شکل بن گئی۔۔۔ اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے کر جا۔ اور جو کچھ وہ کہے اس کی مجھے آکر اطلاع کرنا۔

وہ کھانا لے کر بے چاری پہنچی' ناک پکڑو تو دم نکلے' قدم اس کا لرز رہا ہے۔ ضعف کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جاتا اور صورت بھی بھیانک ہو گئی۔۔۔ تو مرید صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے رہا

کرتے تھے۔اب جو آئی اور انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو انہیں بڑی نفرت سی پیدا ہوئی اور بجائے اس کے اسے گھورتے، منہ پھیر کر کہا کہ کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے۔۔۔۔وہ بے چاری کھانا رکھ کر چلی گئی۔۔۔اور شیخ کو جا کر اطلاع کر دی کہ آج اس نے مجھے بجائے گھورنے کے نفرت سے کہا کہ چلی جا یہاں سے دور ہو جا۔ میں چلی آئی۔

شیخ نے کہا۔ الحمد للہ علاج ہو گیا۔

مگر ابھی علاج کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ایک جز تھوڑا سا باقی تھا۔

شیخ مرید کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔

وہ قدمچہ جہاں باندی نے بڑی تعداد میں دستوں کا ملبہ جمع کیا تھا۔ مرید کو وہاں لے کر پہنچے اور فرمایا۔

”یہ آپ کا معشوق ہے۔ یہ جو نجاست ہے۔ اسے احتیاط سے لے جا کر اپنے حجرے میں صندوق میں رکھئے، اس لئے کہ جب تک یہ باندی کے اندر تھا، آپ کو محبت تھی۔ جب یہ نکل گیا۔ آپ کو نفرت پیدا ہو گئی۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے آپ کو محبت تھی۔ اس لئے اسے اٹھا کر لے جایئے۔ یہ آپ کا محبوب ہے۔“

حقیقت میں شیخ نے بتلایا کہ صورتوں کا عشق در حقیقت گندگی کا عشق ہے۔

### عشق سیرت

اصل عشق، سیرت کا عشق ہے جو پائیدار عشق ہے وہ وہی ہے جس سے محبت کرنی سکھلائی گئی ہے۔

آج ہمیں اور آپ کو امام ابو حنیفہ سے محبت ہے، امام شافعی سے، امام احمد بن حنبل سے، امام بخاری اور امام ترمذی سے، حضرت جنید اور حضرت شبلی سے اور تمام اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت کو جزو ایمان جانتے ہیں، ان سے محبت کرنے کو اپنے نجات سمجھتے ہیں۔ کیا یہ محبت ان کی صورتوں سے ہے؟ ہم نے تو آج تک ان کی صورت دیکھی بھی نہیں۔ یہ کاہے سے محبت ہے۔۔۔ان کی سیرت اور ان کے کمالات سے محبت ہے۔ اور اتنی پائیدار محبت ہے کہ نہ آج تک ہم نے ان کی شکل دیکھی۔ مگر دل میں قائم ہے۔۔ اور اتنی شدید محبت کہ اگر ان بزرگوں کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کرے تو ہم اس کا منہ توڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ برداشت نہیں کرتے۔

یہ ان کی سیرت کی محبت ہے، ان کی صورت کی محبت نہیں ہے۔

### سیرت کی سرداری

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ، عطاء ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی جو جلیل القدر تابعی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ؎

مارایت افضل من عطاء بن ابی رباح

”میں نے عطاء بن ابی رباح سے زیادہ عالم اور افضل شخصیت نہیں دیکھی“۔

یعنی عطاء بن ابی رباحؒ اپنے دور میں بڑی زبردست شخصیت، بڑی علم والی شخصیت ہیں۔۔۔

امام ابو حنیفہؒ کی شہادت کی وجہ سے سب سے زیادہ افضل ہیں۔

اور خود عطاء بن ابی رباحؒ کیسے ہیں؟

ایک حبشی غلام ہیں۔ کالی صورت ہے۔ موٹے موٹے ہونٹ ہیں، کرنجی آنکھیں ہیں۔ کوئی زیبا صورت نہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ افضل دنیا میں نہیں دیکھا۔ یہ افضیلت صورت کے لحاظ سے نہیں تھی، سیرت کے لحاظ سے تھی، امام ابو حنیفہؒ ان کی صورت کو نہیں سراہ رہے تھے ان کی سیرت کو پیش کر رہے تھے، آج اگر حضرت بلال حبشیؓ کا نام آجائے تو رضی اللہ عنہ کہہ کر آپ عقیدت اور نیازمندی سے گردن جھکا دیتے ہیں، حالانکہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی صورت کالے رنگ کی تھی، موٹے موٹے ہونٹ تھے جیسے حبشیوں کی صورت ہوتی ہے۔ مگر صورت حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ؎

**یا سیدنا و مولانا**

بلال ہمارے سردار اور ہمارے آقا ہیں۔

یہ کاہے کی آقائی اور سرداری تھی۔ یہ صورت کی سرداری نہیں تھی بلکہ سیرت کی سرداری تھی۔

## صورت سبب فتنہ اور سیرت ذریعہ نجات ہے

اگر غور کیا جائے تو فتنوں میں مبتلا کرنے والی چیز انسان کی صورت ہے۔ سیرت فتنے میں مبتلا نہیں کرتی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت اور ان کے حسن و جمال میں آپ کو کلام تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی ہے۔ اسی طرح حدیث نبویؐ نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی۔ فرمایا گیا کہ ؎

"جب اللہ نے حسن پیدا کیا۔ آدھا حسن دنیا کو تقسیم کیا، آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو عطاء کیا"۔

اتنی زبردست حسین و جمیل شخصیت کہ قرآن و حدیث نے شہادت دی لیکن جہاں بھی فتنوں میں مبتلا ہوئے صورت نے مبتلا کیا۔ کنعان کے کنویں میں گرائے گئے تو صورت نے مبتلا کیا۔ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بیچے گئے تو صورت نے مبتلا کیا، اور مصر کے جیل خانے میں رہے تو صورت کی وجہ سے قید رہے تو صورت زیبا نے ہر جگہ آفات میں مبتلا کیا۔

لیکن مصر کی حکومت لینے کا وقت آیا، مصر کے بادشاہ بنے اور سلطنت مانگی تو فرماتے ہیں ؎

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ

مجھے یہ خزانے سپرد کر دو۔ میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ کیوں؟

دلیل میں یہ نہیں کہا کہ انی حسین جمیل اس واسطے کہ میں بڑا خوبصورت ہوں ملک کا

انتظام کروں گا۔ یہ فرمایا کہ انی حفیظ علیم میرے اندر ملک کی نگہداشت کا مادہ موجود ہے' میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو حسن صورت نے کام نہیں دیا' حسن سیرت سامنے آیا اور جب فتنے میں مبتلا ہوئے تو حسن صورت سامنے آیا' حسن سیرت سامنے نہیں آیا۔

## معیار شرافت

آدمی اگر مبتلا ہوتا ہے تو صورت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سیرت کی وجہ سے کوئی مبتلا نہیں ہوتا سیرت تو عظمت والی چیز ہوتی ہے۔۔۔ بہر حال انسان کے لئے وجہ شرافت نہ اس کا مادہ بن سکتا ہے نہ اس کی صورت بن سکتی ہے۔ اور بھلا لباس تو کیا ہی بنتا؟ لباس صورت بھی زائد چیز ہے۔ جب انسان کے جوہر میں کوئی کمال نہیں۔ انسان کی صورت میں کوئی خاص کمال شرافت کا نہیں ہے اور ہے تو وہ زائل ہونے والی چیز ہے تو لباس تو اس سے بھی عارضی چیز ہے۔۔۔ اگر کوئی لباس پر فخر کرنے لگے اور اپنی شرافت اس سے بیان کرے اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ اس لئے کہ لباس تو وہ خود ہی رات کو اتار کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کو شریف اور رات کو رذیل۔ یہ شرافت کس قسم کی ہوئی کہ اسے اپنے ہاتھ سے آدمی کھودے؟

جو لوگ اپنی شرافت کو لباس سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ در حقیقت سمجھتے ہی نہیں کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔۔۔ غرض انسانی شرافت کا تعلق لباس سے نہیں ہے۔

## معیار کمال

سقراط کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا یونانی حکیم بھی ہے' اور مجرب بھی ہے۔۔۔ فن طب کا موجد اور بڑا امام سمجھا جاتا ہے' اس نے بڑے بڑے تجربات کئے ہیں رات دن جنگلوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتے ہوئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اس طرح سے اس نے جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کتابوں کے اندر مدون اور مرتب کیں۔۔۔ ایک دن جڑی بوٹیوں کے امتحان میں جنگلوں اور پہاڑوں میں تمام دن لگ گیا اور شام کے وقت شہر میں آیا' تھک کے چور ہو گیا تھا۔۔۔ ایک سڑک کے قریب کسی بنچ پر بیٹھا تو نیند نے غلبہ کیا' نیند آگئی۔ پیر اس کے سڑک پر لٹک گئے' اتفاق سے بادشاہ وقت کی سواری نکلی نقیب اور چوبداری ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے ہوئے آرہے تھے' مگر یہ سقراط بے چارہ کب کا تھکا ہوا تھا' نہ اس کے کان میں ہٹو بچو کی آواز آئی' نہ کسی نقیب کی آواز نے اس کے کانوں کو کھٹکھٹایا پڑا ہوا سوتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آگئی۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ میں سواری پر سوار جا رہا ہوں اور اس کی ٹانگیں سڑک کے اوپر پڑی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آکر سواری سے اتر کر اسے لات سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ۔

"او احمق۔۔۔۔ !اٹھتا نہیں ہے؟"

وہ بے چارہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بادشاہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا۔۔۔ "احمق!

تو جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟"

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں اسی پر تو غور کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور اب تک میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔

اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ وہ زمین پر پیر مارتے ہوئے دھول اڑاتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چونکہ ٹھوکر ماری تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید جنگل کا کوئی درندہ آ گیا ہے۔۔۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور کہا کہ

"جاہل! احمق! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہ وقت ہوں اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ قباء شاہی میرے ہاتھ میں' تاج شاہ میرے سر پر ہے' اتنے خزانوں کا مالک ہوں"۔

اور اس نے اپنی نعمتیں شمار کروائیں۔

سقراط نے کہا کہ ۔

اوا حمق! تو نے جتنی چیزوں اپنی بڑائی اور بزرگی میں پیش کیں قلعوہوں کو پیش کیا' دولت کو پیش کیا' تاج کو پیش کیا' قباء شاہی کو پیش کیا۔۔۔ یہ ساری چیزیں تو تجھ سے باہر باہر کی ہیں۔۔۔ تیرے اندر کون سا کمال ہے جس پر تو فخر کرے۔ یہ باہر کی چیزیں ہیں۔ تاج اگر اچھا ہے تو اپنی ذات سے اچھا ہے۔ تجھے اس سے کیا شرف ملا اور قبا اگر خوشنما لگ رہی ہے تو یہ کپڑے کی خوبی ہے۔ تیری ذات کی اس میں کیا خوبی ہے۔ تو نے اپنی ذات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے باہر کی چیزیں پیش کیں۔ جن کا تیری ذات میں کوئی دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیری شرافت باہر باہر کی ہے۔ تیری ذات کے اندر کچھ نہیں۔"

وہ جو مثل مشہور ہے' اور نحوی لکھا کرتے ہیں کہ سیبویہ اپنے زمانے طالب علمی میں جب پڑھتا تو اس نے بہت سی یادداشتیں مرتب کر رکھیں تھی' استاد سے سنی ہوئی تقریریں اور اپنے مطالعے کی یادداشتیں اور کچھ سوالات وغیرہ۔۔۔ غرض بہت سے کاغذات کا ایک پلندا لکھ رکھا تھا جسے یاد کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے وہ پلندہ لپیٹ کر دستر خوان میں باندھ لیا۔ اس میں ایک آدھ روٹی بھی تھی۔۔۔ اتفاق سے کتا آیا اور وہ سارا دستر خوان بندھا ہوا لے کر چلتا بنا۔۔ یہ سیبویہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ اور کتا بھی کم بخت کچھ ایسا سرکش تھا کہ وہ آگے ہی کو چلا جا رہا ہے پیچھے کو دیکھتا ہی نہیں۔۔۔ اور یہ اس کے پیچھے۔

لوگوں نے کہا کہ بڑا احمق ہے کہ روٹی دو روٹی ہو گی۔ کتا لے گیا تو لے جانے دے۔ اب لاٹھی لے کر پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی طاقت خرچ کر رہا ہے تو روٹی کھانے سے اتنی طاقت آئے گی نہیں

جتنی پیچھے بھاگنے میں خرچ کر ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ بے وقوف واقع ہوا ہے۔

سیبویہ نے کہا۔

”بے وقوف تو تم ہو۔ میں روٹی کی وجہ سے نہیں دوڑ رہا۔ بلکہ دستر خوان میں میرا سارا علم تھا جو کتا لے بھاگا۔ میں جاہل کا جاہل رہ گیا“۔

”احمق! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا ساتھ لے جائے“۔

تو حقیقت میں بادشاہ نے اپنی فضیلت تاج اور قبا میں بیان کی۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ اگر کوئی دشمن یا غنیم آئے، تاج چھین لے، قلعے چھین لے، تو بادشاہ کی شرافت ختم ہو گئی، شرافت تو وہ ہے کہ آدمی زمین کے اوپر رہے جب بھی باکمال ہو اور اگر زمین کی تہہ میں اتار دو جب بھی باکمال ہو۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ ادھر جاؤ تو باکمال اور ادھر کا رخ کر لو تو بے کمال۔ یہ کمال نہیں کہلاتا۔ کمال اپنی ذات کے اندر ہونا چاہئے۔ اپنے اندر جوہر ہونا چاہئے۔ یہ فی الحقیقت کمال ہے۔

## مرکز محنت

مولانا رومی قدس اللہ سرہ نے ایک تمثیلی حکایت نقل کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واقعہ بھی ہو۔ تمثیل نہ ہو۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم جھگڑا ہوا۔ دونوں آپس میں لڑے، چینیوں نے کہا ہم زیادہ باکمال ہیں زیادہ صناع ہیں، زیادہ دستکار ہیں۔۔۔ رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ صناع ہیں۔ ہم زیادہ دست کار ہیں۔۔۔ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ دونوں میں جھگڑا ہوا دعوے دونوں طرف سے تھے یہاں تک قریب تھا کہ جنگ ہو جائے۔۔۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! باہم لڑتے کیوں ہو؟ کسی کو ثالث اور حکم بنالو، تو مقدمہ بادشاہ وقت کے پاس گیا کہ دو قومیں لڑ رہی ہیں۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔ ایک قوم کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔۔۔ دوسری کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔۔۔ چینیوں نے کہا کہ حکمت ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ اور رومیوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ بادشاہ نے کہا، دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ دونوں اپنی اپنی صنعت کے نمونے دکھلائیں۔ اسے دیکھ کر ہم فیصلہ کریں گے کہ کون زیادہ باکمال ہے۔ اور تجویز یہ دی کہ ایک ہال بنایا گیا اور اس میں پارٹیشن کر دیا گیا۔ تقسیم کر کے ایک پردے کی دیوار کر دی گئی اور دونوں قوموں سے کہا گیا کہ آدھے مکان میں تم اپنی صناعت دکھاؤ۔ آدھے مکان میں تم دستکاری دکھلاؤ۔ بیچ میں سے پردہ ہٹا کر پھر ہم موازنہ کریں گے کہ کس کی صناعی اور دستکاری بڑھی ہوئی ہے۔

چنانچہ دونوں قوموں نے اپنی کاریگری کا کام شروع کیا تو چینیوں نے دیوار پر پلاستر کر کے دیوار پر نقش و نگار بنانے شروع کئے اور رنگ برنگ کے پھول اور بوٹے بنائے۔ تو دیوار کو باغ و بہار بنا دیا۔ کوئی بوٹا نہیں چھوڑا جو اس میں بنایا نہ گیا ہو۔ کوئی پھول اور پتی نہیں چھوڑی جو اس میں نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی رنگ نہیں چھوڑا جو دیوار میں لگایا نہ ہو۔ تو پوری دیوار کو گلزار بنا دیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دیوار

میں اثر کرنا چاہتی ہے۔ مگر آدمی کی نگاہ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہٹ سکتی۔ یہ کاریگری تو چینیوں نے دکھلائی۔

اور رومیوں نے کیا کاریگری دکھلائی؟

انہوں نے آدھے کمرے میں پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا' اور مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکدار بنا دیا کہ دیواریں آئینہ بن گئیں کہ اس میں صورت نظر آنے لگی۔۔۔ بالکل چمکا کر آئینہ کر دیا۔ نہ ایک نقش بنایا' نہ ایک بوٹا بنایا نہ ایک پھول بلکہ صیقل کر کے آئینہ کر دیا۔ جو سامنے کھڑا ہوتا۔ اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

جب دونوں اپنی کاریگری سے فارغ ہو گئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی' بادشاہ نے حکم دیا کہ پردے کی دیوار ہٹا دی جائے تاکہ موازنہ کریں۔۔۔ پردہ کی دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے نقش و نگار بنائے تھے دوسری طرف نظر آنے لگے' اس لئے کہ دیواریں تو آئینہ ہو گئی تھیں۔ وہ سارے پھول ادھر نظر آ رہے ہیں۔۔۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو بیل بوٹا ادھر ہے وہی ادھر ہے۔ جو رنگ ادھر ہے وہی ادھر ہے۔ جو نقش و نگار ادھر ہیں وہی ادھر ہیں اب وہ حیران ہے کہ فیصلہ کس کے موافق دوں اور کس کے خلاف دوں؟

آخر رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ رومی اپنی صنعت میں بڑھ گئے کیوں کہ انہوں نے اپنی صعنت تو دکھلائی تھی' دوسروں کی صنعت بھی چھین لی۔ یہاں بیل بوٹے ہیں اور چمک کے ساتھ ہیں۔ وہاں فقط نقش و نگار ہیں۔ چمک دمک کچھ نہیں۔ تو اپنی صنعت دکھلائی اور دوسروں کی صنعت چھین لی۔ گویا رومیوں نے ڈبل صنعت دکھلائی اس لئے رومی بڑھ گئے۔

یہ حکایت نقل کر کے مولانا رومی قدس اللہ سرہ لکھتے ہیں کہ ؎

"اے عزیز! تو اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت مت کر کہ دنیا بھر کے پھولوں اور بوٹوں کو دیکھتا پھرے۔ رومیوں کی صنعت کر کہ اپنے دل کو مانجھ کر آئینہ بنا لے کہ ساری دنیا کی صنعتیں تجھے گھر بیٹھے نظر آنے لگیں' تو دنیا کے اندر نقش و نگار اور پھول پتیوں کو ٹٹولتا ہوا کہاں مصیبت کے اندر پھر رہا ہے۔۔۔؟ تیرے اندر تو وہ کائنات موجود ہے کہ ساری دنیا کے پھول اور پتیاں تیرے اندر موجود ہیں۔ تو دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت کی طرح دل کو صیقل بنا لے۔ دنیا تو تجھے وہیں بیٹھے ہوئے نظر آنے لگے گی ؎

ستم است اگر ہوسہت کشد کہ بسیر سرو وچمن در آ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ی در دل بکشا بچمن در آ

تیرے پاس تو دل موجود ہے۔ اس میں اگر تو ایک دروازہ نیچے کا کھولے گا تو ساری دنیا اس

میں سے تجھے نظر آئے گی اور اگر اوپر کا کھول دے تو عالم غیب تجھے نظر آئے گا۔ دنیا کے مشاہدات قلب میں آئیں گئے اور اوپر کے علوم قلب کے اندر آئیں گے۔ تو قلب عجیب کیمیا ہے کہ اس میں دو دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک عالم غیب کی طرف اور ایک عالم شاھد کی طرف۔۔۔ محسوسات کی صورتیں بھی قلب میں ہیں۔ مغیبات کے علوم بھی قلب کے اندر ہیں۔ تو جس انسان کو یہ چیز دی جائے وہ ان پھول پتیوں میں مبتلا ہو کے رہ جائے؟ اسے تو یہ چاہئے کہ ان دریچوں کھول دے تاکہ اسے ساری صورتیں نظر آئیں۔ نہ صرف یہاں کی بلکہ عالم غیب کی چیزیں بھی اس پر منکشف ہوں اور نظر آنے لگیں۔

**مدار علوم**

حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ بیمار ہوئے اور کمر میں پھوڑا نکلا اور اتنا شدید کہ بتیس برس تک وہ پھوڑا رہا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی کھا رہے ہیں تو چت لیٹ کر اور استنجاء بھی کر رہے ہیں تو چت لیٹ کر۔ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اشاروں سے چت لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ نہ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ نہ کروٹ بدل سکتے ہیں اور بتیس برس کامل اس حالت میں گزرے ہیں۔ اندازہ کیجئے کتنی عظیم اذیت ہوگی؟

مگر اس تکلیف کے باوجود چہرہ دیکھا جاتا تھا تو نہایت بشاس کہ تندرستوں کے چہروں پر رونق نہ ہو۔ جو حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ کے چہرے مبارک پر تھی۔ نہایت ہشاس بشاش اور کھلا ہوا چہرہ۔

لوگوں نے عرض کیا کہ

”حضرت! بیماری تو اتنی شدید کہ اذیت کی کوئی انتہا نہیں بیٹھ سکتے' اٹھ نہیں سکتے۔ اور آپ کی بشاشت کی کیفیت یہ کہ کسی تندرست کا چہرہ بھی اتنا شاداب نہیں ہو سکتا جتنا آپ کا ہے؟“

فرمایا' ہاں!

”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے یہ تکلیف دی تو میں نے بجائے جزع فزع کرنے کے اور بجائے اللہ کا شکوہ کرنے کے صبر اور تحمل سے کام لیا اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے جس حالت میں تو رکھے میں اس حالت پر راضی ہوں۔۔۔ تو میں نے اس تکلیف پر رضا اور تسلیم کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور صبر سے کام لیا۔ نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کیا۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بتیس برس سے روزانہ اس بستر کے اوپر ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں۔ عالم غیب میرے اوپر منکشف ہے۔ رجال غیب میرے سامنے آتے ہیں۔ ملائکہ کی

آمدورفت میرے سامنے ہے۔ اگرچہ میں نے ارادے سے مجاہدہ نہیں کیا یہ تقدیر کو قبول کر کے صبر کیا۔ اس مجاہدے کی برکت سے اللہ نے میرے قلب کے درواز کول دیئے، مجھ پر عالم غیب منکشف ہوا اور میں ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں"۔

جس انسان کو یہ کائنات دی جائے، اگر وہ ارادی مجاہدے کرے۔ سبحان اللہ! اور اگر اضطراری مجاہدہ ہو تو اس پر صبر اور تسلیم اختیار کرے۔ تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ تو جس کے اندر ایسی آنکھ دی گئی ہے کہ دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے وہ آخرت کی چیزیں دیکھے اس کے لئے تو مصیبت ہے کہ وہ پھول پتیوں میں الجھا ہوا پھرے۔ یہ ساری پھول پتیاں اس کے اندر موجود ہیں۔

## معیت اہل حق سے انکشاف حقائق

نیز اہل اللہ اور کاملین جب اپنے کمالات، اپنے مجاہدات اور ریاضت سے اونچے مقامات پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلب کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔۔۔ اور وہ تو وہ۔۔۔ جو ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں ان کے لئے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ فائز المرام بن جاتے ہیں۔

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں۔ جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا۔۔۔ تو مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں۔۔۔ فرمایا کہ

"جب میں دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دارالعلوم کی بالکل ابتداء تھی۔ ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا۔۔۔ فرماتے تھے کہ۔۔۔ طلباء میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا اس سے ان کی آنکھ لڑ گئی۔ اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا۔۔۔ مگر چونکہ پاک دامن اور عفیف تھے۔ اس لئے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختنی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی۔ ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی۔ اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا"۔

فرماتے تھے کہ اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے سبحان ربی الاعلیٰ کے اس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا اس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔۔۔ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری دنیا گئی تھی تو گئی تھی۔۔۔ اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے

نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔ حضرت کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے تھے۔

جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا۔ اب میری دستگیری فرمایئے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا۔۔۔ یہ اصل میں پٹھان تھے۔

اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو۔ اتنے ہی میں تم گھبرا گئے۔۔۔ اور یہ دھاڑیں مار کر رو پڑے اور کہا حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرا تو دین بھی چلا اور میری دنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لئے میرا علاج کریں۔

حضرت نے فرمایا۔ کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بولنا مت۔ میرے پاس آکر بیٹھ جانا۔۔۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔۔۔ حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں جو دارالعلوم سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے۔ جو اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے سے دارالعلوم دیوبند شروع ہوا۔ ایک استاد اور ایک شاگرد سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوئی ہے۔ استاذ کا نام ملاں محمود تھا اور شاگرد کا نام شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھا۔ تو چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتے کی مسجد میں ان تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اول ہوئے ہیں۔ اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں۔ یہ چشتی تھے۔۔۔ اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت کا غلبہ ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔ گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں۔ جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو اس میں بیعت و تلقین کی جاتی ہے۔۔۔ تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے۔

غرض، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابرین میں سے ہیں۔

تو مولانا منصور علی خان کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مگر بولنا کچھ نہیں۔ چنانچہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد میں نکلے یہ ساتھ ہو لئے۔۔۔ اور مولانا منصور علی خان مجھ سے کہتے تھے، میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیئت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں

ہوا جاتا تھا۔

حضرت حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے فرماتے تھے جب حضرت جا کر بیٹھ گئے --- اور میں سامنے مودب بیٹھ گیا --- میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا --- فرماتے تھے میں نے اپنا داہنا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں دیا تو حضرت نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا جیسے کوئی رسی یا بان بٹا کرتا ہے۔

مولانا منصور علی خان مجھ سے فرماتے تھے ۔

میں تم سے حلف شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جتنک حضرت میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت مجھے نظر آ رہی تھی۔ چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالم غیب مجھ پر منکشف تھا --- یہ میری کیفیت تھی --- اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اٹھ جاؤ یہاں سے

فرماتے تھے میں باہر آیا باہر آ کر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی۔

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔

فرماتے تھے کہ جب دار العلوم کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر آیا اسے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت جو قلب میں گھسی ہوئی تھی وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ وہ قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسولؐ اور رسولؐ کے صحابیؓ تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔ بہت بالاتر ہیں۔ ان کے غلاموں اور خدام کو یہ کیفیت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں --- اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطاء کی ہے اگر انسان دل کو سنوار لے تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

### مرکز تجلیات ربانی

اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ قلب فی الحقیقت "عرش الرحمٰن" ہے۔ دنیا کے اندر عرش عظیم کی کوئی تمثال موجود ہے' اور عرش کا کوئی نمونہ موجود ہے تو وہ انسان کا قلب ہے۔ جس میں تجلیات ربانی اترتی ہیں۔ انسان کے ہاتھ پر تجلیات نہیں

اترتیں انسان کے دماغ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ تجلیات ربانی کا اگر مرکز ہے تو وہ قلب ہے۔ اس لئے کہ "عرش الرحمٰن" ہے تو کائنات آفاق میں عرش عظیم وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مستوی ہے۔ جس کو فرمایا گیا ۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

اور کائنات النفس میں عرش عظیم انسان کا قلب ہے جس پر رحمٰن کی تجلیات آتی ہیں۔ تو جس انسان کو قلب جیسی دولت دی جائے جس کے اندر غائب وشاہد کے سارے نقش ونگار ہوں اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دنیا کے نقش ونگار میں گھومتا پھرے کہ ۔

تو طفلی وخانہ رنگین است

اس کو ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا تو کام یہ ہے کہ رومیوں کی صنعت انجام دے۔ اور اپنے دل کو صیقل کرے۔ ساری چیزیں خود بخود نظر آئیں گی۔

## سیرت انسانی کا جوہر اول

اور پھر جب اس میں چیزیں منکشف ہو جائیں گی، اور علم و معرفت کا کمال پیدا ہو جائے گا تو کہا جائے گا کہ اب اس میں انسانیت آئی ہے۔ اب اس کے لئے شرافت کا راستہ کھلے گا۔۔۔ تو انسان نہ اپنے مادے سے افضل بنتا ہے نہ اپنی صورت سے افضل بنتا ہے، نہ اپنے لباس سے افضل بنتا ہے۔ بنتا ہے تو اپنے دل سے افضل بنتا ہے۔ اور دل کب افضل بنتا ہے۔۔۔ اس وقت افضل بنتا ہے۔ جب عرش الرحمن بن جائے اور اللہ تعالیٰ کی علمی تجلیات اس پر آنے لگیں۔ اللہ کی معرفت اس کے اندر اتر جائے۔ تب کہا جائے گا کہ اب انسان حقیقی معنی میں انسان بنا ہے۔

تو صورت سے آدمی، آدمی نہیں بنتا۔ سیرت سے بنتا ہے اور سیرت کا پہلا رکن علم ہے۔ اگر علم نہیں بلکہ قلب میں جہالت پڑی ہوئی ہے تو سیرت کا ابتدائی زینہ طے نہیں ہوا۔ غرض سیرت انسانی کا پہلا رکن یہ ہے کہ اس کے اندر علم ہو۔۔۔ جہالت سے سیرت نہیں بنتی، علم سے سیرت بنتی ہے۔ بے بصیرتی سے سیرت نہیں بنتی' ہے۔ اور بصیرت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ علم و معرفت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ تو جب آدمی رومیوں ی صنعت جاری کرتا ہے تو یہ انسان کی سیرت کا ابتدائی زینہ ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ۔

الناس كلهم هالكون الا العالمون

سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں۔ سارے انسان تباہ وبرباد ہیں۔ اگر بچنے والے ہیں اہل علم ہیں جو بچیں گے۔

تو انسان کے معنی کیا ہیں؟ مادے کے لحاظ سے انسان، صورت کے لحاظ سے انسان، لباس

کے لحاظ سے انسان؟ فرماتے ہیں' ان میں سے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں ہے۔ خوبصورتی نجات نہیں دلائے گی۔ یہ گندے مادے نجات نہیں دلائیں گے۔ یہ فاخرہ لباس نجات نہیں دلائیں گے اگر نجات دلانے والی چیز ہے تو علم ہے۔ جس سے انسان حق و باطل کو پہچانے صحیح غیر صحیح میں فرق کرے' جائز و ناجائز کا امتیاز کرے۔۔۔ اگر اس میں یہ امتیاز نہیں اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کھانا جانتا ہے مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا' پہننا جانتا ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جانتا' پھر بیل میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟

بیل بھی کھانا جانتا ہے مگر جائز و ناجائز کو نہیں جانتا۔ بیل بھی تو مکان چاہتا ہے کہ جس میں رہے' مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا۔ غیر کا مکان ہو جب بھی آجائے گا۔ اپنے مالک کا مکان ہو جب بھی کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے مالک کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اور غیر کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اسے جائز و ناجائز کی تمیز نہیں۔۔۔ آخر بیل ہی تو ٹھہرا۔۔۔ اگر انسان میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہ ہو' حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو' تو بیل اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوانیت مشترک ہے۔ تو انسان' انسان جب بنتا ہے کہ جب اس کے اندر علم آجائے۔

## علم ضروری کی مقدار

اور علم بھی وہ کہ وہ محض دانستن کا نام علم نہیں' محض جان لینے کا نام علم نہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت علم تو بیل کو بھی ہے۔ وہ بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے۔ یہ نہیں' یہ مجھے گھاس دانہ ڈالتا ہے' یہ نہیں ڈالتا ہے۔ اس کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ دوسرے کے آگے نہیں۔۔۔ اتنا علم تو کتا بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے' اس کے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔ اور غیر آجائے اس پر حملہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو وہ فرق محسوس کرتا ہے کہ یہ مکان کا مالک ہے اور یہ نہیں۔ اسے مکان میں آنے کا حق ہے اور اجنبی کو نہیں۔۔۔ ہاں اگر مالک کتے کو ڈانٹ دے' تو چپکا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک نے اجازت دے دی تو اس کے آنے کا حق پیدا ہو گیا۔

ہمارے حاجی محمد شفیع صاحب جن کی کوٹھی پر ہم ٹھہرے ہوئے ہیں' انہوں نے بڑا زبردست قسم کا جنگلی کتا پال رکھا ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیں تو صرف حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو ایک دم گلا دبا دیتا ہے۔ کوئی بھی آئے اس نے بھونکنا شروع کیا لیکن حاجی صاحب جب ایک ڈانٹ لگاتے ہیں تو چاہے دس آدمیوں کے سامنے آئیں چپکا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔۔۔ معلوم ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ مکان ان کا نہیں' مالک کا ہے۔ مالک اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل ہے۔ نہیں اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل نہیں۔۔۔ غرض اتنا تھوڑا بہت علم تو کتا بھی رکھتا ہے۔ اتنا علم اگر انسان میں آئے تو اتنا علم حیوانیت کے لئے بھی ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جس سے انسان حلال و حرام کو پہچانے' حق ناحق

کو پہچانے جائز و جائز میں فرق کرے۔ یہ کام انسانی قلب کا ہے ' ہاتھ پیر کا نہیں۔

## قلب کا امتیازی ادراک

امام رافعی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کے اندر سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ صرف ایک قلب ہے جو آخرت کا عضو ہے۔ اور حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔ ہاتھ اگر مال لے تو جائز مال بھی ہاتھ اٹھالے گا۔ ناجائز مال کو ہاتھ ڈالیں وہ بھی ہاتھ پکڑ لے گا۔ یہ نہیں ہے کہ رشوت کا مال ہو تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگیں اور جائز مال ہو۔۔۔ نہیں۔۔۔ جس طرح سے خوشگواری کیساتھ پچاس ساٹھ روپے جائز ہاتھ اٹھائے گا' اگر ساٹھ ستر رشوت کے آگئے' وہ بھی اٹھالے گا۔ چوری کے آگئے وہ بھی اٹھالے گا۔ تو جائز و ناجائز میں ہاتھ کو کوئی امتیاز اور تمیز نہیں۔ یہ بیچارہ محض مالیت دینے اور پکڑنے کا عادی ہے۔ حلال ہو یا حرام۔۔۔ اگر آدمی ناجائز مال کھائے تب بھی زبان کو وہی لذت آئے گی جو زبان کو جائز مال کھانے سے آئے گی۔ کیونکہ زبان کو یہ تمیز نہیں ہے کہ یہ جائز اور یہ ناجائز ہے۔ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔

اگر آپ چلیں تو جس طرح سے آپ مسجد کی طرف چلتے ہیں۔ یہی پاؤں آپ کو شراب کی بھٹی کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ شراب کی بھٹی کی طرف جائیں تو پاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی' اور مسجد کی طرف جانے میں قدم ذرا جلدی اٹھیں گے۔۔۔ بلکہ مسجد کی طرف جانے میں ذرا کم اٹھتے ہیں شراب کی بھٹی کی طرف جانے میں زیادہ اٹھتے ہیں۔۔۔ مگر تمیز کی وجہ سے نہیں' عادت کی وجہ سے۔۔۔ تو پیر کو کوئی جائز و ناجائز کی تمیز نہیں لیکن قلب کے اندر احساس موجود ہے' جب چور چوری کا مال لے کر آئے گا تو ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ کم بخت! تو نے بری حرکت کی' اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے مگر قلب اسے صحیح مشورہ ہی دے گا' تو انسان کا قلب آخرت کا عضو ہے۔ وہ حق اور ناحق میں تمیز چاہتا ہے۔ وہ اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس لئے اگر اس قلب کو صاف کر لیا جائے تو پھر اللہ کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ اس کو پہچاننے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کس چیز کو پسند کرتے ہیں۔۔۔ تو علم کا ابتدائی درجہ تمیز ہے کہ آدمی حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرے۔

## حقیقت علم

علم کی حقیقت ہی در حقیقت تمیز ہے۔ یعنی دو چیزوں کو ممتاز کئے رکھنا۔ اور دو چیزیں رل مل جائیں اور مشتبہ ہو جائیں تو کہیں گے کہ اس شخص کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہوتا تو دونوں چیزوں کو الگ الگ دیکھتا' اور دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھتا' تو امتیاز پیدا کر دینا یہ علم کا مرتبہ ہے۔

**علم الفرقان** اور یہ علم جب اونچا بنتا ہے تو زیادہ تمیز پیدا ہوتا ہے۔اور علم میں کمال تقویٰ سے آتا ہے۔ جتنی تقویٰ وطہارت ہوگا، علم میں کمال پیدا ہوتا جائے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

"اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگو اور متقی بن جاؤ تو اللہ تم میں فرقان پیدا کر دے گا"۔

فرقان۔۔۔ کے معنی اس اندرونی قوت کے ہیں جو حق وباطل میں امتیاز پیدا کر دے۔ جائز کو ناجائز سے علیحدہ کر دے۔ جب یہ تمیز پیدا ہو جائے تو کہا جائے گا تقویٰ کامل ہو گیا۔۔۔ تقویٰ کا اثر یہ ہے کہ انسان کا دل خود بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔

**ترتیب استفتاء** اس واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

استف قلبك وان افتاك المفتون

"جب کوئی معاملہ پیش آئے پہلے اپنے دل سے فتویٰ لو"۔

دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے، یہ بات غلط ہے، مفتیوں کے پاس تو بعد میں لے جاؤ پہلے دل سے فتویٰ لو۔

ایک آدمی بعض اوقات چاہتا ہے کہ فتویٰ میرے مطابق ہو جائے، فتویٰ وہ ہو جس کو میرا نفس چاہتا ہے۔ تو الٹے سیدھے سوال بنا بنا کر مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب مفتی تو جواب وہی دے گا جیسی سوال کی صورت ہوگی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جواب حاصل کر لیا اور اس پر عمل کیا۔ ظاہری طور پر آپ کہیں گے کہ بھئی! مفتی کے فتوے پر عمل کر رہا ہے۔ بے چارہ معذور ہے، مگر دیانۃً معذور نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر سوال غلط بنایا تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے کہہ سکے کہ فتویٰ پر عمل کر رہا ہوں۔ یہ تو اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر رہا ہے۔۔۔ اور جب انسان سب سے پہلے اپنے نفس سے فتویٰ لے۔ پھر مفتیوں سے فتویٰ لے، دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا۔

استفت قلبك وان افتاك المفتون

بہر حال انسان کے قلب کے اندر جب علم کی طاقت آتی ہے تو امتیاز پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے تو کہا جائے گا کہ انسانی سیرت کا پہلا جوہر قلب کے اندر آگیا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ انسان میں حق ناحق کا علم اور امتیاز ہو جو جانوروں کو میسر نہیں ہے۔ اس واسطے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

الناس كلهم هالكون الا العالمون

لوگ سب کے سب برباد ہیں۔ نہ ان کا مادہ ان کو بچا سکے گا، نہ ان کی صورت ان کو بچا سکے گی، نہ ان کا لباس ان کو بچا سکے گا۔۔۔ غرض لوگ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اہل علم بچنے والے ہیں۔

جن کے اندر جائز و نا جائز کا امتیاز ہے۔

## سیرت انسانی کا دوسرا جوہر

لیکن اگر آپ غور کریں تو علم محض بھی نجات دلانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ جتنا علم زیادہ ہوگا زیادہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

کیوں؟

اس واسطے کہ علم سے مقصد فی الحقیقت عمل ہے۔ اگر علم پر عمل مرتب نہ ہو تو کہا جائے گا کہ یہ علم لغو، بیکار اور فضول ہے۔ علم کی غرض وغایت اس کا استعمال میں لانا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہے۔

**الشئی اذا خلا عن الغایت لغا**

جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے، وہ لغو اور بیکار ہو جاتی ہے۔۔۔ گھوڑے کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس پر سواری ہو، جب وہ سوار ہونے نہ دے اور بدکنا شروع کرے، کھانے کو سینکڑوں روپے روز کھا جائے اور جب مالک سواری کے لئے آئے دولتیاں مارنا شروع کردے، تو کہا جائے گا کہ گھوڑے کی غرض وغایت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ گھوڑا گولی مارنے کے قابل ہے۔ حالانکہ گھوڑا موجود ہے۔ اور عمدہ شکل میں ہے۔ مگر جتنی اچھی شکل ہوگی، آقا کو اور بری معلوم ہوگی۔ جب غرض پوری نہیں ہوگی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ سواری کا کام دے، تو جب شے اپنی غرض سے خالی ہو جاتی ہے، وہ لغو بن جاتی ہے اور گولی مار دینے کے قابل ہوتی ہے۔

اگر انسان بیوی کرتا ہے اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بنے گھر گرہستی کا کام کرے، اس کی نسل بڑھے۔۔۔ اگر وہ اتنی پھوہڑ ہو کر گھر کو بھی تباہ کردے۔ نسل اس سے نہیں چلتی۔ تو سوائے اس کے کہ خاوند اسے طلاق دے یا اس کو ایک طرف بٹھا کے کوئی دوسرا نکاح کرے، اسکے سوا اور کیا کرے گا۔۔۔ جو اس کے نکاح کی غرض وغایت تھی، جب حاصل نہ ہوئی تو وہ لغو اور بیکار ہو گئی، کسی نے اگر بہت زیادہ دلداری کی اور ہمدردی کی، تو طلاق نہیں دے گا، کچھ روزینہ مقرر کرے گا اور کہے گا چوکی پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتی رہ، اس کے سوا تو کسی کام کی نہیں ہے اور دوسرا نکاح کرے گا۔ غرض جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے تو لغو اور بیکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے علم اگر عمل کا فائدہ نہ دے تو وہ علم لغو اور بیکار ہے۔ وہ وبال جان بن جائے گا، اور فضول ہو جائے گا تو جب تک علم پر عمل کی غایت مرتب نہ ہو، علم بیکار ہے۔ اس سے معلوم ہوا علم محض انسان کو نجات نہیں دلا سکتا۔۔۔ نجات دلانے والی چیز انسان کا عمل ہے جو اس علم کے مطابق ہو۔ یہ اصل میں نجات دینے والی چیز ہے۔ اس واسطے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں

**الناس کلھم ھالکون الا العالمون**

انسان سب کے سب تباہ و برباد ہیں وہ بچیں گے جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہوں گے۔

تو عمل نجات کا ذریعہ ہے۔ محض کورا علم نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

## تجمل علم کا فتنہ

کورا علم تو تجمل ہے۔ اور ایک ترفع ہے۔۔۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ اخیر زمانے میں علم تجمل کا ذریعہ بن جائے گا' جیسے انسان اپنے کپڑوں سے زینت حاصل کرے گا' اپنی رنگت سے زینت حاصل کرے گا' اسی طرح اپنے علم سے بھی زینت حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہو گا۔ علم کو استعمال میں لا کر انسان نجات کی طرف نہیں چلے گا۔ بلکہ فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لے گا۔ تو ایسا علم انسان کے اوپر وبال جان ہے۔ اس لئے فرمایا کہ علماء بھی سب کے سب تباہ و برباد ہیں۔ اگر اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں۔ گویا انسانیت کی غرض و غایت علم ہے اور علم کی غرض و غایت عمل ہے' اگر علم نہیں تو انسانیت لغو ہے۔ اگر علم ہے اور عمل نہیں تو علم لغو اور بیکار ہو گیا۔ غرض علم پر عمل نجات کا ذریعہ ہے۔

## سیرت انسانی کا تیسرا جوہر

لیکن اگر آپ غور کریں تو عمل بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عمل ایک ڈھانچہ ہے جب تک اسکے اندر روح نہ ہو' وہ محض ایک لاش ہے اور لاش کار آمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی ڈھانچے میں روح موجود نہ ہو وہ اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد زمین میں دفن کر دیا جائے۔ اگر وہ لاش یوہی پڑی رہے گی تو پھولے گی' پھٹے گی' دماغ خراب ہوں گے' تو لاش کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے جلد سے جلد خاک میں ملا دیا جائے' جلد سے جلد اسے دریا برد کر دیا جائے۔۔۔ ورنہ دنیا کا دماغ صحیح سالم نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے عمل ایک لاش اور ایک ڈھانچہ ہے۔ اگر اس کے اندر روح موجود ہے تو وہ اخلاص اللہ کی ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو' اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو۔۔۔ اگر اس میں شرک کا شائبہ ہے وہ عمل غیر اللہ کے لئے ہو یا وہ عمل مشترک ہے کہ کچھ اللہ کے لئے ہے کچھ غیر اللہ کے لئے ہے تو در حقیقت وہ عمل بے روح کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اور وہ عمل سوائے اسکے کہ پھولے پھٹے' سڑے اور گلے' آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔۔۔ تو عمل کی روح' اخلاص ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو اس میں غیر کی رضا کی آمیزش نہ ہو۔

## رضائے خلق کا طریق

بلکہ غیر بھی جب ہی راضی ہو گا' جب اس کی رضا پیش نظر ہو۔۔۔ کیونکہ جب اللہ کی رضا پیش نظر ہو گی' اغیار بھی راضی ہوں گے۔۔۔ اور اگر صرف غیروں کے راضی کرنے کی فکر کرو گے نہ وہ راضی ہوں گے نہ اللہ

راضی ہوگا۔ تو کوئی بھی راضی نہ ہوا اور خدا کو راضی کرنے کی فکر کی تو غیر بھی راضی ہو جائے گا' انسان بھی راضی ہو جائے گا۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی راضی ہو جائے گا' نباتات بھی راضی ہوں گے۔ جمادات بھی راضی ہو جائیں گے۔

من کان للہ کان اللہ له'

جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔۔۔ جس کا اللہ ہو جائے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے' اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تو ؎

تو از حکم داور گردن مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تیرا کام یہ ہے کہ مالک کے حکم سے گردن مت پھیر' اگر تو نہ پھرا تو ساری گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ اور اگر تو نے مالک سے گردن پھیر لی تو ساری گردنیں تیرے سے الگ ہو جائیں گی اور اکڑ جائیں گی۔۔۔ بہر حال جب اللہ کو راضی کرے گا تو مخلوق خود بخود راضی ہو جائے گی' اور وہ راضی نہ ہوئے تو کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ اس "ایک" کو آدمی پکڑ لے۔

**مالک کی نگاہ کی عظمت** ہارون الرشید کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے دربار میں ایک دفعہ جوش میں آکر اعلان کیا کہ آج جو شخص جو کچھ مجھ سے مانگے گا' میں اس کو دوں گا'۔۔۔ لوگوں نے مانگنا شروع کیا۔۔۔ کسی نے کہا مجھے گورنری دے دیجئے' اس نے کہا۔ دے دی۔ کسی نے کہا مجھے فلاں قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا میں نے دے دیا' کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دیجئے' اس نے کہا میں نے دے دیا' ہر ایک نے اپنی مراد پیش کرنی شروع کی اور بادشاہ نے پوری کرنی شروع کر دی۔

ہارون الرشید کی پشت پر ایک باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے کہا تو نے اب تک کچھ نہیں مانگا؟

اس نے کہا ان احمقوں کو نمٹنے دو' اس کے بعد مانگوں گی' ہارون الرشید نے کہا۔ اچھا۔۔۔ یہ میری دولت کے امراء وزراء سب کے سب احمق ہیں۔

اس نے کہا سب پاگل اور بے وقوف ہیں۔ انہیں مانگنا ہی نہیں آتا۔۔۔ ہارون سمجھا کہ ناقص العقل تو ہے ہی' کون اس کے منہ لگے' خاموش ہو گئے' لوگ مانگنے پر کھڑے ہوئے تھے' کسی نے کچھ مانگا' کسی نے کچھ مانگا' وہ دیتے رہے' جب سب نمٹ گئے تو ہارون الرشید نے کہا' اب تو مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے کہا سارے بے وقوف تو نمٹ چکے ہیں۔ اب میرے مانگنے کا موقع ہے' آپ مجھے کیا دیں گے۔۔۔؟ ہارون الرشید نے کہا۔۔ میں تو اعلان کر چکا ہوں کہ جو کوئی آج مجھ سے جو مانگے گا میں اس کو دوں گا' اس نے جا کر ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ ؎

"میں تو آپ کو مانگتی ہوں آپ میرے ہو جائیے"۔

اس واسطے کہ جب آپ میرے ہیں تو قلعے بھی میرے ہیں' خزانے بھی میرے ہیں' رعایا بھی میری' ملک بھی میرا' اگر آپ میرے نہیں ہیں تو خزانہ آئے گا نہیں اگر آئے گا تو پھر چھن جائے گا۔ اس لئے میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا جتنے مانگنے والے تھے ان میں سے جس نے دس لاکھ مانگے' اسے دس لاکھ مل گئے' آگے کچھ نہیں ملا' کسی نے قلعہ مانگا آپ نے قلعہ دے دیا' آگے اس کی کوئی چیز نہ ہوئی' میں نے جو چیز مانگی' وہ مل گئی۔ تو ساری چیزیں میری ہیں --- اور میں نے ان کو بے وقوف اس لئے کہا کہ اگر دس لاکھ مل گئے تو دس لاکھ ہی ہوئے زائد تو نہ ہوئے' اور وہ دس لاکھ بھی مرض خطر میں ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہارون الرشید کی نگاہ پھر گئی اور اس نے کہہ دیا کہ ان سے یہ چھین لو' اور قلعہ دیا تھا' بعد میں نگاہ پھر گئی تو قلعہ چھین جائے گا' اگر وزارت دی تھی بعد میں نگاہ پھر گئی تو بادشاہ کہہ دیں گے کہ اس سے عہدہ چھین لو --- تو اصل میں تو بادشاہ اور صدر کی نگاہ ہوتی ہے۔ اس کو دیکھا جاتا ہے اگر یہ قائم ہے تو یہ سب چیزیں ہیں۔ اگر وہ نہیں ہے تو کسی چیز کے آپ مالک نہیں بن سکتے۔

**تسخیر خلائق**

یہی حالت ہے اللہ والوں کی اور دنیا والوں کی کہ دنیا والے کوئی قلعہ مانگتا ہے کوئی لاکھ مانگتا ہے' کوئی کروڑ مانگتا ہے اور اللہ والے کہتے ہیں کہ :

"یا اللہ! ہمیں تو آپ درکار ہیں اور کوئی چیز درکار نہیں' جب آپ مل گئے ساری دنیا ہماری' سارے قلعے ہمارے' سارے ملک ہمارے' ساری مخلوق ہماری' جانور بھی ہمارے سامنے سر جھکائیں گے' اور انسان بھی"۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر جمادات کو حکم کرتے ہیں وہ فرماں برداری کرنا اپنا فخر جانتے ہیں۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ کہ نبی کریم ﷺ کو استنجاء کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریگستان چٹیل میدان تھا' درخت اور سایہ دور دور تک میلوں پر تھا۔ آپ نے دو درختوں کو اشارہ فرمایا تو ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے۔ دونوں نے مل کر اپنی شاخیں ملادیں اور اس طرح سے ملادیں کہ ہر طرف سے بالکل پردہ سا ہو گیا' آپ ﷺ ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد اشارہ فرمایا۔ وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔ یہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔

حکومت تو یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ جو کائنات کا مالک ہے اسے اپنا لیا تو ساری چیزیں اپنے قبضے میں آگئیں۔

حضرت انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان اور بڑے رتبے ہیں۔ ان کے خدام و غلام اور ان اولیاء کے کرام کی بھی بڑی شان ہے کہ جب وہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں تو ساری کائنات ان کی تعمیل حکم کرنا اپنا فخر جانتی ہے' اپنے لئے سعادت جانتی ہے' جمادات بھی حاضر' نباتات بھی حاضر اور انسان بھی حاضر --- سب چیزیں سامنے حاضر رہتی ہیں۔ یہ اخلاص اللہ کی برکت ہوتی

ہے کہ اپنے کو خالص اللہ کے سپرد کردے، جس میں غیر کا شائبہ نہ ہو۔

### قلب مشرک کا تذبذب

اس لئے کہ جب غیر کا شائبہ ہوگا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دو آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ جو چند آقاؤں کا غلام ہوگا تو ایک کی خدمت کی طرف جائے گا تو اسے ڈر ہوگا کہ دوسرا ناراض نہ ہو جائے۔ اور سب کو ایک وقت میں راضی رکھنا مشکل ہے۔ تو نتیجہ یہ کہ چار آقاؤں کا غلام کسی ایک آقا کی خدمت میں نہیں کرسکتا۔ خادم وہی ہوگا جو ایک کا غلام ہو۔ سب سے کٹ کر ایک کا ہو جائے گا کہ مرتا ہوں تو اس کے لئے جیتا ہوں تو اس کے لئے اس کے قلب میں قوت ہوگی۔۔۔ اس واسطے کہ قوت کا مرکز اخلاص ہے اور قوت یقین سے پیدا ہوتی ہے تردد اور تذبذب سے قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے تو مشرک کے دل میں کبھی جان نہیں ہوسکتی اور موحد کبھی ضعیف القلب نہیں ہوسکتا، موحد کے قلب میں اس کی توحید کی وجہ سے قوت ہوتی ہے اور مشرک کے دل میں جان نہیں ہوسکتی، جس کے کروڑوں خدا ہوں، وہ کسی ایک طرف جھکے گا تو دوسرے کی فکر پڑے گی، اس کے دل میں جان نہیں رہے گی، ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔

### قلب موحد کا یقین

اور موحد کے قلب کے اندر قوت ہوتی ہے۔ تو موحد اس کو ہی کہتے ہیں جو ایک کا ہو کر بقیہ سے قطع نظر کرے؟

موحد چہ برپائے ریزی زرش
کہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس

موحد کسے کہتے ہیں۔۔۔؟ کہ اس کے قدموں پر لاکھوں روپیہ ڈال دو، یا اس کے سر پر فولاد ہندی کی تلوار لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ اسے نہ کسی کا ڈر ہوگا نہ کسی سے امید ہوگی۔ وہ تو ایک کا ہو چکا ہے۔ نہ طمع مائل کرسکے گی، نہ خوف مائل کرسکے گا۔

### روح عمل

تو ''ایک کا ہو جانا'' اسی کے معنی ہیں ''اخلاص''۔۔۔ اور عمل کے اندر اخلاص سے روح پیدا ہوتی ہے۔ جس عمل کے اندر شرک کا شائبہ بھی ہو، وہ عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا، اس میں روح ہی نہیں ہے۔

اور شرک فقط یہی نہیں ہے کہ آدمی دو خدا مانے، خدا کو ایک مانے، صفات میں شرک اختیار

کرے یہ بھی شرک ہے' صفات میں ایک مانے افعال میں شرک اختیار کرے۔ یہ بھی شرک ہے۔ افعال میں بھی ایک مانے تو ذات بھی ایک' صفات بھی ایک صفات میں بھی وحدانیت اور افعال میں بھی' لیکن عبادت میں شرک کرنے لگے کہ دو کے سامنے سجدہ کرے' یہ بھی شرک ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ظاہر میں سجدہ بھی ایک ہی کے سامنے کرے تب بھی شرک کا ایک مقام ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ کی عبادت کر رہا ہے مگر دل میں یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے تو حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ ریاء سب سے بڑا شرک ہے۔۔۔ دیکھنے میں شرک معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت میں شرک ہے۔ اور حدیث میں ارشاد ہے۔

الشرك اخفى من دبيب النمل

بعض شرک ایسا دقیق ہوتا ہے جیسا کہ چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چلے تو اس کی کھسکھساہٹ اتنی دقیق ہوتی ہے کہ کان نہیں سن سکتے۔ تو جیسے اس کا ادراک نہیں ہوتا' اس شرک کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔۔۔ وہ یہ کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے اس کو یکتا جانے' صفات میں بھی یکتا جانے' ریا دکھلاوا بھی نہ ہو' مگر پھر بھی ایک درجہ کا شرک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے اندر عجب موجود ہو۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال موجود ہو کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں' کون ہے جو میرے برابر عبادت کر سکے۔ یہ جو عجب اور خود بینی پیدا ہوئی۔ یہ بھی اس سے زیادہ دقیق قسم کا شرک ہے' جو عمل کو ضائع کر دے گا' اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کا ضائع ہونا شرک سے ہے اور عمل کی بقاء اخلاص سے ہے۔ تو جس چیز سے شے کی بقا ہوتی ہے اسی کو تو روح کہا جاتا ہے بدن روح سے باقی رہتا ہے اور اگر عمل اخلاص سے باقی ہو تو اخلاص عمل کی روح ہے' جب تک اخلاص نہیں ہوگا عمل قابل قبول نہیں ہوگا اسی کو فرماتے ہیں کہ۔

وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلاَّ الْمُخْلِصُوْنَ

عمل کرنے والے بھی سب کے سب ہلاک و برباد ہیں۔ اخلاص سے عمل کرنے والے بچیں گے' جن کے اندر خلوص نیت اور اخلاص موجود ہوگا۔ تو انسان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں' نجات کا اولین درجہ علم ہے۔ علم بھی کار آمد اور کافی نہیں ہے۔ دوسرا درجہ عمل ہے' عمل بھی کار آمد نہیں۔ تیسرا درجہ اخلاص کا ہے۔۔۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ علم بھی ہو۔۔۔ عمل بھی ہو۔۔۔ خلوص بھی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ اب انسانیت کے جوہر اس کے اندر محقق ہو گئے' اب اس میں انسانیت اور کمال انسانیت آ گئی۔

## سیرت انسانی کا چوتھا جوہر

لیکن اگر غور کیا جائے تو اب بھی ایک چیز باقی رہ گئی اگر وہ نہ ہو تو پھر تینوں چیزیں اکارت بن جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں

ضائع ہو جاتی ہیں۔ نہ علم نجات دلائے گا نہ عمل' نہ اخلاص اللہ جب تک وہ چوتھا جوہر موجود نہ ہو۔۔۔ اور وہ کیا ہے۔۔۔ ایک آدمی علم رکھتا ہے۔ بڑا اچھا عالم ہے عمل بھی کر رہا ہے اور مخلصانہ عمل کر رہا ہے' لیکن اس عمل کرنے کے بعد مطمئن ہو بیٹھا کہ نجات تو میرے گھر کی باندی ہے۔ تو وہ ملے گی' اللہ سے بے فکر ہو بیٹھا۔ یہ نہیں جانتا کہ جس نے اخلاص دیا ہے اگر وہ کل کو ناخوش ہو جائے اور یہ چھین لے تو میری کیا گت بنے گی۔۔۔! جسے دینا آتا ہے۔ اسے لینا بھی آتا ہے۔ جو علم دے سکتا ہے وہ لے سکتا ہے۔ جو اخلاص کا عطیہ بخشنے والا ہے اور وہ اسے چھین بھی سکتا ہے اس لئے مخلص کا کام یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے مودبانہ کھڑا رہے کہ کہیں مالک کی نگاہ نہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے سلب ہو جائیں۔۔۔ تو جب تک انسان کے اندر مالک کے راضی رکھنے کی فکر نہ ہو وہ اطمینان سے نہ بیٹھے۔ فکر میں رہے کہ معلوم نہیں کل کو کیا بات پیش آئے' اپنے علم کے اوپر غرہ نہ کرے' اپنے عمل کے اوپر غرہ نہ کرے' اپنے اخلاص کے اوپر غرہ نہ کرے۔ اسے توفیق خداوندی سمجھے' اگر ذرہ غرہ کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ علم میرا ہے اور یہ ہنر میرا ہے۔ یہ عمل میرا ہے اور یہ اخلاص میرا ہے۔ بس یہ اس نے عمل کو اکارت کیا تو۔ یہ سمجھنے کے بجائے یہ سمجھے کہ یہ توفیق خداوندی ہے۔ یہ عطیۂ الٰہی ہے اور جو دنیا جانتا ہے وہ چھیننا بھی جانتا ہے۔ میں چوبیس گھنٹے اس کی چوکھٹ پر راضی رہوں۔ ایسے نہ ہو کہ اس کی نگاہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے چھین لی جائیں۔ اس کا نام "فکر" ہے جب تک یہ فکر نہ ہو اور جب تک اس میں بے اطمینانی کی کیفیت یعنی "تفکر" کی کیفیت نہ ہو اس وقت تک بقائے علم' بقائے عمل اور بقائے اخلاص کی کوئی صورت نہیں۔

## مقربین بارگاہ کی گرفت کا اندازہ

اور بالخصوص۔

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو زیادہ علم والے' زیادہ عمل والے اور زیادہ اخلاص والے ہیں وہ زیادہ ہلاکت کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں کہ ذرا قدم گرے تو ادھر بھی جہنم' ادھر بھی جہنم' ان کے خطرات اور ان کے وسواس پر بھی ان کی گرفت ہوتی ہے۔

حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ سابق زمانے میں بنی اسرائیل میں ایک عابد زاہد گزرا ہے۔ روایت میں جس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے "بدور السافرۃ فی علوم الآخرۃ" میں یہ حدیث نقل کی ہے۔۔۔ آخرت کے احوال کے بارے میں ایک کتاب اس نام سے لکھی ہے۔ اس میں قبر کے حالات' برزخ کے حالات اور عالم حشر کے حالات ہیں۔ اس میں اس واقعہ کی بھی روایت نقل کی ہے۔

پچھلی امتوں میں ایک عابد زاہد گزرا ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتا تھا۔ عبادت و

زہادت کے سوا اسے دوسرا کام نہیں تھا۔۔۔ اس نے یہ دیکھا کہ میں عبادت تو کرتا ہوں مگر دنیوی اشغال میں بیوی ہے' بچے بھی ہیں' عزیز بھی ہیں نیز کمانا اور کھانا' دنیا بھر کے دھندے ہیں اور مجھے عبادت سے یہ چیزیں غافل بناتی ہیں کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ دھندے ختم ہو جائیں اور میں صرف عبادت کے لئے فارغ ہو جاؤں تو اس نے تمام عزیزوں' رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر سمندر کے بیچ میں ایک ٹیلے کو اختیار کیا اور وہاں جا کر ایک کٹیا ڈال دی کہ بس یہاں پر بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول رہوں گا۔

پچھلے ادیان میں رہبانیت جائز تھی۔ اس نے رہبانیت اور گوشہ گیری اختیار کی' عزلت اور انقطاع اختیار کیا اور جا کر بیٹھ گیا' جو چھپر یا ڈالی تھی' اس کے نیچے بیٹھ گیا۔۔۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کی غذا کا یہ سامان کیا کہ اسی ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگا یا اس میں بڑے بڑے انار لگے اور اس کڑوے سمندر میں اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑی پر ایک میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ چوبیس گھنٹے میں ایک انار کھا لیا اور ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے اس طرح اللہ کی یاد میں مشغول کہ نہ سونا' نہ آرام کرنا' بس یہی اس کا کام تھا۔۔۔ پانچ سو برس اس طرح سے اس کی عمر کے گزرے' گویا خالص عبادت جس میں ریا اور دکھلاوے کا کوئی شائبہ نہیں' ظاہر ہے کہ پہاڑ کے ٹیلے پر کس کو دکھلائے گا؟ وہاں اس کو دیکھنے والا کون ہے؟ تو خالص عبادت کی جس میں علم بھی صحیح تھا' عمل بھی صحیح تھا' اور اخلاص بھی صحیح تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ

"اے اللہ! یہاں کوئی اور تو نہیں ہے جو مجھے نہلائے' کفنائے اور دفن کرے' یہاں تو میں اور تیری ذات بابرکات موجود ہے۔ اس لئے ایک درخواست میری یہ ہے کہ مجھے سجدہ کی حالت میں موت دے۔ تاکہ عین خالص عبادت میں میری موت آئے"۔

اور دوسری درخواست یہ ہے کہ میری لاش کو قیامت تک سجدہ کی حالت میں محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ میں قیامت تک تیرا صورتاً سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ پانچ سو برس کی عبادت تو نے مجھے عطا کی۔ اب ہزاروں برس قیامت تک بقیہ رہ گئے ہیں۔ اس میں میری لاش سجدے میں پڑی رہے۔ بگڑنے نہ پائے۔ تاکہ قیامت تک اسی طرح سجدے میں پڑا رہوں۔ اور میرا جسم سجدہ گذار رہے"۔

حق تعالیٰ نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔۔۔ سجدے کی حالت میں موت آئی اور اس کا بدن بھی محفوظ ہے۔ اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا بدن آج تک محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ نے اس ٹیلے پر اتنے بڑے بڑے عظیم الشان درخت اگا دیئے' اتنی اندھیری ہو گئی کہ اول تو لوگوں کا وہاں

پہنچنے کا موقع نہیں، اور کوئی پہنچ جائے تو ہیبت کی وجہ سے اندر نہیں جاسکتا۔۔۔ اس لئے کہ اگر لوگوں کو موقع مل جاتا تو لوگ تو مردوں کو نہیں چھوڑتے، قبروں کو نہیں چھوڑتے، اس کے آگے جا کے جانے کیا کیا کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس کو چھپادیا کہ نہ وہاں پہنچیں گے، نہ خرافات ہوں گی۔۔۔ اس کے بارے میں حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس عابد کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے، میں نے اپنے فضل ور کرم سے تجھے بخشا اور میں نے تجھے جنت عطاء کی"۔

اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گزرا کہ پانچ سو برس تو میں نے عبادت کی اور خالص عبادت کی، بیوی بچوں کو چھوڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا اتنی محنت اٹھائی، اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا، کم سے کم میری دلداری ہی کے لئے فرماتے کہ تیری عبادت کے بدلے میں تجھے جنت عطاء کی۔ ذرا میرا دل تو خوش ہو جاتا کہ میں نے کچھ کیا۔۔۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ محض اپنے فضل و کرم سے بخشا۔۔۔ یہ اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ نہ کوئی جما ہوا خیال تھا، ایک وسوسے کے درجے میں اس کے دل میں یہ بات گزری تو؂

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو مقربان بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔ ان کے افعال پر اور ان کے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے تم اپنے دل میں یہ خیال کیوں لائے؟۔۔۔ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا۔ اس بندے کو بجائے جنت کی طرف لے جانے کے جہنم کی طرف لے جاؤ، مگر جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔ بس اتنی دور لے جاؤ کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کا راستہ ہو، مگر جہنم کی ہوا وہاں پہنچتی ہو۔ وہاں لے جا کر اسے کھڑا کر دو۔۔۔ تو حدیث میں ہے کہ ملائکہ لے گئے۔۔۔ اتنی دور تک لے جا کر اسے کھڑا کیا۔۔۔ جہنم کی ایک لپٹ اور لو آئی تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا، اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ غیب سے ایک ہاتھ نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا ہوا آیا کہ اے اللہ کے بندے! یہ پانی مجھے دے۔ جتنا یہ آگے بڑھا وہ ہاتھ اتنا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔۔۔ آواز یہ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے مگر مفت نہیں ملے گا قیمت سے ملے گا۔۔۔ اور قیمت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس پانچ سو برس کی خالص عبادت ہو اگر وہ دے تو یہ کٹورا پانی کا مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں مل سکتا۔

یہ عابد دوڑا اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ یہ اس نے دی اور پانی کا کٹورا لے کر پیا۔۔۔ دم میں دم آیا اور جان میں جان آئی۔۔۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو ارشاد ہوا کہ اس عابد کو لوٹا کر لاؤ۔ وہ واپس لایا گیا۔

حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بندے! تیری پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے تو ہم ادا

ہو گئے۔ اور وہ تو نے ہی تجویز کی تھی۔۔۔ یعنی ایک کٹورا پانی۔۔۔ تو تو نے اپنی پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی تجویز کیا۔ وہ ہم نے تجھے دے دیا' معاملہ برابر سرابر ہو گا' نہ ہمارے ذمے کچھ رہا۔ نہ تیرے پاس کچھ رہا۔۔۔ اب جو دنیا میں تو نے ہزاروں کٹورے ہمارے پئے اس کا حساب دے کہ ایک ایک قطرے کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا۔ اور جو اناروں کے لاکھوں دانے کھائے' ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ایک ایک دانے کے بدلے کتنے سجدے کئے۔

اور یہ تو دانا اور پانی ہے۔۔۔ وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے روشنی بخشی تھی کہ ایک تار نگاہ سے سینکڑوں چیزیں دیکھ لیتا تھا' ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو ہم نے ٹھنڈی ہوائیں دی تھی کہ تو سانس لیتا تھا اور تیری زندگی قائم تھی ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے؟

اور فرمایا کہ

یہ تو اسباب ہیں۔ ان سب کے بعد جو ہم نے تجھے عبادت کی توفیق بخشی اور طاقت دی تھی' اس توفیق کے بدلے میں بتلا تو کیا لے کر آیا ہے؟

یہ عابد تھرا گیا۔۔۔ اور اس نے کہا کہ

## مدار نجات فضل ہے عمل نہیں

"اے اللہ! کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ تیرا فضل ہی نجات دلائے گا۔ ہر آدمی تیرے ہی فضل سے بخشا جائے گا"۔

اسی کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

**لن ینجی احدکم عملہ**

تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا' محض اللہ کا فضل نجات دلانے والا ہے۔۔۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سن کر عرض کیا

**ولا انت یا رسول اللہ؟**

یارسول اللہؐ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ جس عمل کی قیمت وہ ہے کہ سارے آسمان اور زمین تل جائے تو ایک سجدے کی قیمت نہ پڑ سکے۔ وہ عمل بھی نجات نہیں دلائے گا؟ فرمایا

**لا. الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ**

مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا' جب تک اللہ کا فضل دستگیری نہ کرے تو جب اللہ کے رسولؐ یہ فرمائیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنی کسی عبادت کے اوپر غرہ کریں تو

اصل میں اس عابد کو یہ بتلانا تھا کہ عمل نجات دھندہ نہیں ہے فضل خداوندی نجات دھندہ ہے۔

## توفیق عمل، علامت فضل ہے

مگر بھئی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ لیجیو کہ جب عمل سے نجات نہیں ہوتی تو لاؤ پھر آج سے عمل وغیرہ سب چھوڑ دو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ اس لئے کہ نجات تو عمل سے نہیں ہے وہ فضل سے ہو گی۔ اور فضل کے بارے میں کسے پتہ ہے کہ کس پر ہو گا۔ اس کے سہارے سے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔۔۔؟ جس کی نجات ہونی ہو گی فضل سے ہو جائے گی۔ نہیں ہونی ہو گی، نہیں ہو گی۔ عمل تو کار آمد ہے نہیں۔۔۔ تو یہ نتیجہ مت نکال لینا۔

بے شک عمل نجات دلانے والا نہیں۔ عمل سے نجات نہیں ہو گی، فضل سے نجات ہو گی۔۔۔ مگر فضل کے پہچاننے کا طریقہ در حقیقت عمل ہے۔ اگر عمل کر رہا ہے تو یہ علامت ہے کہ اللہ کا فضل متوجہ ہے۔ اور جو عمل نہیں کر رہا تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کے اوپر اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے۔ اس واسطے عمل مت ترک کیجئے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ جب عمل سے نجات نہیں تو عمل کو چھوڑ دو، بے شک عمل نجات دھندہ نہیں، فضل ہے، مگر فضل کی علامت عمل ہے۔ عمل ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہے۔

دنیا میں فضل کی علامت یہ ہے کہ توفیق مل رہی ہے اور آخرت میں فضل کی علامت یہ ہے کہ جنت مل رہی ہے اور نعمتیں مل رہی ہیں۔ دونوں جہانوں میں دستگیری کرنے والا فضل ہے۔ عمل بھی تو فضل ہی سے کرتے ہیں۔ فضل متوجہ نہ ہو تو آپ عمل کیسے کریں۔۔۔؟ اس لئے کہ عمل توفیق سے کرتے ہیں۔ توفیق دینے والے وہ ہیں تو فضل ان کی طرف متوجہ ہو گیا، اگر توفیق نہ دیں تو آدمی عمل نہیں کر سکتا۔ تو سب سے بڑی نعمت انسان کے حق میں توفیق ہے۔

## روح شکر

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا

اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو۔۔۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے کلام کو پورا سمجھتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ بے شک میں شکر ادا کروں گا۔ میرا فرض ہے کہ میں ادا کروں۔ یوں بھی فرض تھا اور جب آپ حکم دے رہے ہیں تو بالکل ہی فرض ہو گیا۔۔۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ شکر ادا کروں تو کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر کو ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو وہ توفیق ایک نعمت ہو گئی، پھر اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق پھر آپ دیں گے۔ تو پھر ایک نعمت بن گئی،

تو اس سے پہلے اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا وہ بھی توفیق آپ دیں گے تو وہ نعمت ہوگئی تو اس سے پہلے ایک اور شکر نکلا تو ہر شکر سے پہلے ایک اور شکر نکلتا ہے' میں شکر کی ابتداء کروں تو کس طرح سے کروں۔۔۔؟ میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔

ادھر سے جواب آیا کہ

"اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو اپنی ہار مان لینا' یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو نے شکر ادا کر دیا۔ کوئی بندہ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔۔۔ ہم تو فرض ادا نہیں کر سکتے حق تو کیا ادا کریں گے۔ عاجز ہیں۔ اس عجز کو سمجھ لینا کہ ہم عاجز ہیں۔ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ اپنی ہار مان لے کہ میں عاجز ہوں"

## سندِ شکر

نبی کریم ﷺ جو سید الحامدین ہیں جن سے بڑھ کر اللہ کی حمد و ثنا کرنے والا عالم میں کوئی نہیں۔۔۔ اخیر میں آپ بھی کہتے ہیں کہ

**اللهم لا احصى ثناء عليك انت كما اثينت على نفسك**

"اے اللہ! میں تیری حمد و ثناء کا ایک شمہ بھی نہیں ادا کر سکتا۔ میں تیری حمد و ثناء کا احصاء ہی نہیں کر سکتا"۔

بس مختصر یہ ہے کہ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے آپ کو فرمادیا۔۔۔ میں عاجز ہوں کہ تیری حمد اور تیری ثناء صفت کو ادا کر سکوں۔ اس لئے کہ وہ لامحدود ہے اور بندہ محدود ہے۔ اس کا کمال محدود' اس کی عقل محدود' اور اس کی طاقت محدود' تو محدود سے لامحدود کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ انت كما اثنيت على نفسك یہ وہی عجز کا ہی اعتراف ہے کہ میں تیری ثناء ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی کو سب سے بڑی سند سمجھا گیا جس نے ہار مان لی اور عجز تسلیم کر لیا وہی سب سے بڑی ثناء کرنے والا ہے۔۔۔ میرا ہی ایک شعر ہے۔ لمبی نظم تھی وہ میں بھول گیا۔ اس میں کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا۔

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے
کہ ہم سے کچھ ثناء ممکن نہیں ہے

ہم سے کوئی ثناء ممکن نہیں۔۔۔ بس ثناء کا ادا کرنا ہے۔۔۔ بہر حال حق تعالیٰ شانہ جب فضل فرماتے ہیں تو توفیق بھی دی جاتی ہے۔ جب توفیق آتی ہے تبھی انسان عمل کرتا ہے۔۔۔ تو عمل ادھر سے ہوا۔ ہماری طرف سے نہ ہوا۔

## نفی عمل سے اثبات عمل

اس واسطے اس عمل کو زیادہ قبول کرتے ہیں۔ جس میں آدمی

سمجھ لے کہ میں نے کچھ نہیں کیا' اور جو خود کہے کہ میں نے سب کچھ کیا' اسے کچھ نہیں ملے گا۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے غرہ اور غرور کرے اور یوں کہے کہ اے اللہ! دیکھ میں نے تیری نماز پڑھی' میں نے حج کیا' میں نے جہاد کیا' میں نے یہ کام کیا۔۔۔ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ ۔

"نالائق! تو نے کیا کیا۔ بدن کے اندر طاقت تو ہم نے دی تھی' توفیق تو ہم نے دی تھی' ارادہ تو ہم نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا؟

اور اگر کوئی بندہ سب کچھ کر کے کہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے سب کچھ ہوا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں۔

لاحول ولاقوة الابك

کوئی حول اور طاقت میرے اندر نہیں' توفیق تیری' طاقت تیری' ارادہ وقتی تیرا' میں نے تو کچھ نہیں کیا۔۔۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ۔

"نہیں۔۔۔ عمل تو تو نے ہی کیا' حرکت تو تو نے ہی کی' مسجد تک قدم اٹھا کر تو ہی گیا تھا۔ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے"۔

غرض جو اپنے عمل کی نفی کرتا ہے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور جو خود اثبات کرنے لگے' اس کی نفی کر دیتے ہیں جو نیچا بنے اسے اونچا اٹھاتے ہیں۔ اور جو خود اونچا بننے لگے اسے زمین کے اوپر پٹخ دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے خوب کہا کہ ۔

پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو جتنا نیچا بنتا ہے۔ اسے اونچا بناتے ہیں اور جو خود اونچا بننے لگتا ہے اس زمین پر گرا دیتے ہیں۔ تو اونچا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی نیچا بنجائے۔ بلند و بالا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ پست بن جائے۔

## طریق عزت

عزت والا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی ذلت پیش کر دے' عزت آجائے گی۔ اور جو خود ہی اپنی عزت کو سراہنے لگے' تو پھر ادھر سے پھٹکار برسے گی۔ ذلت برسے گی' اس لئے کہ کوئی عزت کا مستحق نہیں۔ عزت تو اللہ کی ہے۔ جو اس کے آگے جھک جائے اس کے لئے عزت آتی ہے۔

فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

تو عزت اللہ کی' اس کے رسول کی اور مومنین کی ہے۔۔۔ بہر حال طریقہ عزت کا یہ ہے کہ

اپنی ذلت محسوس کرے۔ اگر کوئی مخدوم بننا چاہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ یوں کہے کہ دیکھو لوگو! میں مخدوم ہوں۔ تم سب میرے غلام ہو۔ لوگ کہیں گے۔ نامعقول! تجھے شرم نہیں آتی' ایسا کلام کر رہا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ پست بن جائے گا۔۔۔ مخدوم بننے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کا خادم بن جائے' لوگ سروں پر اٹھائیں گے وہ خود ہی مخدوم بن جائے گا۔ تو مخدوم بننے کا طریقہ خادم بننا ہے نہ کہ مخدومی کا دعویٰ اور ادعا کرنا۔ دعویٰ کرنے والے کو پٹخ دیا جاتا ہے۔۔۔ بہر حال فضل خداوندی ہوتا ہے تو توفیق بھی ملتی ہے' توفیق ملتی ہے تو عمل بھی ہوتا ہے اور جس کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ پہلے فضل آیا' پھر توفیق آئی' پھر میرے اندر ارادہ پیدا کیا گیا' پھر میرے اندر ارادہ پیدا کیا گیا' پھر میرے اندر طاقت پیدا کی گئی' تب جا کے عمل ظاہر ہوا۔ جو اس سلسلے کو جانتا ہے۔ وہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گا کہ میں نے عمل کیا وہ تو یہ کہے گا کہ یہ سب کچھ اوپر سے ہے۔ میرے اندر تو کچھ بھی نہیں۔

## سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ

اب اس کی ایسی ہی مثال ہو گئی کہ دو آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں آئیں' اور ان دونوں کا دعویٰ ہو کہ یہ کھیتی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا دانہ سب میرا ہے۔ وہ بھی کہے کہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ میرا ہے۔۔۔ تو ایک شخص سے مجسٹریٹ پوچھتا ہے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے؟ کہ نہیں صاحب! زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ بیج تم نے ڈالا تھا۔۔۔؟ نہیں بیج بھی میں نے نہیں ڈالا۔۔ پانی تم نے دیا تھا۔۔۔؟ نہ صاحب! پانی بھی اسی نے دیا تھا۔ میں نے نہیں دیا تھا۔۔۔ چھ مہینے خون پسینہ تم نے ایک کیا تھا؟ نہیں صاحب! وہ بھی اسی نے کیا تھا۔ باقی دانہ میرا ہے۔

تو مجسٹریٹ کہے گا کہ اس پاگل کو کان سے پکڑ کر نکال دو' نہ اس کی زمین' نہ اس نے بیج ڈالا' نہ اس نے پانی دیا' نہ اس نے محنت کی۔ اور دانے کا دعوے دار ہے۔ یہ کدھر سے دعوے دار ہو گیا۔۔۔؟ جس کی زمین ہے' جس نے بیج ڈالا ہے جس نے محنت اٹھائی' دانہ بھی اسی کا ہو گا۔

ایک عمل کرنے والا دیکھتا ہے کہ میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی خدا نے دی' عمل کرنے کا ارادہ بھی میرا اپنا نہیں تھا' وہ بھی خدا نے دیا' توفیق میں نے خود نہیں پیدا کی وہ بھی اسی نے دی۔۔۔ باقی عمل کا مالک میں ہوں۔ تو خدا کہے گا کہ اس نامعقول کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ توفیق ہم نے دی' قوت ہم نے دی' ارادہ ہم نے دیا' یہ عمل کا کیسے مالک ہے؟

اور جس کی نگاہ پورے سلسلے پر ہے کہ آپ ہی فضل کرنے والے' آپ ہی توفیق دینے والے' آپ ہی قوت بخشنے والے' آپ ہی کرا دینے والے' میرا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب آپ کا فضل ہے۔ تو پھر فرمائیں گے۔ نہیں' تو نے ہی عمل کیا تھا' تو نے ہی حرکت کی تھی' تو ہی چل کر گیا تھا۔۔۔ غرض جو اپنے کو خود سراہتا ہے۔ اسے مٹا دیتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے اسے باقی کر دیتے ہیں اسے

اونچا اٹھا دیتے ہیں۔

## دولت تفکر

عرض کرنے کا مطلب یہ نکلا کہ نہ علم میں نجات ہے۔ نہ عمل محض میں نجات ہے نہ اخلاص میں نجات ہے جب تک کہ اس کے ساتھ فکر شامل نہ ہو۔ کہ نہ غرور ہو، نہ اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ ہو، نہ اپنی عبادت اور عمل پر کوئی غرہ ہو۔۔۔ بلکہ ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا، یہ انہیں کا دیا ہوا ہے اگر وہ چھین لیں تو میں کیا کروں گا۔ یہ فکر جس کو دامن گیر ہو گا اس کا اخلاص بھی کار آمد ہو گا۔ اس کا عمل بھی کار آمد ہو گا۔ اور اس کا علم بھی کار آمد ہو گا۔

## روحانیت کے اربعہ عناصر

اب انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے۔ ایک علم صحیح و علم نافع، ایک عمل صحیح و عمل صالح، ایک اخلاص کامل اور فکر سلیم۔۔۔ یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔۔۔ جس میں علم کی بجائے جہالت ہو۔ کہیں گے یہ حیوان ہے۔۔۔ علم ہو، مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے۔ گردن زدنی ہے۔۔۔ عمل ہے مگر منافق ہے، مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔۔۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکر ہے تو کہیں گے نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو، عمل بھی ہو، اخلاص بھی ہو اور اور آخرت کی فکر صحیح بھی ہو، کہا جائے گا، یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جا سکے اور کہا جا سکے کہ "یہ انسان ہے"۔۔۔ یہ انسانیت کے چار اجزاء نکلے۔ جیسے اس کے بدن کے چار اجزاء تھے، آگ، پانی، ہوا، مٹی ان چار سے مل کر بدن بنتا تھا۔ اس طرح سے انسانیت کے چار جوہر ہیں۔ علم نافع، عمل صالح، اخلاص کامل، اور فکر صحیح۔ یہ چار چیزیں اگر ہیں تو کہا جائے گا، انسان ہے، ورنہ کہا جائے گا کہ حیوان ہے، یا انسان نما حیوان ہے۔

## کمال علم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

بس جب یہ چار چیزیں معلوم ہو گئیں اور یہ انسانیت کا معیار ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے جانچا جائے تو سب سے زیادہ کامل اس معیار سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نکلتے ہیں کہ جن کا فقط علم نافع نہیں بلکہ علم قطعی ہے۔ جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم نہیں بلکہ ان کے علم سے کتابیں بنتی ہیں وہ براہ راست اللہ کے سرچشمے سے علم لیتے ہیں۔ وحی کا علم ان کے اوپر آتا ہے جو لازوال دولت ہے۔ جو قطعی دولت ہے۔ جس میں نہ شک کی آمیزش ہے، نہ جہل و تردد کی آمیزش ہے۔ نہ شبہات و خیالات کی آمیزش ہے۔ خالص علم جو چشمہ وحی سے ہے۔ وہ علم کامل اور علم قطعی ان کے قلوب مبارکہ پر ڈالا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ:۔

وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ

یہ قرآن کریم۔۔۔؟ یہ اللہ کی نازل کردہ چیز ہے۔اسے پیغمبر! یہ تمہاری بنائی ہوئی چیز نہیں ہے۔انسانوں نے بیٹھ کر نہیں بنائی یہ کسی پارلیمنٹ کا ریزولیشن نہیں ہے۔یہ کسی کمیٹی کی تجویز اور مشروعات میں سے نہیں ہے۔

لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

"یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے"۔

اور نازل کرنے والا اللہ۔۔۔؟ اور کس کے ذریعے سے۔۔۔؟

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ

روح الامین اس کو لے کر آئے جس میں خیانت کا کوئی ادنی جذبہ نہیں۔بلکہ کامل امانت دار فرشتہ جس کی شان ہی امین ہے۔وہ اس کو لے کر آیا ہے

عَلٰی قَلْبِكَ۔ محمد ﷺ کے قلب مبارک پر لاکر اتارا۔ جس قلب کے اندر غیر اللہ کے لئے گنجائش ہی نہیں تھی، فقط ایک اللہ کے لئے وہ قلب مستعد تھا تو اس قلب صافی کے اوپر جبریل امین لے کر آئے، اور نازل کرنے والا اللہ ہے۔۔۔اور کیا لے کر آئے۔۔۔؟ کلام خداوندی اور صفت خداوندی لے کر آئے، اللہ کی ایک صفت لے کر آئے جو اس "عبدپاک" کے قلب پر ڈال دی گئی۔وہ صفت خداوندی سے متصف ہو گیا۔ اور وہ کمال خداوندی سے مکمل بن گیا اور وصف الٰہی سے موصوف بناء اس پاک قلب کے اوپر یہ پاک چیز نازل کی گئی کہ اس علم کے اندر نہ شبہ کی گنجائش، نہ شک کی گنجائش۔نہ وہم کی آمیزش، نہ خیالات کی آمیزش تو علم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قطعی اور اس کی کثرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اوتیت علم الاولین والاخرین اگلے اور پچھلے سارے علوم ایک قلب مبارک میں جمع کر دیئے گئے۔ تو کمیت دیکھیں تو اتنی بڑی کہ عالم کے تمام علوم کا سر چشمہ قلب مبارک کو بنایا گیا۔ کیفیت کو دیکھا جائے تو اتنی قطعی کہ شبہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں۔ تو جس کا علم اتنا کامل ہو کہ نہ کیفاً اس میں نقص کی گنجائش نہ کماً اس میں نقص کی گنجائش، نہ عدد کے لحاظ سے کمی، نہ کیفیت کے لحاظ سے کمی، تو اس سے بڑھ کر عالم کون ہوگا۔

اس واسطے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ مخلوقات کے اندر نبی کریم ﷺ سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ آپ ﷺ اعلم الخلائق اور اعلم البشر ہیں۔ سارے انسانوں میں، سارے ملائکہ میں سب سے زیادہ علم آپ ﷺ کو دیا گیا، آپ کے علم کے مقابلہ میں ساری کائنات کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ۔۔۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ کے علم کے مقابلہ میں آپ کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ، اس لئے کہ جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔وہی فرق خالق اور مخلوق کی صفت میں ہو سکتا ہے۔وہی فرق خالق و مخلوق کے علم میں ہو سکتا ہے۔۔۔لیکن مخلوق،

مخلوق کو جب نسبت دی جائے تو نہ انبیاء علیہم السلام میں نہ ملائکہ میں' نہ اولیاء میں کسی کے اندر کوئی اتنا بڑا علم نہیں۔ سب کے علوم کو جمع کیا جائے تو ایک ذات واحد امین بنی ہوئی ہے۔ تو جو اتنا بڑا عالم ہو۔ تو ظاہر بات ہے کہ **الناس کلھم ھالکون الا العالمون**

سارے انسان تباہ و برباد ہیں اور علماء بچیں گے۔۔ تو علماء کے اندر اتنا عالم ہو کہ کائنات میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ ہو۔ تو اس سے زیادہ درجہ نجات کا اور کسے مل سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر کمالات اور فوز و فلاح کا درجہ اور کس کے لئے ہو سکتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر کس کی سیرت اور مقدس ہو سکتی ہے تو سیرت کا ابتدائی جز جو علم کامل تھا' وہ اتنا ہے کہ عالم میں اس کی نظیر کوئی نہیں۔ سیرت بھی ایسی ہو گی کہ عالم میں اس سیرت کی نظیر کوئی نہیں۔

سارے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو دیکھو تو سیرت محمدی کے مقابلے میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی' سارے انبیاء اور اولیاء کے اخلاق دیکھو تو نبی کریم ﷺ کے خلق عظیم کے سامنے کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔

### کمال عمل نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

سارے کاملین کے اعمال صالحہ کو دیکھو' آپؐ کے عمل صالح کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں معلوم ہو گی۔۔۔ امت کا عقیدہ یہ ہے اور صحیح عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ایک سجدہ ساری امت کی لاکھوں برس کی عبادات سے زیادہ ہے۔

وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی صورت کو نہیں دیکھتے عمل کی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ جس عمل کے اندر اخلاص کامل اور معرفت کامل ہو' وہی عمل وزن دار ہوتا ہے تو آپؐ سے زیادہ اخلاص والا کون ہے۔۔۔؟ آپؐ سے زیادہ عارف باللہ کون ہے؟ آپؐ سے زیادہ حسن نیت رکھنے والا کون ہے؟ کہ جن کی جوتیوں کی نسبت سے لاکھوں مخلص بن گئے' کروڑوں اخلاص والے بن گئے' جن کی جوتیوں کے طفیل سے حسن نیت کے پہچاننے والے پیدا ہوئے کہ نیت کہتے کسے ہیں؟ حسن نیت کے معنی کیا ہیں؟ تو جس ذات بابرکات میں اخلاص وہ ہو جس کی نظیر نہ ہو' اس کے عمل میں جتنا وزن ہو گا' اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے ایک سجدے میں اتنا وزن ہو گا کہ عالم کے سارے سجدوں میں اتنا وزن نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے ایک سجدہ عالم کے سجدوں سے بڑھ کر ہو گا' تو سب سے بڑا علم' آپ کی ذات بابرکات میں ہے۔ تو یہ سیرت کا ایک عنصر ہوا۔

### معیار اعمال

دوسرا عنصر۔۔۔؟ وہ عمل صالح ہے ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ کے عمل صالح سے بڑھ کر کس کا عمل صالح ہو سکتا ہے۔ جو عمل کا معیار ہے' اور اسوہ اور کسوٹی

ہے۔ عامل کے عمل کو پہچاننے کی کسوٹی حضور ﷺ کا عمل ہے کہ اس کے مطابق ہے تو عمل مقبول ورنہ مردود۔۔۔ غرض جس کا عمل معیار اور کسوٹی ہو، جس سے عمل کو پرکھ پرکھ کر عمل کو ناقص اور کامل کہہ سکیں، تو جس عمل کی حقیقت یہ ہے تو حقیقی معنی میں عمل وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عمل، عمل نہیں، اس لئے کہ وہ عمل دوسرے اعمال کو بنانے والا ہے۔ وہ عمل نہ ہو تو دوسروں کے عمل ہی نہ بنیں۔ تو جو عملوں کا سرچشمہ اور تخم ہو کہ جس سے اعمال سرزد ہو رہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل کی عظمت اور قدر و قیمت کتنی ہو گی۔ تو علم تو یہ کہ اولین و آخرین کے جامع ہوں اور عمل یہ کہ سب کے اعمال کا سرچشمہ ہوں۔ اگر اس عمل پر منطبق ہیں تو وہ عمل ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے سیرت کا دوسرا جوہر وہ عمل پاک ہے۔۔۔ اس عمل کے بارے میں یہی کہا جائے گا اور یہی عقیدہ رکھا جائے گا اور یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ اگر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو امت کے لاکھوں برس کے عملوں سے بھی وہ عمل اونچا ہے۔

## امر حقیقت

اور۔۔۔ عیاذاً باللہ!۔۔۔ یہ محض کوئی شاعریت نہیں ہے۔ یا معاذ اللہ! محض حسن عقیدت سے نہیں کہا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ امر حقیقت ہے۔

حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جانچنے کا ارادہ کیا کہ آپؐ کی گھریلو زندگی کیا ہے؟۔۔۔ تو تین آدمی آئے، آپؐ بیت نبوت میں موجود نہیں تھے۔۔۔ بعض ازواج مطہراتؓ سے انہوں نے پوچھا کہ حضور اقدس ﷺ کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ گھر میں آپ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور نماز میں مشغول رہتے ہوں گے۔۔۔ تو پوچھا کہ آپؐ کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جواب میں یہ کہا گیا کہ جیسے گھر ہستیوں کی زندگی ہوتی ہے وہی آپ کی زندگی ہے۔ آپؐ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ موقع اور ضرورت ہوتی ہے تو گھر میں جھاڑو بھی دے لیتے ہیں' برتنوں کو مانجھ بھی لیتے ہیں۔ آپؐ اپنا جوتا بھی گانٹھ لیتے ہیں کپڑا پھٹ جاتا ہے تو بیٹھ کر سی بھی لیتے ہیں۔ ازواج مطہرات سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزاح بھی فرما لیتے ہیں۔ کبھی ازواج مطہراتؓ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی کہانی سنا دو' کوئی قصہ سنا دو۔ تو جیسے گھر ہستیوں کی حالت ہوتی ہے۔ ویسی آپ کی حالت ہے۔۔۔ تو سن کر کانهم تقالوها.

ان تینوں صاحبوں نے اس عمل کو کم سمجھا کہ حضور ﷺ کا یہ عمل کم ہے۔۔۔ مگر اپنی طرف سے عذر یہ بیان کیا کہ حضور کی ذات مبارک تو وہ ہے کہ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی ذلتیں

پہلے ہی معاف کر دی ہیں۔ اس لئے اگر آپ بالکل ہی عمل نہ کریں تب بھی آپ مقامات میں سب سے اونچے ہیں اور جنتوں میں سب سے اونچے ہیں۔۔۔ مگر یہ عمل کم ہے۔۔۔ یہ وہ سمجھے گویا عذر یہ بیان کر دیا' اگر آپ اتنا بھی عمل نہ کریں تب بھی آپ کے مراتب میں فرق نہیں آسکتا۔۔۔ اس کے بعد تینوں نے باہم ایک دوسرے کے سامنے عہد کیا۔ اور کہا کہ یہ عمل تو کم ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب ہم اپنی گھریلو زندگی کیسے بنائیں تو ایک نے کہا کہ اما انا فاصلی اللیل ابدًا ۔۔۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اب عمر بھر کبھی نہیں سوؤں گا۔ اور پوری رات نماز کے اندر مشغول رہوں گا۔

دوسرے نے کہا

انا اصوم النهار ابدًا ولا افطر

"میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی بھی افطار نہیں کروں گا"۔

تیسرے نے کہا

انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدًا

"میں عہد کرتا ہوں کہ عورتوں سے دور ہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا"۔

تو یہ ان تینوں نے باہمی عہد و پیمان کیا۔ ہمیشہ قیام وصیام اس شخص کی نسبت جو رات کو سوتا بھی ہو اور قیام بھی کرتا ہو' دن کو روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہو بظاہر اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد جو ذمہ داریاں اور بیوی بچوں کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں اور عبادت کے لئے موانع پیش آتے ہیں تو اس جذبے سے ترک نکاح کرنا کہ ہمیشہ عبادت کرتا رہوں اور بیوی بچے مخل نہ ہوں' اس شخص کی نسبت جو بیوی بچوں کے مشاغل کے ساتھ عبادت کرتا ہو۔ اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ گویا مخلوق کے ساتھ تعلق کا کوئی درجہ نہیں' حق تعالیٰ شانہ' کے ساتھ ہی تعلق محض ہے۔

تو ترک تعلقات اور عدد کے لحاظ سے یہ عبادات گویا اونچے درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور استفسار فرمایا

انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله انى لاخشاكم واتقاكم له

تم لوگوں نے ایسی ایسی گفتگو کی ہے۔

خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں' تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں تم میں سب سے زیادہ خوف و خشیت والا ہوں۔۔۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ تم لوگوں نے عبادت کے معنی غلط سمجھے' رات بھر نماز پڑھو تو یہ عبادت ہے' دن بھر روزے رکھے جائیں تو یہ عبادت ہے' بیوی اور نکاح چھوڑ دیں تو یہ عبادت ہے۔۔۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی

کے احکام کے نیچے گزرے، یہ عبادت ہے۔ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے، گھر میں بیوی سے معاملہ کرنا بھی عبادت ہے۔ تہجد پڑھنا بھی عبادت ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ جو حق تعالیٰ شانہ، نے زندگی بنائی ہے اس زندگی کو اللہ کے احکام کے نیچے جاری رکھنا یہ فی الحقیقت حقیقی عبادت ہے اس لئے فرمایا کہ

فان لجسدك عليك حقاً وان لاهلك عليك حقاً. وان لعينك عليك حقاً فصم و نم وقم

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ تم پر تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تو تم جاگ کر اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کا حق ادا ہو، اور تم رات کو سو بھی جاؤ تا کہ نفس کا حق ادا ہو، تم جہاد بھی کرو، تا کہ اللہ کا حق ادا ہو۔ اور تھوڑی دیر اس سے ہٹ کر اہل وعیال میں رہو تا کہ بیوی بچوں کا بھی حق ادا ہو۔۔۔ تو تم سوؤ بھی، جاگو بھی، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو۔ یہ سارے کام کرو تو کہا جائے گا کہ تم نے عبادت کی۔۔۔ تو عبادت کو تم نے فقط نماز اور روزے میں محدود کر دیا۔ اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تحت گزارنے کو عبادت کہتے ہیں۔۔۔ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ اس زندگی کو گزارنے والا کوئی اور نہیں۔

## کمال اخلاص نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس موقع پر آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا ہوں، اس لئے میرا اجر زیادہ ہے اور میں تم سب سے زیادہ روزے رکھنے والا ہوں۔۔۔ بلکہ اگر گنا جائے اور شمار کیا جائے تو شاید حضور علیہ السلام کی نماز کی تعداد سے امتیوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ دن بھر رات بھر یہی کرتے رہے۔ تو "عبادت کا عدد" نہیں پیش کیا۔ فرمایا

انی اخشاکم باللہ و اتقاکم للہ

میرے اندر اللہ کا خوف تم سب سے زیادہ ہے، تقویٰ تم سب سے زیادہ ہے۔ تو آپ نے عمل کی روح پیش کی کہ اس کامل تقویٰ اور خوف وخشیت کے ساتھ ایک سجدہ بھی ہوگا تو وہ تم سب کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت شمار ہوگا، گویا عبادت کی اصل بنیاد وہ اخلاص للہ ہے۔ وہ خشیت للہ ہے۔ وہ تقویٰ باطن ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ سے ڈرے۔۔۔ اس تقویٰ باطن کے ساتھ جو عبادت ہوگی وہ اکمل ترین عبادت ہوگی۔۔۔ غرض جہاں حضور علیہ السلام کا علم کامل اور جامع ہے کہ اولین وآخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپؐ کا عمل کامل ہے۔ وہیں آپؐ کا تقویٰ اور اخلاص بھی اتنا کامل ہے کہ ساری امتوں کا اخلاص مل کر بھی وہ اخلاص نہیں ہو سکتا جو اللہ نے آپ کو اخلاص عطاء کیا ہے۔۔۔ اس لئے کہ جو قلب مبارک آپؐ کو دیا گیا وہ قلب کسی اور کو عطاء نہیں کیا گیا، جو جسد مبارک اور روح پر فتوح آپ کو دی گئی وہ روح اور جسم کسی اور دوسرے کو نہیں دیا گیا، تو اس ظرف میں

جو چیزیں بھریں وہ آپؐ ہی کے ظرف میں بھر سکتی تھیں۔ دوسرے ظروف میں نہیں آسکتی تھیں۔۔۔۔ غرض علم و عمل بھی انتہائی کامل اخلاص للہ بھی انتہائی کامل۔

## کمال فکر نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اور آگے رہ گیا۔۔۔ فکر۔۔۔ کہ آخرت سے ڈرنا اور مطمئن نہ ہونا۔ اس کا عالم یہ ہے کہ حدیث آپؐ فرماتے ہیں۔

"نماز پڑھ کر جب میں ایک سلام پھیرتا ہوں تو مجھے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دوسرے سلام کا مجھے موقع ملے گا یا نہیں ملے گا"۔

اس درجہ گویا آپ خطرہ اور خوف آخرت محسوس فرماتے تھے اور اپنی موت کی یادگاری اور تذکر، یہ اس درجہ پر ہے کہ فرماتے ہیں۔ ایک سلام پھیر کر دوسرے کی توقع نہیں ہوتی۔ یہ آپؐ کے فکر آخرت کی حالت ہے۔

حدیث میں ہے کہ

کان دائم الفکرۃ حزینا

آپؐ اکثر اوقات دائم الفکر رہتے، جیسے کوئی فکر مند بیٹھا ہو، کوئی غمگین بیٹھا ہو اور حزن و غم میں ہو، وہ فکر آخرت تھا، ہمہ وقت آخرت پیش نظر تھی، تو یہ انبیاء علیہم السلام ہی کو کمال دیا گیا ہے کہ ساری دنیا والوں کے حقوق ادا کریں اور فکر آخرت بدستور قائم رہے۔ آپؐ گھر میں تشریف لاتے ہیں، بیوی بچوں سے بھی معاملہ ہے۔ صحابہؓ سے بھی معاملہ ہے، حکومت کے فیصلے بھی آپ انجام دے رہے ہیں، فصل خصومات اور جہاد بھی ہو رہے ہیں، غنائم بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔ مگر "فکر آخرت" ہمہ وقت بدستور ہے، بلکہ سارے اعمال کا وہی منشاء ہے اسی سے یہ سارے اعمال انجام پا رہے ہیں تو آپؐ سے زیادہ متفکر کون ہے؟

## روح ایمان

اسی کو آپؐ نے فرمایا کہ ایمان در حقیقت "خوف اور رجاء" کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی نہ محض ڈرنے کا نام ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے۔ بلکہ یہ دونوں کیفیتیں جمع رہیں۔ امید بھی بندھی ہوئی ہو اور خطرہ بھی لگا ہوا ہو، تو فکر پیدا ہو جائے گا۔ یہی فی الحقیقت ایمان کی روح ہے۔

قرآن کریم میں دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

لَاتَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَايَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

"اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے والے کفار ہیں"۔

اس میں امید بتلائی گئی کہ تم میں اللہ سے امید نہیں ہو گی۔ تو تم میں ایمان موجود نہیں۔ یہ کفار کا کام ہے کہ اللہ سے ناامید ہو جائیں غرض اس میں رجا بتلائی گئی۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا:-

فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ

”اللہ کی خفیہ تدبیر سے مطمئن بیٹھنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے“۔

تو مطلب یہ کہ مطمئن ہو کر مت بیٹھو، خوف اور فکر لگا رہے، تو اس میں گویا خوف بتلایا گیا۔۔۔ غرض پہلی آیت سے امید بتلائی گئی۔ دوسری آیت سے خوف بتلایا گیا اور خوف اور امید کے بیچ میں ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ محض ڈرتے رہنے کا نام ایمان ہے۔

## فکر عظیم

عمل جب بھی کرے گا وہی کرے گا، جسے امید بھی لگی ہوئی ہو۔ خطرہ بھی لگا ہوا ہو۔ جو محض امید میں غرق ہے وہ خادم کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ محض خوف زدہ خادم ہو وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا جس کو ہر وقت آقا سے امید ہے کہ چاہے برا کروں چاہے بھلا کروں، چاہے ہزار دم گناہ کر لوں مگر بخشش ہی ہو جائے گی۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سوچے گا کہ پھر عمل کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آقا اتنا کریم ہے کہ بخش ہی دے گا، پھر میں خواہ مخواہ کیوں محنت اٹھاؤں، بخشا تو جاؤں گا۔ تو وہ عمل سے معطل ہو جائے گا، جس نے فقط امید باندھی۔

اور جسے ہر وقت خوف ہی خوف لگا ہوا ہو کہ کچھ ہی محنت کر لوں مگر جوتیاں ہی پڑیں گی، کچھ ہی محنت کر لو مگر پٹائی ہو گی، وہ کہے گا پھر عمل کی کیا مصیبت۔۔۔؟ جب اول بھی جہنم اور آخر بھی جہنم تو کیوں خواہ مخواہ محنت اٹھائی۔۔۔ وہ بھی عمل سے معطل ہو جائے گا، تو خوف محض میں رہنے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ اور امید محض میں غرق ہونے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کون کرے گا۔۔۔؟

ایک طرف امید لگی ہوئی ہے کہ نیک کام کئے تو اجر ملے گا، اور ثواب ملے گا۔ ایک طرف خوف لگا ہوا ہے کہ اگر ذرا معصیت کی تو جہنم بھی تیار ہے۔ تو ”امید و بیم“ کے مجموعے سے انسان کے عمل کی گاڑی چلتی ہے۔ یہ دو بازو ہیں۔ ان دو بازوؤں سے عمل اڑتا ہے۔ تو ایمان خوف اور جا کے مجموعے کا نام ہے کہ اللہ سے امید بھی بندھی ہوئی ہو اور ڈر بھی لگا ہوا ہو۔ اس لئے محض ڈر بھی ایمان نہیں اور محض امید باندھنا بھی ایمان نہیں۔۔۔ ان دونوں کے بیچ میں رہنا یہی ”تفکر“ کہلاتا ہے۔ یہی فکر عظیم کہلاتا ہے کہ ممکن ہے کہ میرا عمل صحیح نہ ہو گرفت ہو جائے اور ممکن ہے کہ یہ گناہ بخشا جائے۔ میں توبہ کیوں نہ کر لوں، مالک میرا رحیم و کریم ہے، تو اللہ کی رحمت پر بھی نظر ہو اور اس کے جبر و قہر بھی نظر ہو۔ اس پر بھی نظر ہو کہ-

نَبِّیءْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

اور اس پر بھی نظر ہو کہ ۔

وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَالْعَذَابُ الْاَلِیْمُ

اے پیغمبر! میرے بندوں کو اطلاع کر دو کہ میں بہت بڑا غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی بہت بڑا سخت عذاب ہے۔ ایسا عذاب کوئی دوسرا نہیں دے سکتا جیسا میں دے سکتا ہوں۔۔۔ تو دونوں شانیں بتلائی گئیں کہ رحمت کا طالب بنایا اور عذاب سے ڈرنے والا بنایا۔ تو دونوں باتیں ایک حالت میں انسان میں مطلوب ہیں۔ اسی کا نام ایمان رکھا گیا ہے تو فکر کامل ہو گا تو ایمان کامل ہو گا تو نبی کریم ﷺ کے فکر کو دیکھا جائے۔ تو فرمایا گیا کہ ۔

کان دائم الفکرة حزیناً

آپ دوامی طور پر ہمیشہ چوبیس گھنٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں غرق اور مستغرق ہیں۔ تو آپؐ سید المتفکرین ہیں، سید المفکرین ہیں۔ عالم میں اتنا فکر کسی کو نہیں دیا گیا جتنا آپ کو دیا گیا۔۔۔ اتنا بڑا اخلاص کسی میں نہیں تھا جو آپ کو دیا گیا، اتنا بڑا عمل صالح کسی میں نہیں تھا جو آپ کو دیا گیا۔ اتنا بڑا علم نافع اور کامل کسی میں نہیں تھا جتنا آپ کو دیا گیا۔

جب انسانیت کی سیرت ان چار جزوں سے بنتی ہے تو جس انسان میں یہ چار جز علی وجہ الاتم موجود ہوں گے، اس کی سیرت بھی "اکمل السیر" ہو گی، اس کی سیرت سب سے اونچے درجے کی سیرت ہو گی کہ کوئی سیرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، کوئی سیرت اس کے پاس نہیں پھٹک سکے گی

### دستور زندگی

اس سیرت کے جو لوگ مخاطب بنائے گئے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں وہ دنیا کے سارے انسان ہیں جن کے سامنے یہ سیرت پیش کی گئی ہے اور اس لئے پیش کی گئی کہ اس سیرت کو کسوٹی بنا کر ہم اپنی سیرتوں کو اس کے اوپر پرکھیں کہ اس سیرت پاک سے کس حد تک ہماری عادات اور خصائل مطابقت کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں اور منحرف ہیں۔

غرض سیرت کا بیان اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ کوئی کہانی ہے کہ اسے سنا دیا جائے، یہ کوئی قصہ ہے کہ اسے پڑھ کر پیش کر دیا جائے یہ تو ایک معیار اور دستور زندگی ہے۔ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ گھر جا کر ہر شخص اپنی زندگی کو اس سیرت کے اوپر پیش کرے۔ آیا میرے اندر علم نافع ہے یا نہیں؟ جس سے میں حق و باطل میں امتیاز کر سکوں، آیا میرے اندر عمل صالح ہے یا نہیں؟ جو میرے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔ آیا میرے اندر اخلاص ہے؟ نفاق تو نہیں ہے کہ میرا عمل قابل قبول ہو سکے اور آیا میرے اندر فکر موجود ہے؟ یا میں بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں، میری کیفیت کیا ہے؟ انہی کیفیات کو جانچنے کے لئے سیرت مقدسہ کسوٹی سے ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

## کتاب وسنت کی چٹان

قرآن کریم آپ کے سامنے اصول پیش کرتا ہے۔یہ تو علم ہے اور ذات محمدی (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کردار پیش کرتی ہے کہ یہ کسوٹی اور معیار کردار ہے۔اس پر اپنے عمل کو پرکھو' تو عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں ؟اور عمل کو ذات محمدی (علی صاحبہاالی الف تحیۃ وسلام) کے اسوۂ حسنہ کے اوپر پرکھو کہ کس حد تک عمل مطابقت کھاتا ہے ؟کس حد تک نہیں ؟

اسی کو آپؐ فرماتے ہیں ؂

**ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابدًا ان تمسکتم بھما**

''میں دووزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔اگر تم ان سے تمسک کرتے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے' کبھی راستے سے نہیں بھٹک سکوگے''۔

وہ دو چیزیں کیا ہیں ؟

**کتاب اللہ وسنتی**

''اللہ کی کتاب اور میری سنت اور طریقہ کار''۔

ان دو چیزوں کو آپؐ نے ثقلین وزنی چیزیں فرمایا۔یعنی بھاری چیزیں۔۔۔یہ اس لئے فرمایا کہ ؟

جب فتنوں کے طوفان آتے ہیں اور فتنوں کا' فسق کا کفر کا' فجور کا' اور منکرات کا دریا چڑھتا ہے' اس وقت اگر آپ نے کسی تنکے سے تمسک کیا تو طوفانوں میں تنکا بہہ جائے گا اور آپ بھی بہہ جائیں گے۔اگر جان بچانے کے لئے کسی شہتیر کو پکڑا تو طوفان میں شہتیر نہیں ٹھہرا کرتے۔وہ بھی بہہ جائیں گے' آپ بھی بہہ جائیں گے' اسی طرح اگر آپ نے کسی درخت سے تمسک کیا تو درخت کو طوفان جڑ سے اکھاڑ کرلے جائے گا' وہ بھی بہے گا' آپ بھی بہہ جائیں گے۔۔۔لیکن اگر آپ کسی ایسی چٹان کو پکڑلیں جو عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو کہ لاکھ طوفان آئیں مگر اس کو ہلا نہ سکیں' تو نہ چٹان ہل سکے گی نہ آپ بہیں گے' طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔۔۔تو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کو ثقلین فرمایا۔یعنی اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ کتنے ہی بڑے فتنوں کے اور گمراہیوں کے جھکڑ چلیں لیکن کتاب وسنت کی چٹان کو جس نے پکڑ رکھا ہے' وہ کبھی اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے' اس کے علاوہ جس چیز سے بھی تمسک کروگے' ہر چیز بہنے والی ہے۔اتنی قوی نہیں ہے' وہ بھی بہے گی اور آپ بھی بہیں گے' تو ایک طرف قرآن کریم کو رکھا اور ایک طرف سنت کو رکھا' جس کے معنی سیرت محمدیؐ اور اسوہ حسنہ کے ہیں تو حدیث اسوہ حسنہ کو پیش کرتی ہے اور قرآن کریم علم کو پیش کرتا ہے۔تو قرآن کریم پر اپنے فکر کو جانچو کہ عقائد صحیح ہیں یا نہیں۔۔؟اور عمل کو نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر جانچو' جس حد تک مطابق کھاجائے' سمجھو کہ حق ہے' جس حد تک انحراف کرے' سمجھو کہ غلط ہے' دیوار پر مارنے کے قابل ہے' ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

**اسوۂ صحابہ** آپ نے اس میں اور زیادہ سہولت پیدا فرمادی۔ اور وہ یہ کہ آپ کی ذات بابرکات تو معیار اور کسوٹی ہے ہی۔ اس پر علم وعقیدہ اور عمل کو پرکھا جائے' آپ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہؓ کو بھی شامل کر لیا کہ وہ بھی معیار اور کسوٹی ہیں۔ اگر آپ اپنے علم وعمل کو ان کے اوپر پرکھو گے تو بھی حق وباطل کا پتہ چل جائے گا۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتی زندگی تو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہر کس وناکس کا پہنچنا تو بجائے خود ہے اس کی بلندی کو نگاہ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتا۔۔۔ لیکن صحابہ کرامؓ کے اندر ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں زراعت کرنے والے بھی ہیں' فقہاء بھی ہیں' علماء بھی ہیں' حکماء بھی ہیں' گھر میں بیٹھنے والے بھی ہیں' خلوت پسند بھی ہیں' جلوت پسند بھی ہیں' مجاہد بھی ہیں' مجاہدہ پسند بھی ہیں۔ ہر نمونہ موجود ہے۔ تو فرمایا کہ میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں' جس کی روشنی میں چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

بایھم اقتدیتم اھتدیتم

تو واضح فرمادیا کہ میری ذات تو ہے ہی معیار' میرے صحابہؓ بھی تمہارے علم وعمل کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی ہیں۔۔۔ یعنی بالذات تو میں معیار ہوں' لیکن جسے میں معیار بتلادوں وہ بھی معیار ہے۔ تو آپ نے اپنے صحابہؓ کو معیار بتلایا۔

**معیار صحابہؓ** حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ۔

یہود ونصاریٰ میں بہتر فرقے ہوئے' اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔

کلھافی النار الا واحدۃ

سب کے سب ہلاکت میں پڑنے والے ہوں گے حقیقت معنی ایک نجات پائے گا۔۔۔ یعنی آخرت میں اعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو سزا مل جائیگی۔۔۔ گو وہ انجام کار چھٹکارا پالیں گے لیکن عقائد کی وجہ سے جن کو ہلاکت نصیب ہوگی وہ بہتر فرقے ہوں گے تہتر واں فرقہ وہ ہے کہ عقائد کی وجہ سے اس پر کوئی وبال نہیں ہوگا' کوئی عملی خرابی یا کھوٹ ہوا تو معاف کردیں گے ؟ یا سزا دے دیں گے۔۔۔ تو فرمایا۔

کلھا فی النار الا واحدۃ

"یہ سب کے سب ناری ہوں گے' ایک ناجی ہوگا"۔

اس پر صحابہؓ نے عرض کیا۔

یارسول اللہ! وہ ناجی فرقہ کونسا ہے ؟

آپ نے فرمایا۔

ماانا علیہ الیوم واصحابی

"آج کے دن جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں"۔

یہی فی الحقیقت معیار ہے۔۔۔ تو اپنی ذات کو پیش کیا اور اپنے صحابہؓ کو پیش کیا۔۔۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ میرے صحابہؓ اور میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔ میرے عمل کی نوعیت میں اور میرے صحابہؓ کے عمل کی نوعیت میں فرق نہیں، جو میرا عمل ہے۔ جو میرا فکر ہے وہ ان کا فکر ہے، جو میرے مقاصد ہیں وہ ان کے مقاصد ہیں۔ اپنی نوعیت میں اپنے صحابہؓ کو شریک کیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پرکھنے کے لئے ایک میں معیار ہوں اور صحابہؓ معیار ہیں۔ ان پر تم اپنے آپ کو پیش کرو، جس حد تک مطابقت کھا جائے سمجھو کہ حق پر ہے۔ جس حد تک منحرف ہو جاؤ' اس کی اصلاح کرو۔ سمجھو کہ یہ تمہارے اندر باطل ہے اور ناحق کی بات ہے۔ تو صحابہؓ کو کسوٹی بتایا۔

**طبقہ صحابہؓ کی تقدیس** | گویا کسی طبقے کو من حیث الطبقہ آپ نے بجز صحابہؓ کے مقدس نہیں بتلایا۔

امت کے اندر۔۔۔ افراد آئیں گے جو کامل اور مکمل ہوں گے۔ مگر طبقہ کا طبقہ مقدس ہو۔ اس میں سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ صرف صحابہؓ کا معیار ہے، تو جب یہ معیار قرار پا گیا تو آپ دیکھ لیجئے کہ صحابہؓ معیار بن گئے۔

جس شخص کے اندر صحابہؓ کی عظمت اور محبت دیکھیں سمجھو کہ حق پر ہے۔ اگر محبت نہیں انہیں سب و شتم کرتا ہے یا انہیں گالم گلوچ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ناحق ہے وہ حقانی نہیں کہلائے گا۔

اگر صحابہؓ کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ سب کے سب متقی پارسا اور پاکباز ہیں' ان کی نیتیں صادق ہیں۔ ان کے قلوب کا رخ سچا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور جو طبقہ یہ کہے گا کہ معاذ اللہ ان میں تو منافق بھی تھے۔۔۔ ان میں تو غلط کار بھی تھے۔ انہیں گالم گلوچ کرے، سمجھ لیجئے کہ وہ ناحق پر ہے۔ گویا ایک سیدھا سادہ معیار حضور ﷺ نے فرقوں کے حق و باطل ہونے کے بارے میں بتلا یا دیا۔ تو سب و شتم کرے، وہ بھی ناحق جو قتل صحابہؓ کے در پے ہو وہ بھی ناحق جو یوں کہے کہ ہم معیار ہیں، صحابہؓ معیار نہیں ہیں۔ ہم ان پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں وہ ہم پر نہیں کر سکتے۔ سمجھو کہ بطلان کی بات ہے۔ کوئی حقانیت کی بات نہیں ہے۔۔۔ غرض ایک سیدھا سا معیار فرقوں کے حق و باطل اور خطا و صواب کے پہچاننے کا بتلا دیا کہ مجھے دیکھ لو۔ اور میرے صحابہؓ کو دیکھ لو۔

**اعلان رضا** | بہر حال قرآن کریم نے جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صحابہؓ کا طبقہ ہے۔ فرمایا کہ ۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"وہ مہاجرین وانصار --- اور بعد میں جو مہاجرین وانصار میں ملتے رہے، وہ سب کے سب --- کون ہیں؟"۔

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی"۔

مشترکہ اعلان رضا کیا۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا جن کے دل میں کوئی ادنیٰ کھوٹ اور ٹال ٹپک ہو، ان سے کبھی رضائے مطلق کا اعلان نہیں ہو سکتا۔

رضا کا اعلان ہے۔ اور قرآن کریم میں اعلان ہے --- اور قرآن کریم قیامت تک بلکہ آگے تک چلنے والی ایک عظیم کتاب ہے۔ گویا ابدالاباد تک یہ اعلان ہوتا رہے گا۔ تو قیامت تک بھی یہ اعلان غلط نہیں ہو سکتا، اور قیامت کے بعد بھی یہ اعلان غلط نہیں ہو سکتا، تو قرآن کریم دہراتا رہے گا کہ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اللہ ان سب مہاجرین وانصار سے راضی اور ان سے بھی جو ان میں بعد میں ملے • یعنی کل کے کل مرضی خداوندی میں ہیں ایک بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض یا ناخوش ہوں --- پہلے تو مطلق جماعت صحابہؓ سے اپنی رضا کا اعلان کیا --- اور یہ نہیں کہ اولین مہاجرین وانصار کو لے لیا ہو، بلکہ فرمایا کہ

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

جو احسان کے ساتھ بعد میں ان کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب اس اعلان رضا میں شامل ہیں۔ گویا مطلق صحابہؓ کی تقدیس ہوئی کہ وہ سب مرضی اور پسندیدہ ہیں۔

پھر طبقاتی طور پر تقدیس کی، چنانچہ ایک جگہ اصحاب حدیبیہ کے بارے میں فرمایا کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

"اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے راضی ہے جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے اے نبی! تمہارے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔"

ان کے لئے بھی رضا کا اعلان ہے۔

### اعمال صحابہؓ کی تقدیس

پھر ایک آیت میں ان کے عمل کو سراہا --- ارشاد فرمایا کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں --- اور جو ان کے ساتھ ہیں ان کی شان یہ ہے کہ ان میں کفر کے اوپر شدت ہے اور باہمی طور پر ان میں رحمت

ہے۔۔۔اور ان کا طریقہ کیا ہے؟

تم انہیں دیکھو گے، کہیں رکوع میں ہیں، کہیں سجدوں کے اندر ہیں۔ اللہ کے فضل کو جابجا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ خدا کا فضل ان کے پیش نظر ہے۔ ابتغاء وجہ اللہ اور ابتغاء مرضات اللہ یہ ان کا شیوہ ہے۔

## کمال معرفت صحابہؓ

اور اس درجہ ان میں ایمان بھر گیا اور اس درجہ ان کے قلبی مقامات پاک ہیں کہ بالکل اسی طرح جب کسی چیز سے ظرف بھر جاتا ہے تو اخیر میں چھلک پڑتا ہے تو فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس درجہ ایمان سے بھرپور ہیں کہ چھلک کر ان کے ایمان کی ان کی پیشانیوں پر علامت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کو ارشاد فرمایا۔

سِيْمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ

"سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں"۔

گویا اندرونی ایمان کی اوپر تک علامت آگئی ہے اور اندورنی کمال معرفت کی علامت اوپر چھلک پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمادیا کہ۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ

یہ قرآن ہی ان کے اوصاف کو نہیں سراہ رہا، یہی مثال ان کی تورات میں بھی ہے۔ یہی انجیل میں بھی ہے"۔

تو اولین بھی ان کی مدح کرتے آئے ہیں۔۔۔اور آخرین بھی ان کی مدح کرتے چلے جائیں گے۔۔۔ تو اللہ کے ہاں جو ممدوح، اللہ کے نیک بندوں کے ہاں ممدوح ہے، اولین و آخرین شہادت دے رہے ہیں۔ اور قیامت تک دیتے رہیں گے۔۔۔ وہ طبقہ ہے۔۔۔ تو اس طبقہ کے اندر کوئی کھوٹ تسلیم نہیں کیا جاسکتا، ورنہ یہ ساری آیتیں بے محل ہو جائیں گی، اللہ کی ساری رضا معاذ اللہ بے محل واقع ہو گی۔

## قلوب صحابہؓ کی تقدیس

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب، تھے تو ایسے ہی۔۔۔ مگر ممکن ہے بعد میں کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہوں۔۔۔ ممکن ہے بعد میں کوئی کھوٹ آگیا ہو۔۔۔؟ تو اول تو یہ غلط ہے۔۔۔ اور اس لئے غلط ہے کہ یہ قران کریم کی شہادت ہے اور قران کریم ابد الاباد تک اعلان کر رہا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا رہے گا لہٰذا یہ احتمال محض ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک موقع پر ان حضرات کے قلوب پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ محض اعمال ہی پر نہیں۔۔۔ فرمایا۔

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ

یہ وہ طبقہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کا امتحان کر چکا ہے۔ یہ امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں

میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہیں ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے۔ اور اجر عظیم بھی ہے۔۔۔ تو دو چیزیں ہیں۔ مغفرت اور اجر عظیم۔۔۔ مغفرت آخرت میں ہوگی اور اجر عظیم دنیا میں دیا جائے گا۔ تو ان کی دنیا و آخرت دونوں درست ہیں۔

**فرقہ ناجیہ**

غرض جس طبقے کی نسبت ان کے قلوب پر بھی حکم لگایا ان کے قوالب پر بھی حکم لگایا ان کے اعمال کو بھی سراہا ان کے طبقے کی بھی تقدیس بیان کی گئی وہ طبقہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پھر اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ کھوٹ کا یقین کیا جائے یا کوئی تخیل ہی باندھے۔۔۔ جب یہ معیار ہوا وہ سارے فرقے نکل جائیں گے جو قلوب میں صحابہؓ کی عظمت نہیں رکھتے جن کے قلوب میں عظمت ہوگی وہی ناجی قرار پائے گا۔۔۔ اور وہ طبقہ کون ہے۔۔۔؟ جو یوں کہتا ہے کہ ۔

الصحابة كلهم عدول

سارے صحابہؓ عدول متقی پارسا اور پاکباز ہیں۔

**خطاء اجتہادی** گو ان سے خطاء اجتہادی ممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اجتہادی طور پر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔۔۔ مگر مجتہد کو تو خطاء پر بھی اجر ملتا ہے اس کی خطا بھی مقبول ہوتی ہے۔ تو صحابہؓ میں اگر اجتہادی خطا ہو وہ ہماری طاعتوں سے بہتر ہے کہ اس پر اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ خطا اجتہادی ہے بہر حال نیت کی ان میں کوئی خرابی نہیں ہو سکتی۔

اور اگر دنیا میں ان کی کوئی تھوڑی بہت خرابی ہو کوئی معصیت یا برائی سرزد ہوئی ہو تو دل ان کا کسی برائی یا نیت کے کھوٹ سے قطعاً پاک ہے اور اگر کوئی غلطی عمل میں ہوئی اور وہ بھی دنیوی عمل میں تو اس کے بعد ان کی توبہ واستغفار پر ان کو اجر ملا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ترقی مدارج کے لئے ان سے کوئی ایسی چیز کروا دی ہو۔ غرض ایسی چیز اگر ہے تو وہ دنیا سے متعلق ہے۔

**سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدس**

لیکن جہاں تک دین کا معاملہ ہے۔ علم اور تبلیغ اور احکام و عقائد کا معاملہ ہے اس میں سب کے سب صحابہؓ مل کر متقین عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے قلوب کا اللہ امتحان لے چکا ہے۔۔۔ تو جس ذات بابرکات کے شاگرد ایسے ہوں ان کا استاد کیسا ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر پھل میٹھا ہے تو درخت قابل مدح ہے۔ اگر پھل کڑوا ہے قابل مذمت ہے۔۔۔ تو جس درخت کے یہ پھل ہیں اس درخت کا کیا حال ہوگا۔۔۔؟ جس کی شاخوں میں یہ لطف ہے ان کی اصل میں کیا لطف و کرم موجود ہوگا تو جس ذات بابرکات کی تربیت

سے صحابہؓ، صحابہؓ بنے اس ذات کی برگزیدگی اور اس کی سیرت کے تقدس کا کیا علم ہوگا، تو صحابہؓ کی سیرت کو دیکھ کر سیرت محمدی ﷺ پہچانی جا سکتی ہے۔ جس ذات بابرکات نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے تیار کر دیئے۔ یہ مربی کی کامل تربیت کی علامت ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے جیسا بنا دیا تو صحابہؓ کو آپؐ نے اپنا نمونہ بنا دیا۔۔۔ اور ایک دو نہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب افراد کا نمونہ جو مقدسین کی ایک عظیم جماعت ہے۔ جو بعد میں نبی کریم ﷺ کی قائم مقام بنی اور اس جماعت نے عالم کو علم اور دین سے بھر دیا۔۔۔ غرض جس اصل کی شاخیں ایسی، اس کی اصل کیسی۔۔۔؟ اور جس ذات کے پھل ایسے وہ درخت کیسا۔۔۔؟ اور جس استاد کے شاگرد ایسے وہ استاد کیسا۔۔۔؟ اور جس شیخ کے تربیت یافتہ ایسے مقدس، اس شیخ کے تقدس کا کیا عالم ہوگا؟

## اکمل السیر

تو نبی کریم ﷺ کی سیرت مقدسہ کو اگر انسانی اصول پر پرکھا جائے تو انسان کی سیرت کے عناصر اربعہ میں نے ذکر کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ کامل اور اکمل آپ کی سیرت نکلتی ہے۔۔۔ یہ تو اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صحابہؓ کو دیکھ لو، جب صحابہؓ کی سیرت کا تقدس ایسا ہے تو آپؐ کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہوگا؟ تو اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سیرت اکمل السیر ہے۔ اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی وہ سیرت اکمل السیر ہے۔ جب وہ سیرت ہمارے سامنے آتی ہے، اس کا مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ معیار پیش کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو پرکھ پرکھ کر اس کے اوپر جانچیں، مسلمانوں میں علم کی کمی نہیں فکر کی کمی ہے۔ علم تو ہے۔ رات دن وعظ سنتے ہیں کتابیں بھی پڑھتے ہیں رسالے بھی ان کے سامنے ہیں لیکن تفکر موجود نہیں ہے کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر غور فکر کریں اور اپنے کو اس نمونے کے اوپر پیش کریں کہ کس حد تک مطابقت ہے اور کس حد تک مطابقت نہیں۔۔۔ یہ فکر جب تک پیدا نہیں ہوگی سیرت کا سننا نہ سننا آپ کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ تو آپ محض کانوں سے سنتے ہیں۔ حالانکہ دل سے اور دماغ سے سننا چاہئے جس سننے میں دل بھی شامل ہو۔ یعنی اس طور پر آپ سیرت کو سنیں کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔ نہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کی حمد و ثناء کرتے رہیں۔ آپ نہ بھی مدح کریں وہ جب بھی واجب المدح ہیں۔۔۔ آپ ایک بھی ثناء نہ کریں وہ جب بھی معظم و مکرم ہیں۔۔۔ اس سیرت پاک کی عظمت و رفعت آپ کے عظمت کرنے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ عظمت نہ کریں وہ جب بھی باعظمت و رفعت ہیں، سوال یہ ہے کہ سیرت کو سن کر آپ نے اپنے لئے کیا کیا۔ تو آپ سیرت کا بڑا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ سبحان اللہ کہہ کر یہ کہہ دیں کہ ہمارے نبی کو اللہ نے یہ عظمت دی وہ تو باعظمت ہیں ہی۔ آپ نہ بھی کہیں جب بھی عظمت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ عظمت آپ کے سامنے کیوں لائی گئی۔۔۔؟ تا کہ آپ بھی باعظمت بنیں، آپ کے

اندر بھی خوبیاں اور کمالات پیدا ہوں' اس لئے سیرت سامنے رکھی جاتی ہے۔ یہ جذبہ ہمارے اندر مفقود ہے۔ اس لئے اپنے جانچنے کی فکر نہیں۔ تعریف کرنے کی فکر ہے۔ تو تعریف سے زیادہ اپنا جانچے' کہ خود اپنے کو پیش کریں۔ اور سیرت کے مطابق اپنے کو پرکھیں۔ اس واسطے میں نے سیرت مقدسہ کو دو پہلوؤں سے پیش کیا' ایک سیرت کی اصل کے لحاظ سے کہ انسانیت کاملہ اسی سیرت کے اندر ہے اور ایک سیرت کی فرع کے اعتبار سے کہ اس سیرت سے اخذ کر کے جو سیرتیں بنیں وہ صحابہؓ اور بعد والوں کی ہیں جو دوسروں کو مقدس بنا سکتی ہیں۔ وہ سیرت اس قابل ہے کہ اسے سامنے رکھ کر مقدس بننے کی فکر کرے' تو دونوں پہلوؤں سے سیرت کامل اور اکمل ہے۔۔۔ حق تعالیٰ شانہ' ہمیں اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنے کو پرکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کو سیرت کے مطابق بنانے کی فکر کریں۔ آمین۔

اللهم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اللهم اغفر لنا ذنوبنا و اسرافنا فى امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا على القوم الكافرين.

اللهم اغفر لنا وارحمنا. وعافنا واعف عنا. واهدنا سبل السلام واخرجنا من الظلمت

الى النور. وجنبنا الفواحش ماظهر منها و ما بطن.

اللهم و توفنا مسلمين والحقنا بالصالحين غير خزايا ولا مفتونين.

وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمدواله وصحبه اجمين

برحمتك يا ارحم الراحمين

(حررہ' ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ جمعۃ المبارک)

# ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج

ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو، اور انتظام واثرات غیروں کے غالب ہوں کہ یہ تک وہ مدونہ کریں چل نہیں سکتے اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں؟

اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں عزت اور اقتدار میں تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزق اور بے عزتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں کیوں نہیں دیا؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزت کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں؟ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے؟۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِلنَّاسِ بَشِيْرًاوَّ نَذِيْرًاوَّ دَاعِياً اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً..........اَمَّابَعْدُ........

## گزارش واقعی

بزرگان محترم!

میں اس وقت زیادہ دیر تک نہیں بول سکوں گا۔۔۔ کچھ تو اپنے ضعف کی وجہ سے اوپر کچھ یہ تقریباً ایک ہفتے سے روزانہ مسلسل تقریریں کرنی پڑیں، اتنی قوت نہیں ہے کہ روز کی تقریریں کی جاسکیں، بمبئی آنے کا میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں آکر تھکاوٹ دور کروں اور آرام کروں۔۔۔ مگر

یہاں پہنچ کر بہر حال جلسے کی تیاری ہو گئی اس لئے اس تعب اور تھکان کی بناء پر زیادہ دیر نہیں بول سکوں گا' صرف جلسہ اور اس کے اعلان کے احترام قائم رکھنے کے لئے چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

## اضطراب عام

اس جلسہ کے لئے جو دعوت نامہ پہنچا تھا اس میں یہ تھا کہ اس وقت مسلمان پریشانیوں میں مبتلا ہیں' اور مختلف قسم کے فتنے اور مختلف قسم کی پریشانیاں ان پر آ رہی ہیں' کچھ اخلاقی لائنوں سے' کچھ سیاسی لائنوں سے' کچھ اعتقادی لائنوں سے کچھ تمدنی اور معاشرتی لائنوں سے۔ غرض مختلف قسم کے فتنے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مضطرب' بے چین اور پریشان کر رکھا ہے۔۔۔ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ان پریشانیوں کو دور کرنے کا کوئی راستہ تجویز کیا جائے اور کوئی بات کہی جائے جس سے یہ پریشانیاں دور ہوں۔

یہ ہمارے قبضے میں تو نہیں ہے کہ ہم کسی پریشانی کو دور کر دیں۔ ہم اپنی ہی پریشانی دور نہیں کر سکتے ہم دوسروں کا کیا بنا سکتے ہیں۔۔۔ البتہ تدبیر بیان کی جا سکتی ہے کہ یہ تدبیر اختیار کی جائے تو فتنے ختم ہوں گے' پریشانی دور ہو گی اور دلجمعی پیدا ہو جائے گی۔

تدبیر بھی ہم خود کیا تجویز کر سکتے ہیں جو خود فتنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو وہ تدبیر کیا کرے گا۔ تدبیر وہ بتلا سکتا ہے' جو فتنوں سے بری اور بالا ہو۔۔۔ تو اس کی تدبیر حق تعالیٰ ہی سے پوچھنی چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہئے وہی ہمارے فتنوں کا رد ہو گا اور وہی فتنوں کے دفعیہ کا ذریعہ ہو گا۔

اس کے بارے میں ایک حدیث سنائے دیتا ہوں اس کا ترجمہ اور اس کی مختصر سی تشریح عرض کئے دیتا ہوں۔

## حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرما رہے ہیں۔۔۔ اور انہوں نے روایت سے پہلے واقعہ بیان کیا کہ میں اور نبی کریم ﷺ ایک سواری پر سوار تھے۔

عرب میں عامۃً یہ دستور ہے کہ ایک اونٹ پر دو سیٹیں ہوتی ہیں' اسی طرح ایک گھوڑے پر دو سیٹیں' ایک گدھے پر دو سیٹیں۔۔۔ تو زین ہی دو سیٹ کا بنایا جاتا ہے اس کے آگے پیچھے دو آدمی سوار ہو جاتے ہیں۔

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور نبی کریم ﷺ ایک ہی سواری پر سوار تھے اور میں حضور ﷺ سے اتنا قریب تھا کہ ؎

لیس بینی وبینه الا مئوخرة الراحل

میرے اور آپؐ کے درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا، صرف زین اور کجاوے کی ایک ڈنڈی بیچ میں تھی۔۔۔ گویا اگلا بیٹھنے والا تو لگام سہار کر بیٹھتا ہے اور پچھلا بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو سہار لیتا تھا تا کہ گر نہ پڑے۔۔ تو وہ زین ایسے ہی بنائے جاتے تھے کہ دو سیٹیں تھیں بیچ میں ایک ڈنڈی اس طرح سے لگاتے تھے تا کہ پیچھے بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو تھامے رہے۔ اسے موخرۃ الراحل کہتے تھے۔ گویا کجاوے کا ایک درمیانی حصہ۔۔۔ بہرحال حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ زین کی اگلی سیٹ پر حضور ﷺ تھے اور پچھلی پر میں تھا، میرے اور آپؐ کے درمیان اسی ڈنڈی کا فاصلہ تھا۔ اس کے سوا کوئی فصل نہیں تھا۔

## تعدد ندا

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ۔

یا معاذ۔۔۔ اے معاذ!

میں نے عرض کیا۔

**لبیك یا رسول اللّٰه وسعدیك**

میں حاضر ہوں یا رسول اللہ!

اس کے بعد کچھ سکوت فرمایا۔ اور پھر آواز دی کہ۔

یا معاذ۔۔۔ !اے معاذ!

میں نے عرض کیا۔

**لبیك یا رسول اللّٰه وسعدیك**

یا رسول اللہ ﷺ! میں حاضر ہوں اور میری سعادت ہی حاضری میں ہے۔

پھر آپ ﷺ نے تیسری آواز دی کہ۔

یا معاذ۔۔۔!

میں نے پھر عرض کیا۔

**لبیك یا رسول اللّٰه وسعدیك**

یا رسول اللہ ﷺ! میں حاضر ہوں۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو مجھے اس وقت سنائی ہے۔

**مقام اشتباہ**

اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کسی بعید کو جو دور ہو اسے پکارا جاتا ہے اور جو اتنا قریب ہو کہ ملا ہوا بیٹھا ہو صرف ایک کجاوے کی ڈنڈی بیچ میں ہو اسے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپؐ ارشاد فرمادیتے، پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پھر پکارنا بھی ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ہے۔۔ اور پھر اس کے باوجود

کہ ہر پکار پر وہ عرض کرتے ہیں کہ لبیک یارسول اللہ۔

یارسول اللہ میں حاضر ہوں۔۔ اگر جواب نہ آتا ممکن تھا کہ پہلی آواز کو نہ سنا ہو' اس لئے دوسری آواز دی' دوسری انہوں نے نہ سنی ہو تو تیسری مرتبہ پکارا گیا ہو۔۔۔ لیکن ہر پکار کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی پکار نہیں سنی ہو گی' تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین دفعہ آپؐ پکاریں۔

## اشتیاق مقصد

یہ حقیقت میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو اور کوئی عظیم مقصد پیش کرنا ہو۔ تو تین تین دفعہ متوجہ کرتے ہیں کہ غور سے سنو تاکہ وہ چیز دل کے اندر اتر جائے۔ بلا پکارے ہوئے اور بلا لبیک کہلوائے ہوئے کسی چیز کا کہنا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کان سے بات کہی اور دوسرے کان سے نکل گئی۔ تین دفعہ متوجہ فرمایا کہ شوق پیدا ہو جائے اور اس مضمون کی رغبت پیدا ہو جائے جو آگے ارشاد فرمانا ہے۔

اور یہ انبیاء علیہم السلام اور نائبان انبیاء علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے کہ پہلے دل میں شوق اور تڑپ پیدا کرتے ہیں اس کے بعد میں مقصد پیش کرتے ہیں تاکہ دل میں اتر جائے۔۔۔ بلا طلب کے اگر از خود کوئی چیز کہہ دی جائے تو عادت یہ ہے کہ دل میں اترا نہیں کرتی' آدمی توجہ نہیں کرتا' جب تک اندر سے طلب صادق نہ ہو' تو شوق پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب اختیار کرتے ہیں کہ طلب پیدا ہو جائے اور طلب کے بعد جو چیز دل میں آتی ہے وہ دل میں اترتی جاتی ہے۔ غیر طالب کو کچھ نہیں ملتا' اس لئے طلب گار ہونا چاہئے۔

جیسے عارف رومی نے کہا ہے کہ ؎

آب کم جو' تشنگی آور بدست

پانی کو زیادہ مت پکارو' پیاس اپنے اندر پیدا کرو' پیاس پیدا ہو گی تو پانی ملے گا اور پھر وہ اترے گا اور رگ رگ میں تری پیدا کرے گا' پیاس نہ ہو تو پانی پی لو تو بعض دفعہ بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں اپھارہ پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔ تو معدے کی خواہش کے بعد اگر کھانا کھایا جائے گا تو معدے میں اترے گا' پچے گا اور بدن کو لگے گا اور بلا کسی بھوک کے کوئی کھاتا رہے تو بیماریوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے پانی اور دانے کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ بھوک اور پیاس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معدہ خراب ہوتا ہے اور بھوک کی کمی ہوتی ہے تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تندور پر نہیں جاتے کہ بہت سی روٹیاں لے آئیں' بلکہ طبیب کے پاس جاتے ہیں کہ ان روٹیوں کی گنجائش تو پیدا ہو جائے' علاج کراتے ہیں تاکہ معدے میں طلب تو پیدا ہو جائے۔

**انتظار رغبت** میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز بانی دار العلوم دیو بند ان کے مریدوں میں سے حافظ محمد احسن صاحب جو ہمارے عزیزوں میں سے تھے' حضرت سے بیعت تھے۔۔۔ نوجوان تھے اور اس زمانے کے نوجوانوں کا جو لباس تھا وہ یہ تھا کہ چوڑی دار پائجامہ جو ٹانگوں پر لپٹا ہوا ہو اور سر کے اوپر دوپٹہ جس کی کناری پر کرن اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا ہوتا تھا اور ہاتھوں پر مہندی' اور پور پور چاندی کے چھلے' یہ اس زمانے میں نوجوانوں کا تمدن تھا۔۔۔ یہی لباس ان کا بھی تھا۔۔۔ کے بارے میں سنا کہ۔

یہ حضرت کی مجلس میں آتے تھے اور حضرت کچھ نہیں فرماتے تھے۔

لوگوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت کے مرید اور خادم' اور لباس غیر شرعی' مردوں کے لئے کب جائز ہے کہ مہندی لگائیں یا ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنیں۔ یہ سارے ناجائز کام کر رہے ہیں۔ چوڑی دار پائجامہ جو ٹخنوں سے نیچا' جس کی شرعی ممانعت ہے۔ جس کو شرعاً اسبال کہتے ہیں۔۔۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا گیا' ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی ڈالنے والا جس کا نام "مسبل منان" ہے حق تعالیٰ اسے قیامت کے دن نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے کہ دنیا میں اسبال کرتا تھا' ٹخنوں سے نیچے ازار یا پائجامہ رکھتا تھا' تو اس پر نگاہ رحمت نہیں فرمائیں گے' اس سے اعراض کیا جائے گا

تو حضرت کی مجلس میں وہ آتے ہیں اس حالت میں کہ اسبال موجود ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی۔ ناجائز چھلے پہنے ہوئے اور حضرت کچھ نہیں بولتے نہی عن المنکر نہیں فرماتے' لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گزرتا تھا' اور ایک' دو نے ایک دوسرے سے کہا بھی مگر حضرت پر کوئی اثر نہیں۔۔۔ حافظ صاحب آرہے ہیں اور مجلس میں بیٹھ رہے ہیں۔

حضرت کیوں کچھ نہیں فرماتے؟

دل میں شریعت کے اتباع کا شوق اور طلب پیدا کرنے کے لئے۔۔۔ کہ طلب پیدا ہو جائے۔ پھر یہ یہ حکم دیا جائے گا تو دل اتر جائے گا۔۔۔ اور بلا طلب کے لاکھ تقریریں کرو' وعظ کہو' کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جیسے آج کی دنیا میں سینکڑوں وعظ اور سینکڑوں تقریریں ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں نہ ایسی تقریریں تھیں' نہ مواعظ تھے نہ جلسے ہوتے تھے۔۔۔ اور آج جلسوں کی بھرمار ہے۔

اور جلسوں کا سیزن ہے اور ہزاروں پر انتہا نہیں ہوتی۔ لاکھوں تک اجتماعات میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دل ٹس سے مس نہیں' کسی کے اندر کوئی تغیر نہیں۔۔۔ وہی کی وہی حالت جو پہلے تھی۔۔۔ ایک واعظ وعظ کہہ کے وعظ کا ایسا پانی ڈالتا ہے' جیسے گنبد پہ ڈال دیا کہ اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں پہنچتا' بنا اس کی یہ ہے کہ طلب صادق نہیں' تفریحاً آکے وعظوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گویا بھانڈ کو دیکھتے ہیں کہ مقرر کیا بولتا ہے' کیسی باتیں کرتا ہے۔ یہ طلب ہو کہ اس کی کوئی بات لے کر ہم اپنی دنیا و آخرت کی نجات کی فکر کریں۔ یہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ ہو گی' ہزاروں

لاکھوں میں کسی ایک کو۔۔۔ عام طور سے نہیں ہے۔ اس لئے مواعظ اثر بھی نہیں کرتے۔

وعظ‘ غلط نہیں ہوتا‘ مگر دل کھلا ہوا ہو جب اس کے اندر کوئی چیز اترے اور اگر دل الٹا ہو تو اس کی تلی پر جتنا پڑے گا اِدھر اُدھر بہہ جائے گا۔۔۔ بہر حال حضرت بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔

جب چھ مہینے گزر گئے اور دیکھا کہ اب ان کے اندر عقیدت پوری بیداری ہو گئی ہے اور قلب میں گرویدگی آگئی ہے۔ اور طلب صادق آگئی۔ تو تنہائی میں لے جاکر کیسے عجیب انداز سے کہا فرمایا۔

”بھائی! حافظ جی! تم تو ہمارے دوست ہو اور ہم تمہارے دوست ہیں اور دوستوں کے اندر محبت ہوتی ہے۔ اور محبت میں ہر ایک دوسرے کی حرص کیا کرتا ہے۔ اب ہمارا لباس تو یہ ہے کہ ایک معمولی سا کرتہ اور ایک پٹے پائنچوں کا پاجامہ‘ اور ایک دو پلی ٹوپی۔۔۔ تمہارا ماشاء اللہ فاخرہ لباس ہے۔ گوٹے لگا ہوا عمامہ بھی ہے۔ پور پور چھلے بھی اور نہایت عمدہ اچکن اور چپل بھی۔۔۔ بھئی! دوستی ہے تو یا تو ہم بھی آج سے یہ لباس اختیار کر لیں کہ ہم بھی چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ پہن لیں‘ ہم بھی ہاتھوں کو مہندی سے رنگین‘ یا پھر تم اس راستے پر آجاؤ جس پر میں ہوں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دوست ہوں ایک کا رخ مشرق کو ہو اور ایک مغرب کو ہو۔۔۔“۔

**طرز نصیحت**

چونکہ دل میں عقیدت آچکی تھی اور طلب صادق پیدا ہو چکی تھی‘ تو حافظ محمد احسن صاحب رونے لگے اور بلا کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔۔۔ جا کر وہ چوڑی دار پاجامے تو بیوی کو دیئے کہ رنگ لگا کر اس کو تو پہن لے‘ اور گوٹے کی کناری کے دوپٹے اس کو دیئے کہ ان کی تو اوڑھنیاں بنالے۔۔۔ اور پندرہ دن گھر سے نہیں نکلے‘ جب تک مہندی کا وہ رنگ ہتھیلیوں سے زائل نہیں ہو گا‘ چھلے بھی بیوی کو دیئے کہ تو ان کا زیور بنوالے۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب وہ مہندی کا اثر جاتا رہا تو خالص مولویانہ لباس‘ وہی مغلیہ قسم کا پاجامہ اور کرتہ‘ اور دو پلی ٹوپی اوڑھ کر حضرت کی مجلس میں پہنچے۔۔۔ بالکل ایسے جیسے ایک طالب علم ہوتا ہے حضرت نے سینے سے لگایا اور فرمایا۔

بھئی! آج دونوں دوست یکساں ہو گئے۔

اور بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔۔۔ یہ جو چھ مہینے تک امر بالمعروف نہیں کیا‘ وہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا انتظار تھا کہ دل میں طلب آجائے‘ دل میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے تب کہیں تو اثر پڑے گا۔

انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے۔ اہل اللہ اور وارثین انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی ہے۔۔۔ اور وہ لوگ تو اب کہاں ہیں کہ ایک منٹ میں توجہ ڈالی اور کایا پلٹ دی‘ وہ لوگ گزر گئے‘

اب تو یہ ہے کہ اخلاق اور بھائی بندی سے کوئی اثر ڈال کر طلب پیدا کر کے کوئی نصیحت کریں تو کارگر ہوتی ہے۔ یوں نصیحت کرنے کو ہر ایک کا فرض ہے کہ نصیحت کرے، وعظ بھی کہے۔۔۔ لیکن مؤثر نہیں ہوتا۔

**حکمت تربیت**

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ۔ ان کے ایک پٹھان مرید جلال آباد کے تھے بڑے خوبرو جوان تھے۔۔۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن داڑھی منڈانے کا نہیں داڑھی رکھنے اور چڑھانے کا تھا۔۔۔ نماز نہیں پڑھتے تھے' حضرت حاجی صاحب سے شکایت کی گئی کہ حضرت! آپ کے مرید ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔۔۔ حضرت نے بلایا۔۔۔ بڑی شفقت سے کمر کے اوپر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"بیٹا! نماز پڑھنی چاہئے' نماز ہی تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز اور فرق ہے جب نماز ہی نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہوا؟"

انہوں نے کہا حضرت! مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور سوا گھنٹے میں داڑھی چڑھتی ہے۔ پہلے اسے گوند لگاتا ہوں' پھر اسے سکھاتا ہوں' پھر اس میں کنگھا کرتا ہوں' سوا گھنٹہ لگتا ہے۔ آپ کہیں گے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی' جب وضو کروں گا تو وہ سارا گوند موند دھل جائے گا۔ تو ہر نماز کے بعد مجھے داڑھی چڑھانی ہے۔۔۔ تو پانچ نمازیں تو گھنٹے بھر سے کم میں ہو جائیں گی اور پانچ دفعہ داڑھی چڑھانے میں سات گھنٹے صرف ہوں گے۔ یہ مشکل ہے اور آپ کہیں گے کہ بے وضو نماز جائز نہیں۔

اب آگے "حکمت تربیت" ہے۔ تعلیم تو یہ ہے کہ حضرت فرماتے کہ ہاں بلا وضو نماز جائز نہیں حدیث میں ہے ۔

لاتقبل صلوٰة بغير طهور

"کوئی نماز بغیر پاکی کے قبول نہیں ہوتی"۔

یہ تو تعلیم کا درجہ تھا۔ مگر تربیت کا درجہ دوسرا ہے۔ تعلیم میں ایک حکم ہوتا ہے سب کو سنا دیا جاتا ہے تربیت میں ہر ایک کا مزاج دیکھنا پڑتا ہے' اس کی نفسیات کے مطابق اس سے کلام کرنا پڑتا ہے۔۔۔ تو حضرت نے یہ دیکھا کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے اس کا کیا سنانا' وہ خود ہی کہہ رہے ہیں۔ کہ آپ کہیں گے کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی تو مسئلہ تو معلوم تھا۔۔۔ اب حضرت کیا فرماتے جو معلوم ہے اس کا علم کرا دیتے' مگر حکمت تربیت پیش نظر تھی۔ حضرت نے فرمایا ۔

"بھئی میں نے تو وضو کا ذکر نہیں کیا' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھا کرو"۔

انہوں نے عرض کیا' حضرت! بے وضو پڑھ لوں؟

فرمایا ۔

”پھر وضو کا ذکر‘ میں وضو کا نام کب لے رہا ہوں میں وضو کا تذکرہ کب کر رہا ہوں میں تو نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں۔“

تو خان صاحب اٹھے‘ انہوں بے وضو نماز ٹرخانی شروع کر دی‘ غرض بے وضو نماز پڑھنی شروع کر دی۔

حضرت حاجی صاحب ؒ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بے وضو پڑھ رہے ہیں اور انہیں ٹوکتے نہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے کہ نماز نہیں ہوتی۔

پندرہ دن گزر گئے۔۔۔ پندرہ دن کے بعد ان کے ذہن میں خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ تو محنت بھی کر رہا ہے۔ اور اکارت جا رہی ہے۔ رائیگاں جا رہی ہے۔ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی۔۔۔ مگر انہوں نے کہا کہ نماز تو اب میں چھوڑ نہیں سکتا‘ اس لئے کہ پیر کا حکم ہے۔ اور پٹھان کی زبان ہے جو کٹ سکتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی‘ للہٰذا نماز نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ نماز مجھے ہر صورت میں پڑھنی ہے۔ تو یہ کیا صبح کی نماز کے لئے وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے اور عشاء تک اس وضو کو باقی رکھتے اور پانچوں نمازیں وضو سے پڑھتے۔

لیکن یہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے کہ صبح سے لے کر عشاء تک باوضو رہے‘ تکلیف شروع ہوئی۔ پیٹ میں نفخ اور اپھارہ شروع ہوا۔

اب انہوں نے یہ کیا کہ ایک وضو تو صبح کی نماز کے لئے کرتے اور ایک ظہر کے وقت کرتے‘ اسے عشاء تک باقی رکھتے۔۔۔۔ غرض نماز باوضو شروع کر دی۔۔۔ لیکن ایک نوجوان کے لئے بڑی مشکل سی بات ہے کہ ظہر سے لے کر عشاء تک باوضو رہے۔۔۔ اس سے بھی پیٹ میں تکلیف شروع ہوئی۔ اب انہوں نے کہا کہ نماز تو میں چھوڑ نہیں سکتا‘ پیر سے وعدہ کر چکا ہوں اور زبان پٹھان کی ہے جو کٹ سکتی ہے‘ اب بدل نہیں سکتی۔۔۔ اس واسطے انہوں نے سوچا کہ یا تو داڑھی چڑھانے کو قائم رکھو‘ یا نماز قائم رکھو نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے داڑھی چڑھانی چھوڑ دی اور نماز باوضو پڑھنی شروع کر دی۔

بیس پچیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحب نے بلوایا اور بہت شاباش دی اور فرمایا۔

”نوجوان صالح ایسے ہی ہوتے ہیں“۔

اور بڑی دعائیں دیں۔۔۔ اس کے بعد فرمایا۔

بھئی! بے وضو کے نماز کتنے دن تم نے پڑھی ؟“

انہوں نے عرض کیا۔

حضرت! پندرہ بیس دن۔۔۔۔ فرمایا۔

اسے لوٹا لینا' یہ ہوئی نہیں۔۔۔ انہوں نے عرض کیا ضرور لوٹاؤں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ؎

بھئی! تمہاری عمر کیا ہے؟

خان صاحب نے کہا کہ سولھواں سال شروع ہے۔ پندرہ پورے ہو چکے ہیں۔ فرمایا ؎

چودہ برس کے بعد آدمی شرعاً بالغ ہو جاتا ہے اور نماز اس پر فرض ہو جاتی ہے۔۔۔ برس دن کی نماز تو پڑھی نہیں ہو گی۔

انہوں نے عرض کیا۔

حضرت! نہیں' میں نے تو نہیں پڑھی۔۔۔ فرمایا۔

یہ قضا عمری ہے۔ اسے بھی قضا کر لو۔

اب دل میں لگن تو لگ چکی تھی۔۔۔ سرکاری ملازم تھے انہوں نے ایک ہفتے کی رخصت لی' اور ساری نمازیں برس دن کی انہوں نے قضا کیں' اور ادا نمازوں سے سلسلہ مل گیا۔۔۔ گویا بلوغ کے وقت سے جو نمازی بنے تو پھر مرتے دن تک نماز نہیں چھوٹی اور پکے پابند صوم وصلوٰۃ ہو گئے۔۔۔ یہ کیسے ہوئے؟

حضرت نے پندرہ دن کی بے وضو نماز پڑھوا کے عمر بھی کی نمازیں باوضو پڑھوا دیں۔ اور اگر پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی' وہ کبھی نہ پڑھتے' اور عمر بھر بے نماز رہتے۔ یہ حکمت تربیت تھی کہ پندرہ دن بے وضو کے نمازیں پڑھوا کے عمر بھر کے لئے پابند نماز بنا دیا۔۔۔ اگر تربیت کی یہ صورت اختیار نہ کرتے' وہ کبھی نماز کے عادی نہ ہوتے۔

تربیت کرنے میں بعض اوقات کسی بری اور منکر چیز کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے' سکوت کرنا پڑتا ہے کہ طبیعت میں صلاحیت آجائے' پھر بات کہی جائے' پھر نصیحت کی جائے وہ قابل قبول ہو گی' ورنہ نہیں ہو گی۔

**تربیت کا امتیاز** اور سنت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔۔۔ ایک قبیلہ جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ؎

یا رسول اللہ! ہم اسلام قبول کرنے کے لئے آئے ہیں۔

فرمایا بارک اللہ

انہوں نے کہا' حضرت! اسلام قبول کرنے کی ایک شرط ہے وہ یہ کہ ایک صبح کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور ایک عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے' تین نمازیں پڑھواتے رہیں۔

فرمایا۔۔۔ شرط منظور ہے۔

حالانکہ جس طرح سے تین وقت کی فرض تھیں' ویسے ہی بقیہ دو وقت کی بھی فرض

تھیں۔۔۔ مگر آپؐ نے شرط منظور فرمائی اور وہ تین وقت کی پڑھ رہے ہیں اور صبح و عشاء کی غائب۔

آپؐ نے بھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ناجائز ہے‘ ممنوع ہے حرام ہے۔۔ مہینہ بھر کے بعد میں از خود ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ جیسے تین وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ ویسے ہی صبح و عشاء کی بھی فرض ہیں۔ تو ہم آدھے دین کو قبول کریں اور آدھے دین کو ضائع کریں‘ یہ ہرگز مناسب نہیں‘ چنانچہ مہینہ بھر کے بعد انہوں نے وہ دو بھی پڑھنا شروع کر دیں۔۔۔ اس کے بعد وہ حاضر ہوئے اور نماز کے پابند ہو گئے‘ تو دو وقت کی نماز نہ پڑھنے کی شرط مان کر عمر بھر کی پانچ وقت کی نماؤں کا پابند بنا دیا‘ یہ تعلیم نہیں تھی بلکہ تربیت تھی۔

تعلیم میں تو مسئلہ عام ہوتا ہے‘ تربیت میں ہر مزاج کے مطابق اس کو دوا دی جاتی ہے۔

آپ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے ہاں تعلیم پانے جائیں۔ ایک ہی مسئلہ بیان ہو گا جو کتاب میں ہے وہی سب کے لئے ہے۔۔۔ لیکن جب طبیب مطب کرے گا وہاں یہ نہیں کہ ایک نسخے میں سب کو پار کر دے‘ ہر مریض کی نبض الگ ہے اور اس کا مزاج الگ ہے‘ اس کے مطابق نسخہ تجویز کرنا ہو گا۔ غرض تعلیم میں عموم ہوتا ہے اور تربیت میں خصوص ہوتا ہے۔۔۔ اس لئے ”مربیان قلوب“ بعض اوقات انتظار کرتے ہیں۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر اس کی برائی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہو جائے‘ دل میں گرویدگی آ جائے پھر اس وقت کہا جائے گا۔

خیر وہ بات طویل ہو گئی‘ میں مختصر بیان کرنا چاہتا تھا‘ بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو تین دفعہ آواز دی‘ حالانکہ وہ کمر مبارک سے ملے ہوئے بیٹھے تھے تاکہ تین دفعہ آواز دے کر ان کے دل میں شوق پیدا کر دیں کہ کوئی بڑی اہم بات کہی جانے والی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل میں ایک طلب‘ تلاش اور پیاس پیدا ہوئی کہ حضور ﷺ کیا فرمائیں گے جو مجھے تین دفعہ متوجہ فرمایا۔

## اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

**یا معاذ هل تدری ما حق الله علی العباد؟**

اے معاذ۔۔۔! اللہ کا بندوں کے اوپر کیا حق ہے؟

انہوں نے عرض کیا۔

**الله و رسولهٔ اعلم**

اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں۔

فرمایا۔

اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔

**یعبدوا اللّٰہ ولا یشر کوا بہ شیاً**

عبادت صرف ایک اللہ کی کریں جس میں شرک نہ آنے پائے۔ جبھی اللہ کا حق ادا ہو گا۔

اس کے بعد فرمایا۔

**ھل تدری ماحق العباد علی اللّٰہ؟**

یہ بھی جانتے ہو کہ بندوں کے اللہ کا اوپر کیا حق ہے ؟

عرض کیا۔

اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

فرمایا۔

”بندوں کا حق یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی طرف جھک جائیں اور شرک سے بالکل الگ ہو جائیں۔ پوری زندگی ان کی توحید پر آجائے اور ایک ہی کو کرتا دھرتا سمجھیں، ایک ہی کو نافع اور ضار سمجھیں، ایک ہی کو محی وممیت سمجھیں، ایک ہی کو رزاق اور فتاح سمجھیں، ایک ہی کو مشکلات آسان کرنے والا سمجھیں ایک ہی کو دافع بلیات سمجھیں، ایک ہی کو حل مشکلات سمجھیں، جب بندے کے دل میں یہ آگیا، اس نے اللہ کا حق ادا کر دیا۔۔۔ تو اللہ نے فرمایا کہ پھر تمہارا حق میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہیں رزق دوں گا، رزق ظاہری بھی، اور رزق باطنی اقتدار، عزت، عظمت، عرفی حیثیت، دنیا کی اقوام پر رعب داب، یہ میں تمہیں عطاء کروں گا۔“

غرض بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو عبادت کر جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔ میں تمہیں رزق دوں گا جس کے اندر کمی کا شائبہ نہیں ہو گا۔

یہ گویا بندے اور خدا کا ایک معاہدہ ہوا کہ تم میری یاد میں لگو، میں تمہیں رزق دوں گا۔

### قانون مکافات

اللہ تعالیٰ کے ہاں مکافات کا قانون ہے کہ جیسا تم کرو گے، ویسا نتیجہ سامنے آئے گا۔۔۔ چنانچہ فرمایا گیا

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ

”فرماتے ہیں تم میری یاد کرو گے میں تمہاری یاد کروں گا“۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ

تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے، میں تمہاری مدد کروں گا۔

من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاء ہ

فرماتے ہیں، اگر تمہیں یہ شوق ہے کہ مجھ سے آکر ملو اور موت قبول کرو تو مجھے بھی یہ شوق ہے کہ کب میرا بندہ آئے اور مجھ سے ملے۔ تم میں میری محبت ہے مجھ میں تمہاری محبت ہے۔ غرض "ادل بدل" اور مکافات کا قانون ہے اس لئے بندے اور خدا کا گویا معاہدہ یہ ہوا کہ تم تو میری عبادت میں رہو اور مجھے تنہا خالق و مالک اور مؤثر سمجھو، مجھے اپنا تنہا بادشاہ اور مالک حقیقی سمجھو اور پھر میں تمہیں رزق ظاہری اور باطنی بھی دوں گا، روٹی و مکان بھی، اقتدار و عزت بھی اور حکومت و سلطنت بھی۔ اور تمہیں دنیا کے اوپر غالب کروں گا۔ جس کا ایک جگہ وعدہ فرمایا۔

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوْا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، عقیدہ بھی پکا اور سچا اور عمل بھی سچا، ہم ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کریں گے، انہیں اقتدار عطا کریں گے، انہیں عزت عطاء کریں گے، وجاہت دیں گے"۔

یہ گویا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔۔۔ بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو تنہا میری طرف جھک، کسی کو کرتا دھرتا مت سمجھنا، ڈرے تو مجھ سے ڈر، عبادت کر تو میری کر، مانگ تو مجھ سے مانگ، میرا غیر تیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، غیر اللہ کے ہاں تیرے لئے گنجائش نہیں۔ میرے ہی پاس ساری گنجائش ہے۔ میں ہی دوں گا۔۔۔ یہ معاہدہ ہو گیا۔

### بندے کا انحراف عہد

معاہدے کا قاعدہ ہے کہ اگر ایک معاہد اپنا عہد توڑ دے تو دوسرے پر ضروری نہیں رہتا کہ اپنا معاہدہ پورا کرے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔۔۔ دو حکومتوں میں معاہدے ہوئے، ایک نے عذر کیا، دوسری کہے گی اب ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، اب خواہ ہم جنگ کریں یا اس ملک پر ہم قبضہ کریں، جب تک معاہدہ رہتا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بندے اور خدا میں معاہدہ ہو گیا، بندے نے عہد کیا کہ میں آپ کا بنوں گا، فرمایا، ہم تیرے بنیں گے، تو ہماری عبادت کر، ہم تجھے سب کچھ دیں گے اب اگر بندہ اس عہد سے پھر جائے کہ بجائے اس ایک کی عبادت کرنے کے اس نے ہزاروں کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا، بجائے اس ایک کی بندگی کے کبھی وہ کسی قبر کے آگے جھک رہا ہے، کبھی کسی پتھر کے آگے جھک رہا ہے۔ کبھی سونے اور چاندی کے آگے جھک رہا ہے۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس نے عہد توڑ دیا، جب عہد توڑ دیا تو وہ جو وعدہ تھا اس کی پابندی باقی نہیں رہی۔ فرمائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تجھے رزق دیں، کیا ضرورت ہے کہ تجھے اقتدار دیں، تو تو ہم سے منحرف ہو جائے اور ہم تجھے اقتدار دیں تو تو مالک و خالق،

روٹی' گیہوں اور چنے کو اور انسانوں کو سمجھے اور ہم تجھے عزت واقتدار دیں۔

اَنُلۡزِمُکُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا کٰرِهُوۡنَ

کیا ہم اپنی رحمت تیری کمر سے چپکا دیں گے کہ تو بھاگتا جارہا ہے۔ ہم کہیں رحمت لیتا جا' تجھے لاکھ دفعہ ضرورت ہو تو ناک رگڑ' تو ہم تجھے رحمت دیں گے' جب تو وعدہ کا پکا نہیں تو ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں' جب تک وعدے کی پوری پابندی رہی' صحابہؓ کا دور' تابعین کا دور' تبع تابعین کا دور' اقتدار بھی آیا' عزت بھی آئی اور وہ اقتدار آیا کہ آج دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی' آج آپ فخر کرتے ہیں کہ عرب ہمارا' عراق ہمارا' مصر ہمارا' ترکستان ہمارا' افغانستان ہمارا' شام اور اردن ہمارا' یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ تو ہے جو آپ کو یہ کہنے کو ملا' آپ نے ان کو خود فتح کیا تھا۔۔۔؟ کیا آپ نے خود قوت بازو سے ان ممالک کو قبضے میں کیا تھا۔۔۔؟ یا ان بزرگوں نے جو اللہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے تھے؟ آپ کو موقع مل رہا ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا' ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہان ہمارا

یہ فخر کا موقع ان کی جوتیوں کے صدقے سے مل رہا ہے' آپ کی بات اگر ہوتی تو نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ تو جب تک قوم وعدے پر پختہ رہی وہ اقتدار بھی تھا' وہ عزت بھی تھی' وہ روزی بھی تھی۔ وہ فتنے بھی نہیں تھے' آپ داعی تھے' دوسرے مدعو' جب آپ نے دعوت چھوڑ دی تو دوسرے داعی بنے آپ کو مدعو ہونا پڑا' آپ بااقتدار تھے' دوسرے ماتحت تھے۔۔۔ جب آپ نے اقتدار کے اسباب چھوڑ دیئے' آپ ماتحت بنے' دوسرے آپ کے اوپر غالب کر دیئے گئے۔۔۔ یہ وعدہ خلافی آپ نے کی۔۔۔ تو جب فتنے آتے ہیں' پریشانیاں آتی ہیں آپ کہتے ہیں کہ تدبیر تو بتلاؤ' تدبیر تو اللہ نے بتلا دی کہ تم میرے بن جاؤ' میں تمہارا بن جاؤں گا اور کیا تدبیر ہو۔۔۔ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔۔۔ رزق ان کے ہاتھ میں ہے' عزت ان کے ہاتھ میں ہے' اس کی چوکھٹ پر جھکو گے تو یہ چیزیں آئیں گی' اس کی چوکھٹ چھوڑ کر غیروں کے آگے جھکنا شروع کیا تو غیروں نے آپ کی رہی سہی عزت کو بھی قبضہ میں لے لیا رہی سہی روٹی پر قبضہ کر لیا' آپ کو فتنوں کے میدان میں چھوڑ دیا۔ اب کوئی روٹی کو رو رہا ہے' کوئی پانی کو رو رہا ہے' کوئی صحت کو رو رہا ہے۔

### عظمت در اور سر

مجھے ایک شعر یاد آیا واقعی بڑا کام کا شعر ہے اور شاعر نے بڑی بلیغ بات کہی ہے جس نے بھی کہی ہے بڑی اونچی بات ہے اور دو لفظوں میں بڑی زبردست حقیقت کہہ دی ہے' شاعر کہتا ہے

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے

دروازہ وہی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا جی چاہے کہ جھک جائے۔۔۔ اہل اللہ کا دروازہ' انبیاء علیہم السلام کا دروازہ۔ خواہ مخواہ ہی دل چاہتا ہے کہ سر جھکاؤ۔ انکار کی شکل ہی نہیں۔ تو شاعر کہتا ہے ۔

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

## ذلت انحراف

جو پچاس کو اپنا آقا بنالے' وہ کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا' ایک ہی آقا کو خدمت ہو سکتی ہے۔ جب آپ کے پچاس آقا ہیں' کبھی اس کی چوکھٹ پہ جھکنا کبھی اس کی چوکھٹ پہ۔ کبھی اس سے بھیک مانگنی کبھی اس سے بھیگ مانگنی۔۔۔ تو مسلم قوم دنیا میں بھک منگی بن کے تھوڑا ہی آئی تھی۔۔۔ وہ دنیا سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آئی تھی۔۔۔ جب احسان کا دروازہ بند کر دیا اور ختم کر دیا تو سائل اور بھکاری بننا پڑا۔ اب آپ کی یہ حالت ہے کہ کسی قوم کے آگے جھک رہے ہیں کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو' کسی کے آگے جھکتے ہیں کہ ہمیں سیاست کی بھیک دے دو' کسی کے آگے آپ جھک رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کی بھیک دے دو' اور سر کے اوپر ٹوکرا رکھا ہوا ہے جس میں رزق موجود ہے۔۔۔ مگر در در مانگتے پھر رہے ہو۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اٹھا کے سر کے اوپر سے لے لو' وہ ساری چیزیں اس ٹوکرے میں موجود ہیں۔۔۔ قرآن و حدیث سر کے اوپر رکھا ہوا ہے اور دنیا کے در پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں سب کچھ موجود ہے۔۔۔ اسی نے دنیا میں بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت پھیلائی ۔

یک سبد پر زناں ترابر فرق سر
توہمی جوئی لب ناں در بدر

سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔ اور ٹکڑوں کی مانگ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب غیر کی چوکھٹ پر سر جھکائیں گے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ بھکاری بنیں گے تو مسلمان دنیا میں اقوام کو کچھ دینے کے لئے آئے تھے' مگر سائل اور بھکاری ہو گئے۔۔۔ اور بھیک ملتی نہیں۔ تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

یہ کیوں ہوا؟

اس لئے کہ وعدہ خلافی کی۔ اس معاہدہ کو توڑ دیا جو اللہ سے کیا تھا۔ کہا تھا کہ مجھ ہی پر بھروسہ کرو' مجھے ہی اپنا بادشاہ سمجھو' مجھے ہی خالق اور مالک سمجھو۔ میرے ہی قانون کی دنیا کے اندر ڈونڈی پیٹو' میرا ہی قانون سب تک پہنچاؤ۔ آپ نے جو اس قانون کو چھوڑا تو دنیا کی اقوام نے آپ پر قوانین لادنے شروع کئے۔۔۔ وہ قوانین جو فطرت کے بھی خلاف' عقل کے بھی خلاف اور ہوش مندی کے بھی خلاف۔ مگر آپ کو جھک مار کر کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ کشاں کشاں جا رہے ہیں۔۔۔ اور آپ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ چیز بری ہے۔ مگر آپ کو جانا پڑا۔

کوئی نس بندی کا قانون پاس کرے گا' آپ کو مجبور ہو کے گردن جھکانی پڑے گی اس لئے کہ جب اپنے قانون کو پس پشت ڈالا تو دوسرے کے قانون پر چلیں' کوئی فیملی پلاننگ لائے گا' آپ کو ماننا پڑے گا۔ اس لئے کہ جو اسلام کا حکم تھا وہ پس پشت ڈال دیا۔۔ پھر دنیا کی اقوام کے آگے جھکنا پڑے گا۔

## اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت

اگر آپ اس قانون پر عامل ہوتے فقط اعتقادی طور پر نہیں، عمل بھی ہو تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے اندر رخنہ اندازی کرے۔۔۔ جب عملاً چھوڑ دیا تو ع

خانہ خالی را دیو می گیرد

جب گھر خالی ہوتا ہے تو شیطان ہی اس میں آکر بسیرا کرتا ہے۔۔ اس لئے ایک ہی قرار واقعی علاج ہے۔ اللہ نے جو قانون دیا ہے' آنکھ بند کے اس کی عملی پابندی کرنی شروع کیجئے۔ پھر دیکھئے کیسے تبدیلی آتی ہے۔۔ آپ چاہتے ہیں کہ نظری طور پر چیزیں آجائیں۔ دماغ کو فرحت ہو جائے۔ عمل کا کوئی نام نشان نہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔ تو دنیا میں بلا کئے کسی کو کچھ نہیں ملتا' دنیا تو دار العمل اور دار الکسب ہے جتنا کسب و محنت کریں گے اتنا ہاتھ آئے گا' اور جتنا آپ اسباب کو چھوڑ کر غنی بن کے بیٹھ جائیں گے محتاج ترین بن جائیں گے' آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی' یہ جنت نہیں ہے کہ تخیل باندھنے سے نعمت سامنے آجائے۔ یہ دنیا ہے یہاں محنت کرنے سے چیز سامنے آجائے گی۔

اگر کاشتکار چھ مہینے خون پسینہ ایک نہ کرے' وہ چار دانے لے کر گھر میں نہیں آسکتا اس لئے کہ دنیا دار العمل ہے۔۔ اگر کاشت کار برسات کے مہینے میں یہ دیکھ کر کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں' بڑا اچھا خنک موسم ہے۔ لہٰذا یہ چار' چھ مہینے تو سو کے گزار لو۔۔۔ تو تخم ریزی کا زمانہ نکل جائے گا' بار کا دور ختم ہو جائے گا' جب لوگ اناج کے ڈھیر لے کر آئیں گے تو یہ بیٹھ کر قسمت کو روئے گا کہ میں نے تخم ریزی کا سارا وقت سونے میں گزار دیا' اب جب دانہ لینے کا وقت آیا جنہوں نے محنت کی تھی وہ لے کر آرہے ہیں۔ میں خالی اور محروم ہوں۔ اب بیٹھ کر روئے گا' مگر اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ ملامت کرنے والا یہی تو ملامت کرے گا کہ کمبخت تو نے ان چھ مہینوں میں جا کر کیوں نہیں محنت کی۔۔۔؟

جب نہیں کی تو اب بیٹھ کر اپنی قسمت کو روؤ۔۔۔ غرض دنیا کا بازار اور دنیا کا میدان کاشت کاری کے لئے ہے۔۔۔ اللہ نے تخم سعادت کا بیج دلوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس کو بار آور کرنا کہ ایمان و اعتقاد مضبوط کر کے عملاً چلنا' تب جا کے آخرت اور دنیا میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔

جب آپ نے نہ بیج کو پانی دیا' نہ بیج کی آبیاری کی تو چند دن کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیج بھی سوخت ہو جاتا ہے۔ جب زمین پر پانی ہی نہ پڑے تو بیج جل جائے گا۔ جو تخم سعادت قلوب کے اندر

بکھیرا گیا تھا۔ اسے آپ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کو پانی دے کر اگانے کی فکر میں نہیں ہیں۔۔۔ اور سوال یہ ہے کہ ہمیں دانہ کیوں نہیں مل رہا؟ ہمیں رزق کیوں نہیں مل رہا؟

بھئی! جب تم اگاؤ گے نہیں تو کہاں سے ملے گا۔۔۔؟ جب تخم ریزی نہیں کرو گے تو دانہ کہاں سے ملے گا؟

## حصول عزت واقتدار کی تدبیر

یہ ہر شخص کے دل میں سوال ہے کہ مجھے راحت کیسے ملے؟ مجھے سکون کیسے ملے۔۔۔؟ مجھے عزت اور عرفی حیثیت کیسے ملے۔۔۔؟ اقتدار کیسے ملے۔۔۔؟ اور عمل کے نام سے آگے کوئی بڑھنا نہیں چاہتا۔

یہ اسی کاشتکار کی سی مثال ہوگئی کہ تخیل باندھ رکھا ہے جو تخم ریزی کے زمانے میں توپڑ کے سو گیا، اس کے گھر مین دانہ کون لائے گا۔۔۔؟ سوائے اس کے کہ وہ دکان دکان بھیک مانگے گا کہ بھئی! میں نے تو اپنی زمین میں نہیں اگایا، تم خدا کے واسطے ایک ڈھیری مجھے دے دو، خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو، وہی مثال ہماری ہوگئی کہ جو کام کرنے کا وقت ہے وہ تو ہم آرام میں ضائع کر رہے ہیں، نہ دین کی خبر، نہ احکام کی خبر، نہ خدا کے رسول کے اتباع کی خبر۔ نہ وہ معاہدہ یاد ہے جو اللہ سے کر کے آئے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کیا اور فتنے آ کے پڑے، اقتدار بھی چھنا، دولت بھی چھنی اور ملک بھی چھنا، اب بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ ہمیں فلاں ریاست دے دو۔۔۔ فلاں ملک دے دو۔

ملک وریاست، دولت وعزت کے ملنے کے جو اسباب تھے ان اسباب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اب کہتے ہیں کہ کیا تدبیر کی جائے؟

تدبیر موجود ہے، کرنے کا بھی وقت ہے۔ تدبیر بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تو بنی بنائی اللہ نے اتار دی تھی۔

## کفر کے دست نگر اسلامی ممالک

غرض جب آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہم پر بھی ضروری نہیں کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں، وہ وعدہ تو اس شرط سے مشروط تھا کہ تم ہماری بندگی کرو، تم قانون خداوندی پر عمل کرو، تم اپنی زندگی میں نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ کا دستور اپناؤ۔۔۔ ان کی حیات اور دستور زندگی کو مشعل راہ بناؤ اور تم یہ وعدہ کر کے آئے تھے، جب تم نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہم پر کب وعدہ پورا کرنے کی پابندی رہی کہ تمہیں اقتدار بھی دیں، عزت بھی دیں اور رزق بھی دیں۔

اس لئے یہ چیزیں ہاتھ سے چھنی شروع ہوئیں۔ ملک ہاتھ سے چھنا شروع ہوئے، آج یہ ملک نکل گیا۔۔۔ کل یہ نکل گیا۔

اور نہیں بھی نکلا تو اقتدار خود آپ کا نہیں، اقتدار اب غیروں کا ہے۔ آپ اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتے، جب تک ان غیروں کی منشاء نہ ہو تو آپ ان کی منشاء کے غلام اور تابع بنے۔

کہنے کو آپ کہتے رہیں کہ صاحب! ہمارا ملک آزاد ہے اور ہمارا اقتدار ہے۔۔۔ مگر تمہارا اقتدار کیا ہے؟ پیسوں کے تم محتاج ہو، وہ اگر یوں کہیں کہ جب تک تم نس بندی نہیں کرو گے، ہم قرضہ نہیں دے گے۔ تمہیں جھک مار کے کرنی پڑی رہی ہے۔

یہ کون سا اقتدار ہے۔۔۔؟ یہ کون سی آزادی ہے؟

## آزادی اقتدار

اقتدار اسی کا نام ہے کہ "اپنی قدرت سے قادر ہو۔" "قادر بقدرت الغیر" کو قادر نہیں کہتے۔۔۔، کیا آپ قادر ہیں جب تک دوسرے کی قدرت استعمال نہ کریں۔۔۔؟ یہ کون سی قدرت ہے؟ قدرت وہ ہے کہ اپنے اندر ہو اور آپ اپنی من مانی کارروائی کر سکیں۔ جی چاہے بات کر سکیں۔ یہ قدرت نہیں تو آپ قادر ہی کب رہے؟

ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو۔ اور انتظام و اثرات غیروں کے غالب ہوں جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے۔ اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں۔

اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں، عزت اور اقتدار میں۔

## پارٹی بندی کا انجام

تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزق اور بے عزتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟

یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اقتدار کیوں نہیں دیا۔۔۔؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزت کیوں چھین لی؟ ہماری روٹی کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔۔۔؟۔۔۔ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے۔ اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کہ ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو آفت آتی ہے، وہ انہیں پر آتی ہے۔ اب روتے ہیں۔۔۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ برق آئی کیوں۔۔۔؟ یوں کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے بھیج دی، اللہ میاں نے بھیجی۔ مگر کب بھیجی؟ جب تم اللہ میاں کے نہ رہے۔ وہ بجلی ہی گرائیں گے، وہ تو قحط سالی ہی رکھیں گے وہ تو رزق چھین لیں گے۔ تم نے معاہدہ توڑ دیا، انہوں نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا، وعدہ جب ہی تک ہے جب کہ شرط ایمان و عمل صالح کی پوری ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

"تو ایمان و عمل صالح اور باہمی اعتماد و محبت کی شرط پوری ہو تو ایفائے وعدہ ہو گا"۔

ہمیں آپ کو تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتحاد کہاں رہے گا؟ اختلاف اور نزاع ہر چیز میں ہے۔ اب گویا مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر چیز میں لڑتا جھگڑتا رہے، کوئی مسئلہ آئے گا تب کھڑے ہو کر لڑیں گے، کوئی حکم شرعی ہوگا اس میں کھڑے ہو کے لڑیں گے۔ ہر چیز میں لڑائی، ہر چیز میں پارٹی بندی، ہر چیز میں نکتہ چینی اس قوم کا تو پھر یہی انجام ہونا ہے کہ وہ روتی پھرے۔

**قومی غفلت**

یہ سوال ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے کہ صاحب! ان فتنوں میں گرفتار ہیں کیا کریں مگر دل میں یہ ہوا ہے کہ اللہ نے فتنے برسا دیئے۔ بس اللہ تعالیٰ کی شکایت ذہن میں آتی ہے۔ اپنے نفس کی کوئی شکایت ذہن میں نہیں آتی کہ میں نے کیا کیا۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ اس بری ہے کہ کوئی اس کا شکوہ کرے، اس کے ہاں تو دروازے کھلے ہوئے ہیں، لینے والا کوئی ہونا چاہئے۔۔۔؟ اقبال نے ایک جگہ "جواب شکوہ" میں کہا ہے۔ جو گویا اللہ کی طرف سے شکوہ کا جواب آیا ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں

جب کوئی سوال کرنے والا ہی نہ ہو تو وہ کیسے دے۔

حدیث شریف میں ہے کہ روزانہ اخیر تہائی رات میں حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ ۔

انا الرازق من ذاالذی یسترزقنی
انا الغافر من ذاالذی یستغفرنی

میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا۔۔۔؟
میں مغفرتیں کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت مانگنے والا؟
جن کو اللہ نے توفیق دی وہ مانگتے ہیں اور انہیں شخصی طور پر ملتا بھی ہے۔

لیکن قوم غافل ہے، نہ وہ مانگتی ہے، نہ اسے ملتا ہے۔۔۔ غرض ہاتھ پھیلا کر کہہ رہے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا۔۔۔؟ تو صحیح ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں

جس مٹی سے انسان کو بنایا گیا تھا، اس مٹی میں ہی پیداوار نہ رہے۔۔۔ تو شیطانی روح حلول کر گئی تو نصب العین شیطان سے مل گیا۔ آدم سے کہاں باقی رہا؟

## زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت

اب ذہن میں یہ تو آتا ہے کہ اللہ میاں نے دوسری اقوام کو سب کچھ دے دیا' اور ہم سے سب کچھ چھین لیا۔۔۔ یہ نہیں آتا کہ کیوں چھینا۔۔۔؟ اور ہم نے کیا کیا۔۔۔؟ تو سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے' ہمارا فرض ہے کہ زندگی حضور علیہ السلام کے طریقے پر گزاریں اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تھوڑی بہت تعلیم نہ ہو اور تھوڑی بہت تربیت نہ ہو۔۔۔ سنتیں آسمان سے برستی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ گھر گھر میں اتریں۔ وہ تو تعلیم کے راستے سے آتی ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہو گیا۔۔۔ کتنے ہیں ہم میں جو واقعی قرآن کریم کو اس نیت سے پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہمیں عمل نصیب ہو جائے؟

بہت سے وہ ہیں جو پڑھنا ہی نہیں جانتے' انہوں نے تعلیم ہی نہیں پائی' لفظوں کی بھی تعلیم نہیں۔۔۔ معنی کی بات تو الگ ہے اور مفہوم کی الگ ہے۔ سو میں ننانوے وہ نکلیں گے جنہیں مس بھی نہیں کہ دین کیا چیز ہے مگر مدعی دین بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ صاحب! ہم دین دار ہیں۔۔۔ شاید سو میں کوئی دو چار گنے چنے نکل آئیں گے۔۔۔ تو قوم' نیک قوم تب کہلاتی ہے جب اس کی اکثریت نیکی پر ہو۔ ہزار دو ہزار میں سے اگر دس بیس اشخاص نکل آئیں تو وہ قوم کی سر بلندی نہیں ہے۔ وہ ان اشخاص کی سر بلندی ہے' قوم کی سر بلندی جب ہو گی جب کم سے کم اکثریت تو آئے۔ برابر سرابر تو ہو۔ اب ہماری کیفیت یہ ہے کہ:

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ

مومنین کم ہیں۔ فساق و فجار زیادہ ہیں۔ اور جتنے مومن ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم نے شکایت کی ہے کہ:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ

بہت سے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ دلوں کے اندر وہی غیر اللہ کی عظمت جمی ہوئی ہے۔ مالک کی عظمت نہیں ہے کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر مجھے اولاد دے گا' کوئی کہہ رہا ہے فقیر مجھے منہ مانگی مراد دے گا۔ جو اللہ کی عظمت تھی وہ فقراء اور اشخاص کے سپرد کر دی۔ اس میں قوم کا کیسے بیڑا پار ہو گا؟ تو یہ طلب ہوتی ہے کہ فتنوں سے بچنے کی صورت بتائی جائے یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے۔

## کم ہمتی کی انتہا

اور بڑے سے بڑا کام کریں گے تو یہ کہ صاحب! کہ ایک تعویذ لکھ دیں' دکان میں برکت ہو جائے۔۔۔ میں نے کہا تجھے کچھ نہ کرنا پڑے' جو کرے بس تعویذ کھڑا ہو کر کرے' تم اپنا آرام سے بیٹھے رہو۔۔۔ تو عمل کی خو جاتی رہی' بس تعویذ سب کچھ بنا دے گا۔۔۔ یا کوئی دعا لکا دی دعا بھی جبھی کار آمد ہوتی ہے جب اپنے اندر کچھ جان ہو۔ ورنہ

ایسا ہے جیسے کوئی کسی کے پاس جائے کہ حضرت! دعا کرو کہ میرے اولاد ہو جائے۔ اور نکاح کا نام نہیں۔ بیوی پاس نہیں۔۔۔ بھئی! دعا بھی جبھی کار آمد ہوتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرے۔ دعا نتیجے کے لئے کرائی جاتی ہے کہ اسباب پر ثمرہ مرتب ہو جائے' یہ نہیں ہوتا کہ اسباب بھی دعا ہی سے مہیا ہو جائیں گے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ ۔

"حضرت! مجھے نماز پڑھنے کے لئے تعویذ لکھ دو!"

حضرت نے فرمایا۔ "بھئی مجھے ایسا کوئی تعویذ لکھنا نہیں آتا کہ میں تعویذ لکھ کے اس میں دو سپاہی بھی بٹھادوں کہ جہاں نماز کا وقت آیا اور وہ ڈنڈا لے کر تیرے سر پر ہو جائیں کہ چل مسجد میں۔۔ میرے پاس ایسا تعویذ نہیں ہے کہ اس میں دو سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔۔۔ اور پھر اس کو ڈانٹا کہ ۔

"نالائق! جو تیرے کرنے کا کام ہے۔ وہ بھی تعویذ ہی کرے۔ تجھے اپنی چارپائی سے ہلنا نہ پڑے۔ تو آرام سے پڑا رہے، بس تعویذ سب کچھ کر دے گا"۔

تو تعویذ کار آمد ہے مگر جبھی جب آپ اسباب مہیا کرلیں۔ نتیجے کے لئے تعویذ ہوتا ہے' دعا ہوتی ہے کہ اللہ ثمرہ مرتب کر دے' یہ محنت رائیگاں نہ جائے' محنت کے لئے تعویذ تھوڑا ہی بنایا جاتا ہے کہ صاحب! مجھ سے عمل کرالو۔ کان پکڑ کے مجھ سے عمل کرادو' عمل تو آپ کی ہمت کرے گی۔ دوسرے کے کان پکڑنے سے عمل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

## عزم وہمت کی ضرورت

اصل چیز دین میں صرف ہمت ہے۔ آدمی عزم باندھ لے کہ یہ مجھے کرنا ہے کہ پھر مدد خداوندی ہوتی ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے۔ ڈانواں ڈول رہے۔ عزم ہی نہیں اس کی مدد بھی نہیں ہوتی' تو آپ کے دلوں میں تمنا تو ہے کہ فتنے رفع ہوں مگر دل میں عزم نہیں ہے کہ آپ انہیں رفع کر دیں گے۔

اس لئے عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔ دنیوی معاملات میں بھی اگر محض تمنا ہو کہ مجھے ماہوار ہزار روپیہ آمدنی ہو' کبھی نہیں ہو گی' لیکن جب عزم کریں گے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار کمانا ہے۔ چاہے تجارت کرنی پڑے' چاہے زراعت کرنی پڑے' چاہے ملازمت کرنی پڑے مجھے ایک ہزار کی آمدنی کرنی ہے۔ اور اس کام میں آپ لگ گئے تو مدد خداوندی ہو گی۔ ضرور ایک ہزار کی آمدنی ہو جائے گی۔

لیکن اگر نہ دکان پر جائیں' نہ دفتر میں جائیں نہ کھیت میں جائیں اور تمنا یہ ہے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار ملے تو ایک ہزار روپیہ ماہوار کی کوئی بارش تھوڑا ہی برسے گی؟ کئے کرنے سے آئے گی۔

## بلا اسباب دعا مئوثر نہیں

دعا بھی جبھی کام دیتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرا کے دعا کرے کہ صاحب! اتنا کام تو میں نے کر دیا کہ میں وضو کر کے پانچ وقت مسجد میں جاتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے کہ میں اس پر جمار ہوں' مستقیم رہوں۔ اس کی دعا ہو سکتی ہے۔۔ لیکن یہ کہ میرا ارادہ تو نماز پڑھنے کا ہے نہیں۔ آپ دعا کر دیں کہ نمازی ہو جاؤں۔ ایسا بھی دنیا کا کوئی دستور اور فطرت ہے ؟

اسی واسطے ایسے دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جس کو مشیت کے اوپر محول کیا جائے۔ یوں کہا جائے۔

اللهم اغفرلی ان شئت اللهم ارحمنی ان شئت

"اے اللہ! میری مغفرت فرمادے' اگر تو چاہے' اے اللہ میرے اوپر رحم فرما اگر تو چاہے"۔

رحم و مغفرت تو وہ جبھی کریں گے' جب چاہیں گے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "اگر آپ چاہیں میری مغفرت کر دیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو ضرورت ہے نہیں آپ کی مغفرت کی' آپ چاہیں تو مغفرت کر دیں' یا یہ کہ مجھے تو آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے' آپ چاہیں تو میرے اوپر رحم کر دیں' اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ دعا کو مشیت کے ساتھ مقید کر کے دعا مت مانگو کہ آپ چاہیں تو دے دیں۔ مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔۔۔ حضور ﷺ نے ممانعت فرمائی۔۔۔ فرمایا کہ دعا مانگو اس الحاح اور قوت کے ساتھ کہ ہم لے کر اٹھیں گے۔ کریم کے دروازے پر آئے ہیں۔ محروم ہو کر نہیں جائیں گے' تو لپچڑ بن کے دعا مانگو تو دعا ضرور قبول ہو گی اور ملے گا۔۔۔ تو سائل بن کر اور لپچڑ بن کر سوال کریں اور چوکھٹ پر سر ٹیک دیں کہ میں بغیر لئے اٹھوں گا نہیں۔۔۔ تو ایسے بندے کی دعا بے شک قبول ہوتی ہے۔

وہاں حج پر ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ بالکل بے پڑھا لکھا۔۔۔ اور صاحب! اس نے جو دعا مانگی عجیب تھی۔۔۔ اس نے کہا۔

یارب البیت یا رب البیت جئتك والاھل فی البیت ان تغفرلی

"اے اللہ! میں تیرے گھر میں آیا ہوں اور بیوی بچوں کا چھوڑ کر آیا ہوں"۔

گویا بڑا احسان کیا۔۔۔ تو بیوی بچوں کو چھوڑ کے آیا ہوں' وہ گھر میں ہیں اور میں تیرے گھر میں آ گیا۔ لہذا بخشنا پڑے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بلا مغفرت کے جاؤں' میں تو مغفرت لے کر جاؤں گا۔۔۔ واقعی ایسے کو مغفرت ملتی ہے۔۔۔ غرض الحاح بھی ہو' زاری بھی ہو' قلب کا جھکاؤ بھی ہو' قلب کے اضطراب سے دعا ہو۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ

"جو مضطر ہو کر الحاح تام کے ساتھ دعا مانگے گا' ہم ضرور برائی رفع کریں گے' اس کے اوپر سے فتنہ ضرور ہٹائیں گے۔۔۔اور زمین کی قوت وخلافت بھی دیں گے اور اقتدار بھی دیں گے"۔

تو مانگنے والا ہو' قول سے بھی مانگے' عمل سے بھی مانگے۔۔ عمل کرے تو وہ کرے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو' اور دعا وہ مانگے جس میں استغناء کا شائبہ نہ ہو' لپچڑ بن کر مانگے' تو ضرور ملتا ہے۔۔۔ تو اب آپ دعا سے بھی مستغنی' تعلیم سے بھی مستغنی' تربیت سے بھی مستغنی' پڑھنے لکھنے سے مستغنی' محنت سے مستغنی' اور تمنا یہ ہے کہ سب کچھ ملے۔ یہ فطرت اللہ کے خلاف ہے۔

## عزت واقتدار کا قانون عام

دنیا میں حق تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری تھوڑا ہی ہے کہ اس قوم کو ضرور اقتدار دیں گے' انہوں نے تو اصول و قوانین بیان کر دیئے' جو ان پر چلے گا اسے ملے گا' جو نہیں چلے گا' نہیں ملے گا۔ قانون عام کا اعلان کر دیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ

"مسلمانوں ہوں یا صابی ہوں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔ مجوسی ہوں یا کسی اور قوم کا ہو' جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا' اس کے لئے اجر بھی ہے نہ پھر خوف رہے گا' نہ غم رہے گا' نہ اسے محرومی رہے گی"

تو تدبیر تو یہ آگئی' اب آپ کو کیا تدبیر بتائی جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ اور کون آ کر کہے؟ کیا حضرت جبرئیل کہنے کے لئے آئیں گے؟۔۔۔ نہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب اتار دی' پڑھو' علم حاصل کرو اور احکام معلوم کرو' تعلیم نہیں پائی' علماء سے پوچھ پوچھ کر احکام حاصل کرو' مگر اتباع کا جذبہ رکھو کہ پابندی کریں گے۔۔۔ خواہ پڑھنے سے ہم معلومات حاصل کریں' خواہ مطالعہ سے ہم معلومات حاصل کریں' خواہ علماء سے فتوے لے لے کر ہم معلومات حاصل کریں۔ سوال کر کر کے اپنی تشفی کریں' ہمیں عمل کرنا ہے۔ اور اتنا علم ہم نے حاصل کرنا ہے جس پر ہم عمل کر سکیں۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ جب آدمی کے دل میں لگن ہوتی ہے تو دس طریقے اختیار کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کسی عورت کا شوہر ملازمت پر گیا' اور وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر تھا۔ عورت کو خاوند سے محبت تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اگر خاوند کا خط آتا' چونکہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی مگر چونکہ خاوند کی لگن اور محبت تھی تو محلے میں پھرتی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے پڑھ کے سنا دے کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اگر دل میں لگن نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھروں کو جا کے نہ

جھانکتی، تو بے پڑھی لکھی تھی، مگر چونکہ خاوند سے محبت تھی، اس کارڈ کا ایک پرزا آیا تو گھر گھر پھر رہی ہے کہ اللہ کے واسطے اس کا مضمون سنادو کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے کہ لگن ہے۔

اللہ کا آپ کے گھر خط آیا۔۔۔ اور وہ قرآن کریم ہے جو اللہ کا فرمان ہے۔ اگر آپ کے دل میں لگن ہوتی اور علم نہ ہوتا، آپ علم کے لئے گھر گھر، مدرسے مدرسے جھانکتے پھرتے کہ اس کا مجھ مطلب سمجھادو، یہ میرے مالک کا فرمان ہے۔ میرے مالک کا خط آیا ہوا ہے۔ غرض لگن ہو تو سب کچھ ہوتا ہے اور لگن نہ ہو تو پھر آدمی مگن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اندر کڑھن ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

## خاصیت ذکر اللہ

صاف فرمادیا گیا ؂

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

اگر تم دلوں کا اطمینان اور سکون چاہتے ہو تو ذکر اللہ میں لگو، ہماری یاد میں لگو، ہم سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون مخفی ہے دنیا کے لاکھ اسباب آپ جمع کرلیں۔ سکون قلب کبھی میسر نہیں ہوگا۔ جو آج تمام اسباب ووسائل کو جمع کئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ پریشان خاطر ہیں، ہر وقت ڈانواں ڈول ہیں کہ یہ اسباب چھوٹ نہ جائیں، اقتدار کہیں چلا نہ جائے۔ رات دن مصیبت میں مبتلا ہیں۔۔۔ اور جو اللہ کا ذکر کر کے ان پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ہے نہایت مطمئن اور ساکن القلب ہیں۔

آپ سکون قلب غیر اللہ میں اور دنیا کے وسائل میں تلاش کریں۔ وہ کبھی میسر نہیں ہوگا، ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی یاد ہو۔ اس سے دل کو سکون آتا ہے، آپ گھروں کے اندر کتنا ہی پریشان ہوں، مصیبت زدہ اور مبتلا ہوں مگر جب مسجد میں آتے ہیں ایک سجدہ کرتے ہیں دل ٹھہر جاتا ہے کہ میں نے اپنے مالک کے آگے عرض و معروض کردی، تو گھر میں سکون نہیں ہوتا، مسجد میں آکے ہوجاتا ہے تو ذکر اللہ کا خاصہ قلب کا سکون ہے۔

### ذکر اللہ اور اسٹالن

یہ جو اسٹالن تھا جو کمیونسٹوں کا امام ہے جس نے کمیونزم ایجاد کیا، جب یہ مرنے لگا تو خدا کا بالکل منکر تھا۔ دین ومذہب کا انکار کرتا تھا جب مرنے لگا تو اس کی زبان سے اللہ اللہ جاری ہوا اور یہ کہنا اس نے شروع کیا۔

لوگوں نے کہا بھئی! تو تو خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا، اب تو کیسے کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا، میں اب بھی انکار کرتا ہوں۔۔۔ کمبخت محروم تھا۔۔۔ اس لئے کہا کہ اب بھی انکار کرتا ہوں مگر اسے کیا

کروں کہ دل میں سکون اسی نام سے ہوتا ہے۔

اور سکون کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر میں گنیوں کا نام لوں ُروپے کا نام لوں قلعوں کا نام لوں سکون نہیں ہوتا' ساری چیزیں مجھ سے دور ہونے والی ہیں' چھننے والی ہیں' جب یہ نام لیتا ہوں دل ٹھہر جاتا ہے۔ تو میں منکر ہوں۔ مگر اس کے باوجود سکون قلب اسی سے میسر آتا ہے۔

تو ایک دھریہ اور ملحد تو اس کا احساس کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ اور ایک ماننے والا مسلم اقرار نہ کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ نہ وہ فکر کرے' نہ وہ ذکر اللہ کرے' نہ دل میں یادداشت رکھے تو جب مسلمان اتنے غافل بن جائیں تو انہیں سکون کے ثمرات اور رزق کے اسباب اور اقتدار کے اسباب کہاں سے ملیں گے۔

تو میرے بھائی نے یہ درخواست کی تھی کہ مسلمان مصائب میں گرفتار ہیں۔۔۔ کیا علاج کریں؟

بھئی علاج یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔۔ سب کے لئے ضروری نہیں کہ سارے علماء بن جائیں اور سب کے سب امام غزالی بن جائیں۔

## ادائیگی فرض

مگر اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو سب کے لئے فرائض رکھے ہیں ان کی تو پابندی شروع کرو' پانچ وقت کی نماز پڑھو' اگر صاحب نصاب اور صاحب استطاعت ہو' زکوۃ اور صدقات سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرو۔ روزہ رکھ کر اپنے نفس کو پاک کرو' اگر استطاعت ہو تو حج کر کے اپنے عشق کے جذبات ابھارو' حسن سلوک سے پیش آؤ' ہر ایک سے محبت سے پیش آؤ۔۔۔ حسن ظن رکھو۔ دیکھو پھر قوم جڑتی ہے یا نہیں جڑتی؟

ہر ایک کے دل میں جو بد ظنی ہے کہ وہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔ بس میں کارآمد ہوں۔ وہ بھی نالائق اور مجھ میں لیاقت ہے۔ جب یہ جذبات ہوں گے۔ محبت باہمی کیسے پیدا ہو گی۔۔۔۔؟ اپنی برائی سامنے نہیں اور دنیا کی برائیاں سامنے ہیں اور ہم ایسے مقدس ہیں کہ ہم میں کوئی برائی نہیں۔ ساری برائیاں دنیا کے انسانوں میں ہیں۔ تو یہ سب سے بد ظنی ہے تو بد ظنی سے نہ کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کوئی محبت ہوتی ہے' تو حسن ظن سب سے بڑی چیز ہے کہ اپنے کو کمتر سمجھے اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھے' اس سے حسن ظن پیدا ہو گا۔

## معیار اقتداء

آپ کا آخری بادشاہ ظفر جو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ کچھ تو اپنی ذات سے بھی صوفی منش اور کچھ حالات نے بھی غریب کو صوفی بنا دیا تھا۔۔۔ اس نے ایک قطعہ کہا ہے۔ وہ واقعی بڑی عبرت کا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر

رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

دنیا کو آپ برا جب ہی سمجھیں گے جب اپنی برائی سامنے نہ ہو‘ جب اپنے عیب سامنے ہوں‘ ہر ایک آپ کو پاک صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا‘ اب یہ کہ ع

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

جب دیکھو دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے خود اپنے کو بھلائے ہوئے ہے۔ اس سے کام نہیں چلتا‘ دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کے بارے میں نظر رہنی چاہئے کہ اس بے چارے کی تو سو روپے ماہوار کی آمدنی ہے اور مجھے ہزار پانچ سو روپے کی آمدنی ہے۔ آدمی شکر کرے۔۔۔ اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر پر نظر ہونی چاہئے کہ یہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہے۔ افسوس مجھے توفیق نہیں۔۔۔ تو دنیا کے بارے میں اپنے سے کم تر کو دیکھے‘ اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھے تاکہ زیادہ رغبت پیدا ہو۔

اب لوگوں نے بالکل قصہ برعکس کر دیا کہ دین کے بارے میں تو اپنے سے کمتر کی اقتداء کرتے ہیں۔ میری نمازیں بہت ہیں۔ یہ تو نالائق آدمی ہے‘ اس کی نہ نماز پوری نہ کچھ‘ اور دنیا کے بارے میں اپنے سے برتر کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں کہ مجھے سو روپے کی آمدنی ہے۔ مجھے دو سو کی چاہئے۔ جس سے حرص بڑھتی ہے اور حرص کا انجام برا نکلتا ہے۔ غرض لوگوں نے قصہ الٹ کر دیا۔

بہر حال دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھا جائے‘ تاکہ دین کی حرص پیدا ہو اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو تاکہ شکر کا جذبہ پیدا ہو کہ مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے ظفر نے کہا کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور آگے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا

کہ بڑا مدبر‘ لیڈر‘ دانشمند‘ ذہین ہو اس کو آدمی نہ جانئے گا۔ تو کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

وہ آدمی نہیں ہے عیش میں آدمی اس پر نگاہ کرے کہ جو دینے والا ہے اس کا حق ادا کروں‘ اس سے ڈرتا رہوں‘ جسے دینا آتا ہے اسے چھیننا بھی آتا ہے۔ جتنا آدمی شکر ادا کرے گا۔ اسے زیادہ ملے گا‘ کفران نعمت کرے گا وہ نعمت چھین لی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے ؂

لَئِنْ شَکَرتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ

جتنا نعمت پر شکر کرو گے‘ میں نعمت کو بڑھاؤں گا۔

وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْد‘‘

اور اگر تم نے کفران نعمت کیا تو میرا عذاب بھی دردناک ہے۔ پھر وہ ساری نعمتیں چھینی جائیں گی۔

## مسلم کے لئے اسباب اقتدار

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے‘ اس کی اطاعت میں رہ کر تھوڑی عبادت پر بھی شکر بہت کرے‘ تاکہ وہ عبادت بڑھتی جائے‘ اپنی اطاعت پر غرہ نہ کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ حدیث فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھ کے یا کچھ ذکر کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی‘ میں نے تلاوت کی میں نے ذکر کیا‘ گویا غرور اور اتراہٹ ہے کہ میں نے بڑا کام کیا۔۔۔ فرماتے ہیں۔۔۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا! ارے طاقت میں نے بخشی تھی‘ ارادہ میں نے پیدا کیا تھا۔ اسباب میں نے مہیا کئے تو نے کیا کیا۔ غرض جتنا کیا اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔

اور اگر سب کچھ کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں بن پایا۔۔۔ فرماتے ہیں۔ نہیں چل کر مسجد تک تو ہی گیا تھا‘ طاقت کا استعمال تو نے ہی کیا تھا۔ حج کے لئے سفر کرنے کا ارادہ تو نے ہی کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کر لیا‘ تو سب کچھ کر کے جو یوں کہتا ہے کہ کچھ نہیں کیا‘ اس کا جواب دیتے ہیں کہ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ اور اگر تھوڑا بہت کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے یہ کیا‘ میں نے یہ کیا‘ اسے فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا۔ قوت میری تھی‘ ارادہ میرا تھا‘ مشیت میری تھی‘ اسباب میرے تھے‘ تو نے کیا کیا؟

اس لئے ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے مالک کے آگے جھکیں اور جھکنے کے بعد غرہ نہ کریں‘ ہر قدم پر سمجھیں کچھ نہیں ہو سکا‘ توبہ کریں‘ استغفار کریں‘ اور آگے بڑھیں‘ جب قوم میں یہ جذبہ ہو گا‘ قوم بڑھے گی۔۔۔ اگر یہ جذبہ نہیں۔۔۔ وہ لاکھ سوچتی رہے کبھی مرکز اقتدار پر نہیں پہنچے گی‘ اقتدار

تمناؤں سے نہیں ملا کرتا، نہ تمناؤں سے عزت ملا کرتی ہے۔ اور نہ غیر اسباب سے عزت ملتی ہے۔ انہی اسباب سے عزت ملتی ہے۔ جنہیں اللہ نے مسلم قوم کے لئے متعین کر دیا ہے۔ غیر اقوام سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ مسلم سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ جو یہ دعوی کرے کہ میں آپ کا ہوں، اس کے ساتھ معاملہ اور قسم کا ہے۔

## دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ

اور جو یہ کہے کہ میں آپ کا نہیں ہوں، اس کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے، دشمن ہے تو آدمی اس کی گالیوں کو بھی سہہ جاتا ہے کہتا ہے کہ دشمن ہے۔ اور اس کا کیا کام ہے۔ گالیاں ہی دے گا اور اپنا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو باپ دھول رسید کرے گا کہ تجھ سے توقع نہیں تھی۔۔۔ اس لئے مسلم کی ادنی سے ادنی چیز پر گرفت ہوتی ہے تو ہمارا تھا، تیرا دعوی تھا کہ اَنَا مُسْلِم "میں مطیع خداوندی ہوں اور پھر تو نے یہ حرکت کی؟

اور ایک قوم کہتی ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ انہیں سب کچھ دے دو، ایک وقت آئے گا کہ اچانک عذاب کا پنجہ ان پر گرے گا جب انہیں پتہ چل جائے گا۔ تو دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں اور دوست کو ڈھیل نہیں دی جاتی، جو غلطی کرتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ سزا دی جاتی ہے۔ اور کافر کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ گالیاں بھی دے دے، دین کی تکذیب بھی کر دے، دین کا مذاق بھی اڑائے، اسے ڈھیل دیتے ہیں کہ اس کے انجام کی خرابی کا وقت آ رہا ہے۔۔۔ غرض میرا مطلب یہ تھا کہ بھئی! تدبیر تو سب پوچھتے ہیں لیکن یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اس تدبیر کو عمل میں کون لائے گا؟۔۔۔ یہ کہتے ہیں کہ عمل کے لئے یہودی اور نصرانی ہیں۔ باقی ہمیں تو تدبیر بتلا دو، تاکہ ہمارے دماغ میں فرحت آ جائے کہ ہمیں تدبیر معلوم ہو گئی، عمل کرنا دھرنا نہیں ہے۔ یہ دوسری قوموں کا کام ہے۔ جب دوسری قومیں کریں گے تو وہی پائیں گے بھی۔۔۔ پھر آپ رشک کیوں کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں سب کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ کیا تھا تو انہیں کچھ ملا، آپ نے نہیں کیا، نہیں ملا۔

## تدبیر عمل

اسلام کے معنی مسلم بننے کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی "مطیع حق" کے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ میں مسلم ہوں، اس کے معنی ہیں کہ میں اپنے پروردگار کا مطیع ہوں، پھر اس کے اطاعت کو کر کے دکھلائیے۔۔۔ تو یہ حدیث معاذؓ میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

هل تدرى ما حق الله على العباد؟

اے معاذؓ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟

وہ یہ ہے کہ۔

**ان یعبدوا اللہ ولا یشرکوا بہ شیئاً**

تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں' اس کے قانون پر چلیں' اس کے نبیؐ کی سنتوں کی پیروی کریں اور جذبہ ولگن ان کے دل میں یہی ہو کہ ہمیں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے اور غیر رب کو ہم شریک نہیں کرنا چاہتے تو یہ حق ادا کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا۔

**ھل تدری ما حق اللہ علی العباد؟**

کیا یہ جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟

فرمایا۔ بندوں کا حق یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جب تم عابد بنو گے تو میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ رزق معنوی بھی' رزق باطنی بھی' رزق حسی بھی' رزق ظاہری بھی۔۔۔ سبھی کچھ ملے گا' دونوں چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ اس لئے ساری تدبیر ان ایک حدیث میں فرمادی گئی۔ اگر عمل کرنا چاہیں تو یہ ایک حدیث بھی زندگی درست کرنے کے لئے کافی ہے اور عمل نہ کرنا چاہیں تو ایک ہزار وعظ بیٹھ کر آپ سن لیں' کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ وہ وعظ اور وبال جان بنیں گے۔

**دنیادار علماء**

اس واسطے کہ وعظ میں کچھ مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ اگر آدمی جاہل ہے اور غلطی کر جائے تو ایک عذر ہے کہ صاحب! مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ معلوم کر کے پھر نہ کرے تو یہ مصیبت اور وبال ہے وہ متنبیؔ ایک موقع پر کہتا ہے۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| وان | کنت | لاتدری | فتلك | مصیبة |
| وان | کنت | تدری | فالمصیبة | اعظم |

اگر تم جانتے نہیں ہو جاہل ہو یہ ایک مصیبت ہے' اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ ڈبل مصیبت ہے۔

اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو بددعا دی ایک دفعہ اور عالم کو سات دفعہ۔۔۔ فرمایا۔

**ویل للجاھل مرة وویل للعالم سبع مرات**

جاہل ایک دفعہ برباد اور' عالم سات دفعہ برباد' جو علم رکھتا ہے پھر عمل نہیں کرتا۔ اب اگر ایک عالم ہے اسے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا علم ہے۔ وہ اللہ ہی کی رضا کی پابندی کرے گا' غیروں کی رضا نہیں کرے گا۔۔۔ اب اگر کوئی مولوی یہ کہے کہ صاحب! مسئلہ تو بے شک یہ ہے مگر آمدنی کا تعلق فلاں سے ہے۔ لہذا کیا حرج ہے۔ اس کی دلداری کے لئے اس کے مطابق مسئلہ بیان کر دو۔۔۔ وہ اللہ کا بندہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ تو ابلیس کا بندہ بن گیا کہ جس سے چار پیسے مل گئے تو فتوی بھی اس کے

مطابق دے دیا۔

وہ مسئلہ کیا ہوا۔ وہ تو موم کی ناک ہو گئی کہ جیسے دنیا کی غرضیں سامنے آتی جائیں ویسے ہی بدلتے جائیں۔۔ یہ عالم کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہل کا کام ہے۔ جس نے خواہ مخواہ علم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔۔ جو واقعی عالم ہے وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔

آدمی عالم ہو اور اپنی حاجات غیروں کے آگے پیش کرے۔ اور غیروں کی رضا اتنی ہو کہ چاہے مجھے دین کا مسئلہ بھی بدلنا پڑ جائے مگر مجھے یہ چار پیسے مل جائیں۔ یہ علم اور علماء کی شان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ در حقیقت علماء میں بھی نہیں۔ وہ نام کے علماء ہیں۔ عالموں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

**وان کنت تدری فالمصیبة اعظم**

جان بوجھ کر عمل نہیں کرو گے تو ڈبل مصیبت ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے جاہل کو ایک دفعہ بد دعا دی اور عالم کو سات دفعہ۔

## جدوجہد کا ثمرہ

بہر حال یہ چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی تھیں کہ بے شک فتنوں کی افراط ہے، پریشانیاں ہر طرف سے ہیں۔ مگر وہ ہماری لائی ہوئی تو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں برسائیں وہ تو پیدا کرنے والے ہیں۔ وہ اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کا بندہ کسب کرے، تو کاسب بندہ ہے۔ خالق اللہ ہے۔ تم کسی کام میں جدوجہد کرو گے وہ پیدا کر دیں گے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جدوجہد میں لگو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہ تخلیق فرمائے گا۔۔۔ تو فتنے ہیں بلا شبہ ہیں۔۔۔ مگر

اے باد صبا، ایں ہمہ آوردہ تست

یہ تمہارے ہمارے ہی لائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا۔

**وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ**

کوئی مصیبت تم تک نہیں پہنچتی جب تک تم ہی اپنی کرتوت سے اس مصیبت کو اپنے اوپر نہ ڈال دو، تمہارے کئے ہوئے کا یہ سب ثمرہ ہے۔ تو ہم نے جو کیا وہ کیا ادھر اسامنے آگیا۔۔۔ اور اگر نیکی کا کام کریں گے اور نیکی کی راہ پر چلیں گے تو پھر دوسرا ثمرہ آجائے گا۔۔ ثمرہ حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عدل ہے۔ ان کا نام ہی العدل اللطیف الخبیر ہے۔ ان سے زیادہ عادل کون ہے۔ تو کسی کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں فرماتے۔

**فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ**

کسی محسن کے احسان کو اور عمل کو رد نہیں فرماتے۔۔۔ آدمی کر کے دیکھے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کچھ جدوجہد بھی کیجئے، کچھ دین کی معلومات اور تعلیم بھی حاصل کیجئے۔ کچھ اپنی تربیت کی

طرف بھی متوجہ ہو جائیے۔ کسی مربی سے تعلق پیدا کر کے اپنے اخلاق کی اصلاح کرائیے۔ تو خیر انشاء اللہ ظاہر ہو گی۔

اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور وہ شاعر کا قطعہ ہے' وہ پڑھ لیتا ہوں۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم
روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس
بر رسولاں بلاغ باشد وبس

شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اپنی جگہ بہت نصیحتیں کر لیں۔

ایک بڑا زمانہ ہم نے صرف کیا' ہم نے بڑی نصیحتیں کیں' اب اس کے بعد بھی کسی کے کان میں نصیحت نہ جائے اور دل میں نہ اترے' تو نصیحت کرنے والے کام کا تبلیغ اور پہنچا دینا ہے۔ منوا دینا اس کا کام نہیں ہے۔ آدمی مانے گا تو اپنے اندرونی جذبے اور دیانت سے مانے گا۔۔۔ اس واسطے تدبیر میں نے عرض کر دی' عمل آپ کو کرنا ہوگا۔ اب یہ کہ تدبیر بھی بتلاؤں اور عمل بھی کر لوں۔۔۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ بھئی میرے عمل کرنے سے پوری قوم تر جائے گی تو چلو یہ بھی ہو جاتا' مگر قوم ہی کے عمل کرنے سے قوم ترے گی' کسی ایک کے عمل کرنے سے کسی دوسرے کو نجات تھوڑا ہی مل جائے گی۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلاَّ مَاسَعٰی

جو سعی کرے گا وہی انسان پائے گا' سعی تو ایک کرے اور دوسرے کو مل جائے' یہ سنت اللہ کے خلاف ہے جو کرے گا۔ اسی کو ملے گا۔۔۔ اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں' فتنے اور مصائب واقعی ہیں۔ ان کا علاج جو واقعی ہے وہ عرض کر دیا گیا' اس کی تفصیلات پھر آپ علماء سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس عمل کو کس طرح کریں۔۔۔ اس عمل کو کس طرح کریں۔۔۔ مثلاً ایک عمل عبادت کا ہے تو پوچھنا پڑے گا کہ کس طرح سے نماز پڑھیں ایک عمل اجتماعیات کا ہے کہ دنیا کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ یہ بھی قرآن کریم سے پوچھئے اس نے بتلا دیا ہے۔ ایک عمل سیاست کا ہے کہ سیاسی تدبیریں کیا ہوتی ہیں۔ وہ بھی قرآن کریم نے بتلا دی ہیں کہ وہ یہ ہیں جن سے قوم اقتدار پاتی ہے۔ تو سب کچھ ہے۔۔۔ مگر یہ اسی کے لئے ہے جو کچھ کرے۔

## ایمان کے سونے کی ضرورت

اگر ہم یوں کہیں کہ آپ خالی جیب جا رہے ہیں۔ تو بازار میں چاہے کروڑوں روپے کا مال بھرا پڑا ہے۔ تو یہ ٹھیک ہو گا اس

لئے کہ جیب خالی ہے' وہاں سے تو وہ سامان لے کر آئے گا جو جیب میں پیسے لے کر جائے گا۔۔۔ تو اگر آپ بازار گئے اور ہم یوں کہیں کہ اس بازار میں کچھ نہیں' کوے اڑ رہے ہیں کوئی سامان نہیں۔۔۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاہے لاکھوں کا سامان ہو مگر تیرے لئے کچھ نہیں' اس لئے کہ تیری جیب میں پیسہ نہیں' پیسہ ہوگا تو کچھ لے کے آئے گا۔

غرض دل کی جیب میں ایمان کا سونا ہونا چاہئے۔۔۔ ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے' پھر دنیا کے بازار میں سب کچھ ملے گا' اور اگر دل خالی کر کے جا رہے ہیں جس میں ایمان باللہ نہیں' عمل صالح' پیروی سنت نہیں' پھر دنیا چاہے کروڑوں کی ہو مگر آپ کے لئے کچھ نہیں' خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔

## دعا

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی' عبرت پکڑنے کی' عمل کا جذبہ اختیار کرنے کی' عمل کی ہمت باندھنے کی' ہمت کے اسباب پیدا کرنے کی' صحبت صالحین اختیار کرنے کی' مطالعہ اختیار کرنے کی' سوال کرنے کی' ان سب چیزوں کی توفیق دے' جن سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

اللھم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اللھم ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ واعین واجعلنا للمتقین اماماً

اللھم ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین.

اللھم و توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین.

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمدواله وصحبه اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین

## تنبیہ

یہ دعا بھی کر دی ہے اور یہ عزم لے کر جایئے کہ اس پر عمل کرنا ہے' اس کی ٹوہ میں لگنا ہے۔ ہمیں دینی اور اخلاقی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پھر انشاء اللہ مدد خداوندی ہوگی۔۔۔ اور ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ عام طور سے عادت یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں۔۔۔ تو میں کمزور ہو رہا ہوں۔ اور ضعیف ہو رہا ہوں۔ آپ میں سے تو ہر ایک کو ایک دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا' مجھے پانچ سو دفعہ' میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ لہذا مصافحہ سے معاف رکھیں اور گزر جانے دیں۔ بس دل میں مل گئے' یہ کافی ہے۔ ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔

وصلی اللہ علیٰ نبینا ورسولنا محمد والہٖ وصحبه وبارك وسلم

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# تعلیم نسواں

دین مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے' ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں جیسے رسالت اور قاضی القضاۃ کا عہدہ کہ عورت رسول اور قاضی نہیں بن سکتی کیونکہ اس کی قابلیت عورت میں نہیں مگر سب سے بڑا کمال جو نبوت کا ہے ایک بڑی جماعت اس پر ہے کہ عورت کو نبوت مل سکتی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِينُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا............اَمَّابَعْدُ............

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

## ترقی کا پہلا زینہ

عزیز بچیو' محترم بہنو اور استانیو۔۔۔! آپ کے اس مدرسہ میں آ کر بیحد مسرت اور خوشی ہوئی۔ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی۔ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔۔۔ اسلام میں بھی سب سے پہلے پڑھنے ہی کی آیت نازل ہوئی اور فرمایا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ

اسلام سے قبل کا زمانہ بد اخلاقی' بد اعمالی' اور برائیوں سے بھرپور تھا لیکن اس زمانے کا نام بد اخلاقی اور بد اعمالیوں کا زمانہ نہیں رکھا بلکہ اس کا نام جہالت کا زمانہ رکھا' معلوم ہوا کہ برائی کا سرچشمہ جہالت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اسلام کا بنیادی سرچشمہ تعلیم ہے۔ تعلیم کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں کیا' سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے کھانے' پینے اور پہننے کا انتظام نہیں کیا بلکہ اولاً تعلیم کا بندوبست کیا جیسے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

انہیں اشیاء کے نام سکھلا کر ملائکہ سے مقابلہ کرایا اور وہ کامیاب ہوئے تو خلافت سے بہرہ ور کیا اور خلافت کا تاج سر پر رکھا۔ اس کے بعد فرمایا:۔

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

تو رہنے سہنے کا انتظام بعد میں ہوا' پہلے تعلیم کا انتظام کیا۔ معلوم ہوا کہ علم اور تعلیم کا بہت ورجہ ہے۔

### دنیا ایک تعلیم گاہ ہے

بغیر تعلیم کے حیوان اور انسان میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کہ باپ کو تعلیم دیتے اور بس کرتے بلکہ اولاد کو بھی تعلیم دی۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر دایاں ہاتھ مارا تو نیک اولاد نکلی۔ اور بایاں ہاتھ مارا تو بری اولاد نکلی۔ اور اس کے بعد تمام کو وادی ذاران میں جمع کر کے ان (روحوں) سے خطاب کیا۔ اور فرمایا:۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى

تو اس سے بھی مقصود تمام کو تعلیم دینا تھی ربوبیت کے بارے میں کہ میں تمہارا رب ہوں۔ تو اس سے بھی تعلیم کا اہتمام معلوم ہوا۔ گویا دنیا ایک مدرسہ ہے۔ اور تمام انسان اس کے طالب علم ہیں اللہ تعالیٰ اس کے معلم ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد ہیں۔ تو دنیا کی پیدائش کا مقصد تعلیم ہے اور اس کے بعد عبادت ہے حسن معاشرت ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے کہ طالب علم کے لئے وظیفہ ہو تاکہ کھانا پینا اور رزق حاصل ہو تو اس کے لئے زمین اور دریا بنائے' مطالعہ کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے تو چاند' ستارے اور سورج کو پیدا کیا۔ تو جب ہم اس دنیا سے قبر میں جائیں گے۔ اسی تعلیم سے متعلق سوال ہوگا'۔ (من ربک) اور اس کا امتحان ہوگا۔ یہ اول امتحان ہوگا۔ اور بڑا امتحان میدان حشر میں ہوگا۔۔۔۔ کچھ کامیاب ہوں گے اور کچھ ناکام۔ کامیاب کو انعامات دیئے جائیں گے۔ اور ناکام کو سزا دی جائے گی اور اس امتحان میں تمام شریک ہوں گے۔

اس میں بوڑھے' جوان اور بچے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ عالم ارواح میں تو تمام کی روح یکساں تھیں مگر آخر عمر کے اعتبار سے کہ جو پیدائش کے بعد جلدی مرے گا تو وہ بچپن اور جو جوانی میں مرے گا وہ جوان اور جو بڑھاپے میں وہ بوڑھا' تو ان روحوں میں بھی جوان بچے اور بوڑھے اس اعتبار سے تھے' اس لئے تعلیم کا اتنا لحاظ رکھا گیا کہ جوان اور عمر رسیدہ تمام سے امتحان ہوگا۔ تو تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور دنیا کے آباد کرنے کا مقصد یہی ہے۔

## عورتوں کی تعلیمی ذمہ داری اور اس کے نتائج واثرات

تعلیم کا سلسلہ عورتوں کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔۔۔ اس لئے ابتدائی تربیت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قوم کی تعلیم کا دارومدار ماں کی تعلیم پر ہے۔ اگر وہ جاہل ہے تو قوم جاہل رہے گی۔ الا ماشاء اللہ جس کی فطرت سلیم ہو اگر وہ عالم ہوئی تو اولاد بھی عالم ہوگی۔ اگر والد کے قلب میں تعلیم کی طرف رغبت موجود ہو تو بچے بھی اس کی رغبت سے فیض یاب ہوں گے' اگر ماں خود رغبت سے خالی ہے تو بچے بھی ایسے ہی رہیں گے۔ اسلئے سب سے پہلے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس وقت بھی سب سے پہلے اس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دائیں کان میں اذان دی جاتی ہے جس میں توحید ورسالت اور عبادت کی تعلیم ہے۔ تو اس اذان کے ذریعے اصول وفروع' عقائد واعمال کی تعلیم دی جاتی ہے اور حی علی الفلاح میں اس کا انجام اور نتیجہ بھی بتادیا جاتا ہے۔ کہ فلاح اور کامیابی ہے۔ جو آخرت میں تمہیں میسر ہوگی۔۔۔ تو ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں تعلیم کا کتنا بڑا مرتبہ اور درجہ ہے اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے۔

**طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة**

(علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)

تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد ہر مسلمان مرد وعورت کو معلوم ہو جائے کہ میں کیسا مسلمان ہوں۔ اور مسلمان کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے ادب واحترام سے پیش آنا' رہنے سہنے اور حسن معاشرت کا طرز عمل معلوم ہو اس لئے تعلیم واجب قرار دی گئی ہے تمام پر خواہ مرد ہو یا عورت اس کے بعد دوسرے اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو عبادت کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

تو حقیقت میں یہ مقصد عورتوں سے ہی حاصل ہوتا ہے کہ جب ماں تعلیم یافتہ ہوگی' بچہ کو بھی تعلیم سے آشنا کر دے گی۔۔۔ جس سے اس کے اخلاق سدھر جائیں گے اور اگر بالفرض ماں بچے کو تعلیم نہ بھی دے مگر وہ ماں نیکوکار اور با اخلاق ہے تو اس کو نیکوکاری اور حسن اخلاق کی برکت سے اولاد بھی دیندار بن جائے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو قوم میری فرماں برداری کرتی ہے تو میں اس کی سات پشتوں تک اور نسلوں تک رحمت کو بھیجا کرتا ہوں اور اگر فرماں برداری نہیں کرتی اس کی سات پشتوں تک لعنت بھجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی نیکوکاری اور بدکاری کا بڑا اثر ہے جو سات پشتوں تک جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ والدین جیسے ہوں ویسے ہی ان کے بچے بچی اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر والدین عالم ہیں تو بچے میں بھی علم کا اثر ہوگا کہ وہ جائز وناجائز کے مطابق گفت وشنید کرتا ہوگا۔۔۔ اگر دوکاندار ہیں تو بچے میں بھی دکانداری کے اثرات حساب وغیرہ کچھ نہ کچھ موجود ہوں گے۔ اگر

والدین کھیتی باڑی کرتے ہیں تو بچے میں بھی اس کا اثر موجود ہوگا۔ تو یہ اثر ہے ماں کے ماحول کا بچے پر اثر ہوگا۔

اب سب سے پہلا حق انسان پر اپنے نفس کا ہے۔ دوسرا حق اولاد کو پڑھانا کہ وہ صحیح راستہ پر چلے، یعنی مخلوق کا ہے۔ اور تیسرا حق معاشرہ کا ہے۔ اور یہ تینوں علم پر موقوف ہیں۔ تو جتنا علم حاصل کریں گے خاندان علمی بنتا جائے گا۔ اور ماحول خوشگوار ہوتا جائے گا۔

## ملکہ کے تقوے کا اس کی اولاد پر اثر

امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل کے دادا امیر دوست محمد کا واقعہ ہے۔ کہ اس کے ملک پر کسی نے چڑھائی کی، اس کی سرکوبی کے لئے اپنے ایک فوج اپنے ولی عہد شہزادے کے ہاتھ بھیجی، دو تین دن بعد اطلاع آئی کہ شہزادے کو شکست ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ اور دشمن اس کے پیچھے ہے اس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا اور کئی غم سوار ہوئے۔۔۔ شکست کا غم، شہزادے کی کمزوری کا اور قوم کی ملامت کا، تو وہ اس غم کے اندر محو ہو کر آیا اور بیگم صاحبہ سے تمام قصہ سنایا۔۔۔ بیگم نے کہا کہ یہ سارا قصہ غلط ہے۔ امیر نے کہا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپوٹ ہے وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ مگر بیگم نہ مانی کہ شکست ہر گز نہیں ہو سکتی۔ تو بادشاہ گھر سے نکل آیا کہ یہ عورت ہے۔ یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے گی۔ دوسرے دن اطلاع آئی کہ وہ خبر غلط ہے۔ شہزادہ فتح پا کر واپس آرہا ہے۔ اس پر بیگم نے شہزادے کی سلامتی اور فتح یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

بادشاہ نے پوچھا، تجھے کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ شکست نہیں کھا سکتا۔ کیا دلیل ہے تیرے پاس کہ میری پوری حکومت کو تو نے جھٹلایا۔۔۔۔۔؟

اس نے کہا کہ کچھ نہیں صرف اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ یہ میرا راز ہے۔ میں اس کو فاش نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ آخر اصرار کرنے پر بتایا جب شہزادہ میرے پیٹ میں آیا تو میں نے اس وقت سے عہد کر لیا تھا کہ میرے پیٹ میں مشتبہ لقمہ نہیں آنا چاہئے۔ اس لئے کہ حلال غذا سے اچھی طبیعت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں اور حرام غذا سے طبیعت فاسد ہوتی ہے اور اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، یہ شہزادہ نو مہینے تک میرے پیٹ میں رہا۔ اور ایک لقمہ غذا کا میں نے ایسا نہیں کھایا جو مشتبہ ہو۔ اس لئے اس کے اخلاق رذیل اور برے نہیں ہو سکتے۔ شہید ہونا یہ اچھا خلق ہے۔ اور پشت پھیرنا یہ اچھا خلق نہیں ہے۔۔۔ تو شہزادہ شہید ہو سکتا ہے اور کٹ کر مر سکتا ہے، مگر پشت پھیر کے فرار نہیں ہو سکتا۔

اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ جب یہ شہزادہ پیدا ہوا تب بھی مشتبہ غذا استعمال نہیں کی تاکہ اس غذا سے دودھ بن کر اس کے اخلاق پر اثر انداز نہ ہو۔ اور جب دودھ پلاتی تو وضو کر کے اور دو

رکعت نفل ادا کر کے پلاتی۔ اس لئے ان چیزیوں سے شہزادے کے اخلاق بہت بلند ہونے چاہئیں' اس لئے میں نے تمہاری ساری فوج اور حکومت کی بات کو جھٹلایا۔ مگر اپنے قول سے باز نہیں آئی۔۔۔

جب امیر دوست محمد کی بیگم اتنی متقی بن سکتی ہے جبکہ آرام و عیش کے تمام اسباب موجود ہیں۔ تخت پر بیٹھ کر متقی بن سکتی ہے تو ہماری آج کل کی بہنیں جھونپڑوں میں رہ کر کیوں کامل نہیں ہو سکتیں۔ جو رکاوٹیں ان کو تھیں وہ تمہیں نہیں۔۔۔ بعض لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور ہر کام اور ہر بات میں حیلہ تلاش کرتے ہیں مگر حیلوں سے کچھ نہیں بنے گا۔ اور یہی حیلہ کرنے والے قیامت کے دن بھی حیلہ سازی کریں گے اور کہیں گے کہ ہمیں وقت نہیں ملا' اس لئے اطاعت نہیں کی بلکہ دولت میں مشغول رہے اور اس سے فرصت نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ سلیمان اور یوسف علیہما السلام کو پیش کریں گے کہ باوجود اتنی دنیا اور دولت کے اللہ کے مقبول بندے اور نبی ہیں۔

## سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علمی مقام

ایسے حضرات صحابہ کرامؓ جیسے مردان باہمت تھے ان کی عورتیں بھی ایسی تھیں اور ایسے ہی ازواج مطہراتؓ بھی۔۔۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں میری وحی کا آدھا علم صحابہؓ سے اور آدھا علم صرف حضرت عائشہؓ سے سیکھو یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بہت بڑے بڑے درجہ کے تابعینؒ اور صحابہ کرامؓ جیسے حضرت ابن عباسؓ وغیرہ شاگرد رہے ہیں۔ تو جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وحی کا آدھا علم سیکھ سکتی ہیں تو آج کل کی بہنیں ابتدائی حالات اسلام کے اور معاملات کا علم بھی حاصل نہیں کر سکتیں' امام ابو جعفر طحاویؒ کی حدیث کی کتاب کا املاء ان کی لڑکی نے لکھا تھا' اج تمام امت پر اس کا احسان ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ بڑے صوفیا میں سے گزری ہیں۔

## عورت اور منصب افتاء

فقہ کی کتاب "بدائع الصنائع" کی وجہ تصنیف یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے محدث کی لڑکی بڑی عالم اور محدث تھی اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور خوبصورت تھی' بہت بڑے بڑے علماء کے پیغام نکاح کے آئے اور ایسے ہی سلاطین وغیرہ نے بھی پیغام بھیجے۔ مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ تھا' اس لئے پیغام قبول نہیں ہوتا تھا' اس لڑکی نے یہ شرط مقرر کی کہ تمام علماء فقہ میں کتابیں تصنیف کریں۔ جس کی کتاب مجھے پسند ہو گی میں اس سے نکاح کر لوں گی' اس پر ہزاروں کتابوں کی تصنیف ہوئی تو اسے بدائع الصنائع پسند آئی' اور اسی سے اس نے نکاح کیا۔

آج کل اگر ہماری بہنیں کمال اور مہارت حاصل نہ کر سکیں تو کم از کم حقوق کی ادائیگی کا علم تو حاصل کر لیں کہ خاوند کے یہ حقوق ہیں اور بچوں کے یہ حقوق ہیں۔

### مقصد علم

اور وقائع میں لکھا ہوا ہے کہ سلجوقی کے عہد میں مدرسہ نظامیہ بنایا گیا، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے بعد عرصہ مدید کے معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کی نیتیں فاسد ہیں تو بادشاہ وقت نے ارادہ کیا کہ مدرسہ کو ختم کر دوں مگر خیال آیا کہ ایک دفعہ دیکھ لوں کہ واقعی سب کی نیتیں فاسد ہیں کہ نہیں۔

چنانچہ ایک رات نظام الملک خود آیا ایک ایک طالب علم سے سوال کرتا رہا تم کس لئے پڑھ رہے ہو؟ کوئی جواب دیتا کہ میرا والد بادشاہ کا قاضی ہے میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میں بھی قاضی بن جاؤں۔۔۔ کوئی کہتا کہ میرا والد بہت معروف اور مشہور عالم ہے۔ اطراف میں اس کی شہرت کا ڈنکا بج چکا ہے تو میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میری بھی شہرت ہو جائے۔ وغیرہ ذلک

نظام الملک نے تمام طلباء کو دیکھا کہ ان کی نیتیں فاسد ہیں تو تہیہ کر لیا کہ مدرسہ کو بند کر دیا جائے۔ میرے لاکھوں روپے ضائع ہو رہے ہیں۔ صحیح نیت سے کوئی نہیں پڑھتا کہ ثواب حاصل ہو جائے اس فیصلہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس کی نظر ایک طالب علم پر پڑی، جو مطالعہ میں مستغرق تھا۔ نظام الملک اس کے پاس گیا، مگر اس طالب علم نے کتاب سے ایک لمحہ کے لئے نگاہ نہ اٹھائی۔ پوچھا "تم بڑے مستغنی ہو"۔۔۔؟ کہا "میرا مقصد کتاب کا مطالعہ کرنا ہے چہروں کا مطالعہ کرنا نہیں"۔ نظام الملک نے پوچھا۔ "تمہارا ایک دو منٹ کے لئے حرج تو ہوگا بتاؤ آپ کا اس پڑھنے سے مقصد کیا ہے؟" تو اس نے کہا۔۔۔۔۔

"میں نے ماں باپ سے سنا ہے ہمارا ایک خدا ہے جس نے ہمیں زندگی عطاء کی ہے۔ وہ ایک محسن ہے اور اس کے حقوق مجھے معلوم نہیں تو میں محسن کے حقوق جاننے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔"

نظام الملک نے کہا۔

"میرا تو ارادہ اس مدرسہ کے توڑنے اور بند کرنے کا تھا لیکن جب تک تم اس مدرسہ میں پڑھتے رہو گے تمہاری وجہ سے مدرسہ جاری رہے گا"۔

یہ طالب علم امام غزالیؒ تھے۔ چنانچہ نظام الملک نے اس مدرسہ کو باقی رکھا۔

معلوم ہوا اصلی مقصد علم سے حقوق کی ادائیگی ہے اور ہم میں سے کون ہے جس پر حقوق نہیں ہیں۔ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا تمام پر حقوق ہیں۔ تو ان حقوق کے بتلانے کے لئے تعلیم سکھائی جاتی ہے۔

### تعلیم حق فطرت و عقل ہے

تعلیم ایک فطری چیز ہے کہ فطرۃ محسن کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اور عقلی بھی ہے۔ تو جو جاہل ہے وہ فطرۃ اور عقل دونوں کے خلاف کر رہا ہے اور احکام شرعیہ و عقلی کے خلاف کر رہا ہے۔ ہمیں اپنی بچیوں سے یہ توقع نہیں کرنی

چاہئے کہ محسن کشی کریں گی۔ اور عقل وفطرت کو آگ لگائیں گی۔

**عورت کی صلاحیت**

اکثر عورتوں کو یہ خلجان اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقی اور علم وفضل کا میدان مردوں کے لئے ہے۔ اور عورت تو گھر میں بیٹھنے والی ہے اس کو علم سے کیا واسطہ؟ مگر ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ کتابوں سے عورتوں کے بڑے فضائل ہوتے ہیں۔

صفوۃ الصفوۃ ایک کتاب ہے اس میں مستقل عورتوں کا ایک باب باندھا گیا ہے ان کی سیاست، ان کی تعلیم اور جہاد کا بیان ہے۔ حتی کہ عورت کی کشتی کا بھی بیان ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑے بڑے بہادر مردوں کو بچھاڑ دیا۔ تو تاریخ اسکو جھٹلاتی ہے بلکہ عورتوں نے میدان جنگ میں کام کیا ہے۔

**عورت کی نبوت**

دوسری بات یہ ہے کہ دین مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں۔ جسے رسالت اور قاضی القضاۃ کا عہدہ کہ عورت رسول اور قاضی القضاۃ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس کی قابلیت عورت میں نہیں مگر سب سے بڑا کمال جو نبوت کا ہے ایک بڑی جماعت اس پر ہے کہ عورت کو نبوت مل سکتی ہے۔ ابن حزم بھی یہی کہتے ہیں۔ اگرچہ جمہور کا یہ مسلک نہیں۔ جس جماعت نے اس کا قول لیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پروحی آتی رہی ہیں تو وہ نبی ہیں۔ فرعون کی بیوی آسیہؓ نبی تھی۔

توجب اس قول کے مطابق عورت کو نبوت جو ایک اعلیٰ درجہ کا کمال ہے اس کا حصول ممکن ہے تو اور کیا کمال چاہئے؟ اور کون سی فضیلت ہے جس کو وہ حاصل نہیں کر سکتی قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ الخ

اس آیت میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ عبادات، اخلاق اور معلامات میں یکساں ہیں۔ تو مبداء فیاض سے فرق نہیں، عقل اور نقل اس کو جھٹلاتی ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ اہتمام تعلیم کا ہے۔

## عورتوں کی دینی ترقی

انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا اہتمام ہے، امت کے بڑوں اور نامور لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بچیاں جہل کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف نہیں آسکتیں، تو مدرسہ خیر المدارس کا یہ شعبہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ عورتیں اور بچیاں بھی ترقی میں حصہ لے رہی ہیں اور دین کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں کہ اصل ترقی یہی ہے۔

## عورتوں کی عمومی تعلیم

ایک دور میں یہ بات تھی کہ مخصوص گھرانے علم سے مختص ہو گئے اور مائیں اولاد کو تعلیم سکھاتی تھیں۔ مگر اب اختصاص نہیں۔ تو خیر المدارس کا یہ شعبہ پوری قوم کے لئے خوشی کی بات ہے عورتیں اس میں تعلیم حاصل کریں تو آئندہ چل کر نسلیں نیک بنیں گی۔

عورتوں کے لئے اب یہ موقع ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دن دونی، رات چوگنی ترقی عطاء فرمائے۔

آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# افادات علم وحکمت

## مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً . ! اما بعد

### وصول الی اللہ کے اصول

ان صلاحیتوں کا معیار ہے کہ علائق جتنے کم سے کم ہوں گے وصول اتنا جلد سے جلد ہوگا' جتنے علائق اور تعلقات بڑھ جائیں گے طبعیت اس میں بٹے گی یکسوئی کم ہوگی تو پھر دیر لگ جاتی ہے چاہے استعداد بھی ہو۔

اسی واسطے ان حضرات نے جو اصول رکھے ہیں وہ چار ہی ہیں۔ قلت طعام یعنی کھانا کھانا اور کم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو خوراک ہے اس سے بھی آدھا کر دے یہی دو چار لقمے کم کر دے' یہ کافی ہے۔۔ بالخصوص اس زمانے میں۔۔۔ پہلا دور جو کہ حضرات صحابہؓ کا دور ہے کہ ان کی غذائیں سوکھا ٹکڑا وغیرہ تھی۔ حتی کہ جہاد میں جا رہے ہیں۔ کسی کی زنبیل میں چند ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں کوئی سامان رسد نہیں تھا کہ وہاں کیک وغیرہ ملیں۔۔۔ بعض کے پاس کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں' بھوک نے ستایا' وہ کھائیں۔۔۔ بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چھوہاروں کی گھٹلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہی منہ میں ڈال لیا اور چوس لیا' دل کو بہلا لیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں۔۔۔ غرض غذا تو یہ تھی اور مجاہدات عظیم کہ دن بھر جہاد میں اور رات کو مجاہدہ میں ہیں اور غذا کل یہ۔۔۔ غالباً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

انهم يبعرون بعراً وانتم تصلطون صلطاً.

وہ فراغت کو جاتے تھے بمشکل دو چار مینگیاں سی نکل آتی تھیں۔ غذا ہی نہیں اور تم قدمچے بھر دیتے ہو۔ یہ اپنے لوگوں کو جو کہ تابعین تھے' ان کو کہا۔۔۔ تو ہر زمانے کی قلت طعام الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ان کو قلت طعام کی حرص کرنے لگے تو چارپائی پر پڑ جائے گا' اور اس کا انتقال بھی ہو جائے

گا' برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کے ظرف میں برداشت تھی' فیضان نبوت براہ راست متوجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر طاقت نہیں ہو سکتی۔۔۔ اب حال کی قلت طعام یہی ہے جو ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا۔۔۔ ہم دو آدمیوں کو کسی ضرورت سے دہلی بھیجا' دو آدمیوں کی آمدورفت میں پانچ روپے لگ جاتے مگر ہمیں پچاس روپے دیئے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔۔۔ غرض اس زمانے کی قلت طعام یہی ہے کھانے میں زیادہ کمی نہ کرے۔ معمول کو معتدل رکھے۔۔۔ ایک اصول یہی ہے۔۔۔ ایک ہے قلت منام' یعنی سوؤ کم۔۔۔ اس میں بھی یہی بات ہے کہ ان حضرات کا سونا تو مجبوری تھا کہ وہ تو یہ چاہتے کہ سوئیں بھی نہ۔ بس ذکر اللہ میں ہی لگے رہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسجد نبوی میں بیٹھ کر ذکر فرماتی تھیں ایک رسی چھت میں ٹانگ رکھی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

یہ رسی کیسی ہے؟

عرض کیا "جب نیند کے جھکولے زیادہ آنے لگتے ہیں تو اپنے کو اس رسی سے باندھ لیتی ہوں"۔

فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آنے لگے پڑ کے سو رہو۔ جاگ جاؤ پھر اللہ کا نام لینا شروع کرو۔ طبیعت کو گھوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو شریعت نے طبائع کی رعایت بہت زیادہ کی ہے۔ طبیعتوں کا معمول ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے اس میں کمی ہو جائے گی تو اس کا برا اثر پڑے گا۔ اور بالخصوص اس دور میں' اس واسطے جس کا معمول سونے کا ہے اس میں کمی نہ کرے۔۔۔ اس لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ لا تفریط فی النوم' نیند میں کمی مت کرو۔ جس کو جو عادت ہے اس کو پورا کر لے اور اپنا کام بھی کرے۔ مگر نیند میں اتنا وقت لگا دے جتنا معمول ہو۔ تو طبائع الگ الگ ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی قلت طعام و قلت منام مختلف ہوتی ہے' پھر زمانے بھی الگ الگ ہیں' اس کے لحاظ سے ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

تیسرا اصول ہے قلت کلام۔ کم بولو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بلا ضرورت نہ بولو۔ ضرورت کے موقع پر کلام کرنا ضروری ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کی فضول مجلسیں اور تفریحی باتیں ان میں وقت ضائع ہوتا ہے اور علائق کی کثرت ہو جاتی ہے پھر اپنے معمولات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔

اور چوتھی چیز ہے قلت اختلاط مع الانام۔ ملنا جلنا کم' بالخصوص مجاہدات کے زمانے میں۔ میل جول' تفریحی مجلس' اٹھنا بیٹھنا' یہ چیزیں مضرت پہنچاتی ہیں حدیث میں ہے کہ:

من سکت سلم و من سلم نجا

جو چپ رہا وہ صحیح سالم رہا' اور جو صحیح سالم رہا اس نے نجات پالی۔ حاصل وہی ہے کہ بلا ضرورت بولنا' اسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔ جیسے ایک روایت میں ہے کہ:

عجمیوں کے بکواس سے بچو۔ بے ضرورت بول رہے ہیں۔ بولے چلے جا رہے ہیں۔ یہ غلط

چیز ہے۔۔۔ ضرورت کے موقع پر چپ رہنا برا ہے اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا برا ہے۔۔۔ حسب ضرورت سکوت و کلام کرے' سب کا حاصل یہی نکلا کہ اختلاط اور علائق کی کمی ہو اس سے وصول جلد ہی ہو جاتا ہے ذکر کی تاثیر قوی ہو جاتی ہے۔

## مجاہدات باطنیہ کی مثال

مجاہدات باطنیہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مدارس میں طلباء تعلیم پاتے ہیں ان کے لئے بھی کثرۃ علائق بری چیز ہے۔ اگر وہ دوستیاں کریں۔ مجلسوں میں جائیں تو مطالعہ کون کرے گا؟ استعداد کس طرح پیدا ہو گی۔۔۔؟ غرض کسی بھی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دل میں مقصد کی لگن ہو اور مقصد کے لئے عشق ہو اور غیر مقصد سے تنفر اور بعد ہو۔ پھر جا کے مقصد حاصل ہوتا ہے۔۔۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں میں گریہ طاری تھا۔ توجہ الی اللہ ہو رہی تھی۔ تو جوش عقیدت میں ایک شخص نے کہا۔

## مقصد کی لگن

"اے موسیٰ! تم سے بھی بڑا کوئی دنیا میں عالم ہے؟ یعنی نہیں ہے"۔

فرمایا۔۔۔ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔۔۔ اور یہ حق تھا اس لئے کہ اپنے دور میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوتا۔ انہی کے طفیل میں دوسروں کو علم پہنچا ہے تو اپنے دور میں موسیٰ علیہ السلام افضل الخلائق ہیں۔ بلا کسی غرور نفس اور بلا کبر کے حق بات آپ نے فرما دی۔ کہ میں ہی بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے بنادیا۔ یہ تکبر نہیں تھا۔ مگر کبر کی صورت پیدا ہو گئی' دعویٰ کی صورت پیدا ہو گئی کہ "میں ہوں" یہ ناپسند ہوا۔۔۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تو دعویٰ کرتے ہو کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ بلٰی عندنا عبدنا ھوا علم منك۔

ہمارا ایک بندہ ہے کہ جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس سے جا کے علم سیکھو۔ تو موسیٰ علیہ السلام چلے اور حضرت یوشع ابن نون کو ساتھ لیا۔ حق تعالیٰ نے علامت بتلادی کہ فلاں جگہ مجمع البحرین میں جب پہنچو گے تو اس بندے سے ملاقات ہو گی۔ اور یہ فرمایا جو مجھے سنانا تھا کہ

حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْاَمْضِیَ حُقُبًا ۔۔۔۔ میں مجمع البحرین پر پہنچ کر رہوں گا' چاہے لاکھوں برس گزر جائیں' مجھے جانا ہے اور اس بندے سے علم حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد کی لگن تھی کہ چاہے لاکھوں برس گزر جائیں۔

غرض ایک طالب علم کا جب انتہائی مقصد متعین ہو جائے' اس میں لگن ہونی چاہئے اور مقصد سے عشق ہونا چاہئے۔ جب اس میں منہمک ہو گا تو غیر مقصد کی طرف کبھی توجہ نہیں کرے گا۔ تو مقصد کی لگن اور دھن یہ اصل چیز ہے۔۔۔ جب علم ظاہرہ میں اس کی ضرورت ہے تو علوم باطنہ میں اس کی اور بھی زیادہ ضرور ہے آدمی یہ سوچ لے کہ چاہے عمر نوح بھی گزر جائے مگر مجھے ہر

صورت میں یہ مقصد حاصل کرنا ہے' پھر حق تعالیٰ بھی مدد فرماتے ہیں اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ غرض پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے مقصد سے لگن ہو۔ اس کے لئے پھر ایثار ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہشات مقصد میں فنا کر دے۔ اگر رات دن اس میں ہے کہ کھاؤں گا یہ اور پیوں گا یہ' تو وہ آرائش کی فکر میں ہے۔ اسے مقصد سے کیا تعلق؟

جب آدمی مقصد میں لگتا ہے تو ہر چیز سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر مدد خداوندی آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "ہمت مرداں مدد خدا" ہمت کرو گے تو اللہ کی مدد شامل ہو گی' کم ہمت ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گے اس کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔

## اختلاف استعداد

تو اس میں احوال بھی مختلف ہیں' استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ عزیمتیں بھی مختلف ہیں۔ بعضوں میں عزیمت ہوتی ہے کہ انتہائی لگن ہے۔ بعض میں کچھ ہلکی سی لگن ہوتی ہے اس کو مقصد کے حاصل کرنے میں دیر لگ جائے گی' اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ قانونی بات اتنی ہے کہ نصاب پورا ہو گیا تو فارغ التحصیل ہو گئے۔ اب یہ کہ تم میں کتنی علمی قوت آئی' یہ ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ یہی یہاں بھی ہے کہ جب وہ مجاہدات و افکار صحیح طریقے سے پورے ہو گئے شیخ کہہ دے گا کہ بھئی تم قانونی طور پر واصل ہو گئے۔ اب یہ کہ تمہارے اندر جذبہ کتنا ہے۔ عشق خداوندی کتنا ہے۔ یہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہیں۔

## اعضاء کی پیوند کاری

یہ اصل میں اس پر موقوف ہے۔ پہلے یہ سمجھا جائے کہ اس جسم کے ہم مالک ہیں یا یہ جسم ہمیں بطور عاریت کے فائدہ اٹھانے کے لئے دیا گیا ہے۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جسم سرکاری مشین ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ اگر آپ مالک ہوتے یا آپ کے قبضے میں ہوتا تو آپ کبھی اس جسم کو بیمار نہ ہونے دیتے' کبھی کسی عضو کو اپنی جگہ سے ٹلنے نہ دیتے' مگر آپ مالک نہیں ہیں۔ بیماری آتی ہے تو آپ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ صحت آتی ہے جب بھی سر جھکا دیتے ہیں۔ غرض پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اس بدن کے مالک ہیں یا بطور عاریت کے دیا گیا ہے؟ مالک تو ہیں نہیں بطور عاریت کے دیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ' دیتے ہیں پھر لے لیتے ہیں۔ اگر مالک ہوتے تو کبھی بھی اپنے بدن کو دوسرے کے حوالے نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اللہ میاں کے حوالے بھی نہ کرتے اور وہ لینا چاہتے تو کہتے کہ حضور' جب آپ نے ہماری ملک بنا دی تو غیر کی ملک میں آپ تصرف کیوں کرتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا' ہماری ملک نہیں' جب ملک نہیں ہے تو مالک سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اجازت دے تو ہم کسی عضو کو منتقل کر سکیں گے۔ وہ اجازت نہ دے تو نہیں کر سکیں گے تو اس اجازت کی ذمہ داری آپ کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟ کہ آپ کو اجازت مل گئی ہے یا نہیں؟ اگر وحی یا الہام کے

ذریعہ مل گئی ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ملی تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں۔۔۔ پھر اس میں ایک سوال تھوڑا ہی ہے۔ آپ نے ایک شخص کو اپنی آنکھ دیدی' قیامت کے دن اسنے کہا کہ اب چونکہ یہ میری ملک ہوگئی لہذا تم اندھے رہو۔ لہذا یہ اندھے کا اندھا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تو نے اپنا ایک عضو منتقل کر دیا۔ واپس لینے کا کیا حق ہے' جب واپس لینے کا حق نہیں تو اندھا رہ' وہاں پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ جسم جو ہے' برزخ ہو یا آخرۃ ہو عذاب و ثواب اسی پر واقع ہوگا تو آپ کو حق کیا ہے کہ آپ جسم کا کوئی عضو کسی دوسرے کو دیدیں۔ اول تو مالک نہیں۔ پھر مالک نہ ہونے کی صورت میں جو تصرفات برزخ میں یا حشر میں ہوں گے وہ ایسی بدن پر ہوں گے۔ جب آپ یہ بدن دے چکے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جلا کر بدن کو راکھ کر دے۔ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

## دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں

اب رہا یہ کہ مصلحت یہ ہے تو دین کی بنیاد مصلحتوں پر نہیں ہے۔ مسائل پر ہے۔ کونسی بری سے بری چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی مصلحت نہیں۔ شراب پینے میں بھی تو مصلحت ہے۔ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ بدن میں قوت آجاتی ہے۔ جوئے میں بھی مصلحت ہے ایک دم تو مال بھی بڑھ ہی جاتا ہے ایک پیسہ خرچ کیا اور ہزار روپیہ کما لیا تو نفع ہوا۔۔۔ اور قرآن کریم بھی اس مصلحت کو مانتا ہے۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ.

لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ فرما دیجئے ان میں کچھ نفع بھی ہے کچھ نقصان بھی ہے۔ مگر نقصان غالب ہے نفع مغلوب ہے۔۔۔ غرض قرآن کریم نے نفع کا اقرار کیا تو کونسی چیز ایسی ہے جس میں نفع نہیں' مگر اس نفع و نقصان پر اگر احکام کا مدار ہوتا تو شراب جائز ہوتی کہ اس میں ایک نفع بھی ہے۔ جوا جائز ہوتا' اس میں ایک نفع بھی ہے۔

لیکن باوجود منفعت کے ناجائز قرار دیا گیا' غرض آپ اگر تمدنی مصالح سے کوئی منفعت ثابت کریں تو دین کا مدار تو منافع اور مصالح پر نہیں ہے' وہ تو مسائل پر ہے۔ ورنہ آپ کل کہیں گے کہ صاحب تمدنی طور پر شراب میں بھی تو منفعت ہے تو اس کی بھی اجازت دی جائے۔ اور جوئے میں بھی کچھ نفع ہے تو اس کی بھی تھوڑی بہت اجازت دی جائے۔ تو اس اجازت کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ فقط آنکھ' ناک تک نہیں رہے گا' یہ نفس کی خواہشات پر بھی آئیگا۔ طبعی تقاضوں پر بھی آئے گا کہ اس میں مصلحت یہ ہے۔ اگر میری اور آپ کی تجویز کردہ مصلحتیں جو ہم بتلاتے ہیں اس پر مدار ہوتا تو پھر اس کی اجازت دیدی جاتی مگر اس پر تو مدار نہیں البتہ مصلحت کلی پر مدار ہے کہ بنی نوع انسان کی مصلحت کیا ہے۔ زید' عمر' بکر کی مصلحت نہیں دیکھی جاتی۔ قانون جب بنتا ہے تو مفاد

عامہ کو سامنے رکھ کر بنتا ہے۔ زید' عمرو بکر کے لئے نہیں بنتا۔۔۔ مثلاً ریلوے کا قانون ہے کہ ایک ٹکٹ میں آپ ۲۵ سیر وزن لے جاسکتے ہیں۔ ایک آدمی یوں کہے کہ میں قوی ہوں میں دو من وزن اٹھا سکتا ہوں۔ میرے لئے ۲۵ سیر کی کیوں قید ہے۔۔۔؟ اس کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ اس لئے کہ مفاد عامہ کی رعایت پیش نظر ہے۔ زید' عمرو بکر کی نہیں کہ کون قوی ہے' کون ضعیف ہے۔ تو دنیا کے قانون میں بھی جو مفادات عامہ ہیں' مصالح عامہ ہیں جو بنی تو نوع سے متعلق ہیں ان کی رعایت ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کے چند افراد کی رعایت نہیں ہوتی۔

## نس بندی یا کنبہ بندی؟

نس بندی تو باتفاق علماء ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں تغیر خلق اللہ بھی ہے اور بدن انسانی میں اس قسم کے تصرفات کرنا ہے جن کی فطرت اجازت نہیں دیتی۔۔۔ پھر یہ کہ نس بندی سے وہ مادہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے جس سے آدمی کو اولاد ہو۔ کسی کو حق نہیں کہ کسی مادے کو ختم کر دے کہ وہ اولاد بنانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور مرد سے نامرد ہو جائے۔ اس کا کوئی حق نہیں۔۔۔ اور کنبہ بندی جو ہے وہ اختیاری ہے۔ اس میں یہ ہے کہ خاوند بیوی میں بعض مصالح ایسے ہیں کہ وہ اگر اولاد بند نہیں کریں گے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ مثلاً بیوی بہت بیمار ہے۔۔۔ اگر اولاد ہو گی تو ان کی جان کا خطرہ ہے۔۔۔ یا خاوند بہت بیمار یا جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ رزق کی اتنی کمی ہے کہ کوئی صورت نہیں بن پڑتی اور اولاد روز بروز ہو رہی ہے تو تقلیل اولاد کے لئے خاوند بیوی مل کر باہمی معاہدہ کر لیں کہ اب ہمیں اولاد کم کرنی ہے۔ مگر یہ قانونی چیز نہیں یہ تو اخلاقی اور خانگی چیز ہے' قانون شریعت اس کے اوپر دباؤ نہیں ڈالے گا۔ البتہ شریعت حق دے گی کہ اگر ایسے حالات آئیں تو اس حق کو باہمی رضامندی سے استعمال کیا جائے گا۔ خاوند بیوی مل کر باہم معاہدہ کر لیں۔

غرض نس بندی میں مادہ زائل ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو حق نہیں۔ کنبہ بندی اختیاری ہے کہ خاص حالات میں آدمی تقلیل اولاد کی طرف متوجہ ہو۔ مگر وہ قانونی چیز نہیں۔ اخلاقی چیز ہے کیونکہ ہر گھر کا الگ الگ معاملہ ہے۔

## عمومی طور پر تقلیل اولاد کی صورت

تقلیل اولاد کا جو طریق ہے وہ یہ ہے کہ ان اسباب کا انسداد کیا جائے جن سے ہر وقت شہوات ابھرتی رہتی ہیں اور خواہی نخواہی اولاد ہو' حتیٰ کہ جائز ناجائز بھی۔

جب فواحش اور منکرات عام ہوں بے حجابی اور عریانی عام ہو' عورتوں اور مردوں کا اختلاط عام ہو' کوئی صورت تقلیل اولاد کی نہیں۔۔۔ آخر پہلے بھی تو لوگ تھے مگر اتنی اولاد نہیں ہوتی تھی'

اس لئے کہ ہوسناک نہیں تھے' اب چونکہ رات دن عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ شب و روز اختلاط ہے تو شہوات اپنے مرکز پر قائم نہیں ہیں وہ منتشر ہیں اس لئے لوگ جائز ناجائز میں مبتلا ہیں۔ اور جب کوئی چیز اپنے مرکز کو چھوڑ کر حد سے نکل جاتی ہے' کوئی بھی قوت ہو وہ کسی حد پر رکتی نہیں۔ شہوات جب قبضے میں نہ رہیں تو ہر وقت آدمی شہوت رانی میں پڑا رہے گا۔ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ تو قدرتی طور پر اولاد زیادہ ہو گی۔۔۔۔ اس واسطے تقلیل اولاد کی ایک تو خاص صورت ہے کہ بیوی بیمار ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہے کہ اب اگر اولاد ہو گی تو بچے گی نہیں۔ یہ تو ایک خصوصی بات ہے۔ لیکن عمومی طور پر اگر کوئی چاہے کہ اولاد زیادہ نہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جنکی وجہ سے شہوات اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں۔۔۔ بے پردگی' فحاشی اور عریانی روکی جائے۔۔۔ مرد وعورت کا اختلاط روکا جائے۔ قدرتی طور پر ہر قوت اعتدال پر آجائے گی۔

## مقصود تکثیر اولاد ہے تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے

تقلیل اولاد مقصود تو نہیں۔ مقصود تو تکثیر اولاد ہے۔ امت محمدیہ جتنی بڑھے گی' بہتر ہی ہے مگر تقلیل مقصود نہیں ہے۔ عوارض کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ جب کوئی خاص حالت پیش آجائے جیسا کہ میں نے عرض کیا' بیوی بیمار ہے۔ یا مرد کے اندر صلاحیت باقی نہیں رہی یا اور اسباب پیش آئیں۔ غرض تقلیل مقصود اصلی نہیں وہ تکثیر ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس پر کیا حالات گزر رہے ہیں وہ اپنے گھریلو حالات دیکھ لے۔

ایک وہ عام چیز ہے وہ قانونی ہے۔ چاہے تقلیل ہو' تکثیر ہو کہ منکرات کو دنیا سے مٹایا جائے' عریانی' بے حجابی' بے حیائی اس کے کارخانے بند کئے جائیں۔ یہ قوت اعتدال پر آجائے گی۔

موجودہ تمدن جو مغرب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک اسلامی تمدن کی ضد ہے۔ یہاں نگاہ بازی حرام' وہاں نگاہ بازی تمدن کا جز۔ یہاں اجنبیہ سے خلوت بالکل ممنوع' وہاں تمدن کا جز' وہاں اگر کسی شخص کی بیوی اندر ہے' اور باہر کسی غیر مرد کے جوتے پڑے ہوئے ہیں تو اسے حق نہیں ہے کہ وہ مداخلت کرے' اسے بیوی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے۔ اندر نہیں جا سکتا۔ ایک تمدنی غرض اس بارے میں یہ اسلامی تمدن کی بالکل ضد ہے۔

## تمدنی مشکلات

اب مشکل یہ ہے کہ تمدن تو وہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اسلامی جزئیات کا جوڑ لگائیں۔ وہ جوڑ لگے کیسے؟ وہاں تمدن کی بنیاد نفسانیت اور نفسانی خواہشات ہیں۔ یہاں تمدن کی بنیاد اخلاق اور روحانیت پر ہے کہ اخلاق اعلیٰ ہوں کردار بلند ہو ہر شخص خوف خداوندی اور تقویٰ' طہارت کی تصویر ہو۔ غرض یہاں کی بنیاد الگ اور وہاں کی بنیاد بالکل الگ۔ وہاں

مقصود اصلی عیش دنیا ہے۔ یہاں مقصود اصلی عیش آخرت ہے۔ بقدر ضرورت شریعت نے دنیا کمانے کی بھی اجازت دیدی۔ چونکہ یہ ایک دوسرے کے ضد ہیں اس لئے ایک میں دوسرے کا جوڑ کیسے لگے؟

## وعظ و نصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے

اب وعظ و نصیحت آتی ہے کوئی بے چارہ اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ مان لیتا ہے' لیکن محض وعظ و نصیحت سے تمدن میں انقلاب نہیں آسکتا۔ انقلاب تو قوۃ قہری سے آتا ہے۔ بعض چیزیں طاقت سے پیدا کی جاتی ہیں' محض وعظ و نصیحت سے پیدا نہیں ہوتیں۔۔۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام میں خلافت نہ رکھی جاتی۔ چونکہ جامع اور اجتماعی دین ہے۔ غرض بہت سی چیزوں کا انسداد قوت کرتی ہے' وعظ و نصیحت نہیں کرتی۔

وعظ و نصیحت سے بہت سے بہت کوئی عبادات کی طرف متوجہ ہو گیا' معاملات سچے کر لئے لیکن یہ کہ زمانے کے اندر تمدنی انقلاب برپا ہو جائے یہ محض وعظ سے نہیں ہوتا' قوت سے ہوتا ہے۔

## خلافت اخلاقی

ایک خلافت عامہ ہے جیسے خلفاء راشدین کی خلافت' جو طاقت ور خلافت ہے۔ اور ایک خلافت اخلاقی ہے جیسے کسی شیخ نے اپنے مریدین کو خلافت دیدی۔ وہ خلافت باطنی ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح کرو لیکن زمانے کو بدل دو یہ قبضے میں نہیں ہے۔ اور یوں کوئی روحانیت والا اللہ تعالیٰ پیدا کرے جو سارے عالم کو بدل ڈالے' تو اسے قدرت ہے جیسا کہ ظہور مہدی کے بارے میں فرمایا گیا کہ اتنی عظیم روحانی قوت ہو گی کہ پوری دنیا کا تمدن بدل جائے گا اور انقلاب عام پیدا ہو جائے گا' سب میں خوف خداوندی' خدا ترسی پیدا ہو جائے گی اور سب اتقیا بن جائیں گے۔۔۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلے گا تو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا کہ میرے گھر میں خوب تمول ہے۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک انگور کے خوشے میں پورا کنبہ سیر پر ہو جائے گا۔ تو عدل کامل جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا میں برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ ظلم کے ساتھ برکات کا ظہور نہیں ہوتا۔۔۔۔ غرض خلافت عامہ اور چیز ہے۔ اسے خلافت کبریٰ کہتے ہیں۔ خلافت صغریٰ یہ ہے کہ ایک شخص پر آپ کو اطمینان ہوا کہ اس کا قلب صحیح ہو گیا اور یہ اپنی حد تک دوسروں کو بھی صحیح بنائے گا۔ آپ نے خلافت دی تو یہ خلافت باطنی ہے خلافت عامہ نہیں ہے۔

## علامت ظہور مہدیؓ

ظہور مہدی کا وقت تو معین نہیں کیا گیا اس کی علامتیں بتلائی گئی ہیں جب یہ علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوں سمجھو کہ ظہور مہدی قریب

ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ ملئت الدینا ظلماً وجوراً۔

پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہو گئی۔ عدل اور سکون قلب کا کہیں نشان نہیں ہو گا۔ آثار تک نہیں ہوں گے ظلم وزیادتی سے دنیا بھری ہوئی ہو گی اور یہ حالت عام ہو گی۔ کسی خطے کے ساتھ مخصوص نہیں۔

یا جیسے فرمایا گیا کہ عرب میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہو گا۔ وہ ظہور مہدی کا وقت ہو گا۔ تو ایسی کچھ علامتیں بتلائی گئی ہیں۔ مدت متعین نہیں کی گئی وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کب ظہور ہو گا۔۔۔۔ جیسے قیامت کی علامت بتلائی گئیں، وقت نہیں بتلایا گیا۔

**ذرائع یقین**

جس درجے میں آپ پہنچ سکتے ہیں پہنچیں، یہ جو منجم ہیں یہ اٹکل پچو کے تیر لڑاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جوانمردی تو یورپ والوں نے کی کہ ہوئی جہاز پر بیٹھ کر چاند پر پہنچ گئے۔ یا تو طاقت ہوں وہاں پہنچ کر حالات معلوم کیجئے۔ باقی فنی اصول سے جو اٹکل پچو حالات بیان کرتے ہیں وہ ظنی چیزیں ہیں کوئی قطعی چیز نہیں ہے۔ اس سے روک دیا گیا۔۔۔ اس لئے کہ یقین کا ذریعہ یا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے دیکھ لے یا مخبر اسلام صادق کی خبر ہوتی ہے۔ جو آنکھ سے زیادہ یقینی ہے تو یا تو انبیاء علیہم السلام خبر دیں یا پھر آنکھ سے دیکھ لیں۔ باقی یہ کہ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے فلاں یوں کہتا ہے یہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہے گا تو ہم بھی اس کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے دوسری ہے۔ تو رائے پر دین کا مدار تھوڑا ہی ہے۔ یہ چیز فن نجوم سے تعلق رکھتی ہے اور اسے ظنی کہا گیا ہے کہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ صحیح بھی ہو جاتی ہی، غلط بھی ہو جاتی ہے۔ قطعی بات وہی ہے جو اللہ ورسول فرمائیں یا پھر آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ آدمی کیوں مخمصہ میں پڑے؟

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔

وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّاوَحْیٌ یُّوْحٰی

دین کی جو بات بھی اللہ کی طرف سے آپؐ خبر دیتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے اس کا ماننا فرض ہے اس میں اس چیز کی نفی نہیں کہ آپؐ کی ذاتی رائے بھی نہیں ہوتی تھی۔ بہت سی چیزوں میں آپؐ نے ذاتی رائے بھی دی ہے جس کا تعلق وحی سے نہیں تھا۔ بہت سی تدابیر آپؐ نے لوگوں کو عقلی طور پر بتلائی ہیں۔ بہت سے مشورے ہیں جو آپؐ نے ذاتی طور پر دیئے ہیں۔۔۔ اصول تو یہ ہے کہ جو آپؐ وحی سے فرمائیں وہ واجب العقیدہ ہے۔ ماننا فرض ہے اور جو رائے سے فرمائیں اس کا ماننا فرض نہیں ہے یہ الگ چیز ہے کہ آپ کی عظمت اور محبت سے اسے بھی حکم ہی سمجھیں لیکن قانوناً اس کا ماننا

واجب نہیں ہے۔

اس رائے پر عمل نہ کرنا یہ تو ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ رائے معاذ اللہ غلط تھی یہ بے ادبی ہے۔اس سے بچنا لازمی ہے ماننا نہ ماننا اختیاری ہے۔لیکن تنقید' توہین یا تنقیص وہ کسی طرح سے جائز نہیں خواہ وہ حضور ﷺ کی رائے ہی ہو' وہ بھی عظمت کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔

جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے تھا۔خاوند بیوی میں موافقت ہوتی نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ نے انہیں آزاد کر دیا اور مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ باندی آزاد ہو تو نکاح اس کے قبضے میں آجاتا ہے چاہے نکاح باقی رکھے چاہے فسخ کر دے۔ مناسبت تھی نہیں' بریرہؓ نے ارادہ کیا کہ میں نکاح فسخ کروں اور حضرت مغیثؓ ان کے سو جان سے عاشق تھے وہ جگہ جگہ روتے پھرتے کہ نکاح فسخ نہ کرے مگر حضرت بریرہؓ نے نہیں مانا۔اخیر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یا رسول اللہ! آپ ہی نے نکاح کیا تھا آپؐ ہی بریرہ کو حکم دیں کہ نکاح فسخ نہ کرے۔۔۔ آپؐ نے بریرہؓ سے فرمایا۔اے بریرہ! نکاح فسخ نہ کرو۔وہ بہت ذہین تھیں انہوں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟

فرمایا! حکم شرعی نہیں۔ مشورہ ہے۔۔۔۔۔

عرض کیا۔میں تو نہیں مانتی۔۔۔۔چنانچہ نکاح فسخ کر دیا

اس سے معلوم ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے پیش کریں تو ماننے نہ ماننے میں آدمی مختار رہتا ہے۔۔۔ ایک ہے محبت کا تقاضا رائے کو بھی آپ حکم کے درجے میں مانیں مگر قانوناً ماننا لازم نہیں۔

## تمدنی چیز کے بارے میں آپ کی رائے کا حکم

بہر حال حضور ﷺ سے دونوں طرح کی باتیں ثابت ہیں۔ مشورے اور ذاتی رائیں بھی اور آپ نے خود ظاہر بھی فرمایا۔حدیث میں ارشاد ہے۔

انسی کماتنسون

مجھے بھی ایسے بھول چوک ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں ہوتی ہے میری ذاتی رائے میں تو آپ مختار ہیں لیکن وحی خداوندی سے جو کہوں گا وہ قطعی ہے۔اس میں غلطی ناممکن ہے۔اس کا ماننا فرض ہے۔

جیسے "تابیر نخل" کے بارے میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ پیوند لگاتے تھے۔اور انہوں نے نر و مادہ سمجھ رکھے تھے۔اور جب پیوند لگاتے تھے تو پھل آتا تھا۔پیوند نہ لگائیں تو پھل نہیں آتا تھا۔آپ نے خیال فرمایا کہ یہ کوئی عقیدہ ہے جو انہوں نے جما رکھا ہے کہ یہ نر ہے یہ مادہ ہے۔آپؐ نے حکم دیا کہ قلم مت لگاؤ۔اس کے بعد پھل نہ آیا۔

عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ! اس دفعہ تو پھل نہیں آیا؟

تب معلوم ہوا کہ معاشرے کی ایک تمدنی چیز ہے کہ درخت کو درخت سے ملا کر جو قلم باندھتے ہیں تو پھل پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسباب حسیہ میں سے ہے آپ نے فرمایا۔

**انتم اعلم بامور دنیاکم**

بھئی! یہ دنیوی معاملہ ہے۔ تم اس میں زیادہ بصیرت رکھتے ہو۔ جو مناسب سمجھو کر لیا کرو۔۔۔ تو آپ نے منع فرمایا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی ٹوٹکا یا عقیدہ ہے۔ معلوم ہوا عقیدہ نہیں بلکہ یہ حسی اسباب میں سے ایک چیز ہے اس لئے اجازت دے دی۔۔۔ غرض ایک انبیاء علیہم السلام کی رائے اور ذاتی مشورہ ہے اس میں انسان ماننے نہ ماننے میں مختار ہے۔ اور ایک ہے حکم شرعی۔ جو وحی سے ہوتا ہے۔ وہ واجب الاطاعت ہے۔ تو بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے سے بھی عمل فرماتے ہیں مگر جب وحی روک دیتی ہے رک جاتے ہیں۔

## نبوت مجموعہ بشریت وملکیت

انبیاء علیہم السلام میں ایک حیثیت بشریت کی ہے اور ایک ملکیت کی۔ بشریت میں جو عوارض بشر پر آتے ہیں ان پر بھی آتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت و مرض وغیرہ۔۔۔۔ اور ایک ملکیت ہے کہ حق تعالیٰ وحی اتاریں، اپنا مقرب بنالیں وہاں انبیاء فرشتوں سے بھی بالاتر ہیں کہ فرشتوں کا بھی وہ مقام نہیں، ان دونوں مقاموں کو فرمایا گیا کہ

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ۔

میں تمہارے جیسا بشر ہوں، ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ نبوت کی عظمت ہے۔ ایک بشری حیثیت ہے۔ ایک نبوت کی حیثیت ہے۔ بشری حیثیت میں سب لوازم بشریت ان پر آتے ہیں اور ملکیت کی حیثیت میں وحی خداوندی آتی ہے۔ اور وہ مقربان الٰہی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بشریت کو تو لے لے اور یوحیٰ الی کو نہ لے اور معاذ اللہ گستاخی کرنے لگے یہ عین کفر ہے۔ اور اگر کوئی شخص محض یوحیٰ الی کے لے لے اور بشریت کی نفی کر دے کہ حضور ﷺ بشر نہیں تھے۔ یہ بھی کفر ہے۔ درمیان میں بات ہے کہ بشر بھی مانے مگر عام بشروں جیسا بشر نہیں ایک خاص بشر جس پر اللہ کی عنایات نازل ہیں وحی ہے، معجزات ہیں۔ غرض آپ بشر ہیں پیدائش کے لحاظ سے اور نبی ہیں عطائے خداوندی کے لحاظ سے، اس کی عظمت فرض ہوگی اور بشریت کے لحاظ سے آپ کو بشر ماننا بھی فرض ہوگا۔ دونوں چیزیں ہیں۔

## حدیث ضیافت حضرت علیؓ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

قال اضافنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علی الاسودین التمر و الماء (او کما قال علیه الصلوٰة والسلام).
"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ضیافت کی دو اسودین پر۔ کھجور اور پانی پر کھجور آپؐ نے کھا کر اس مجھے کھلایا اور پانی پی کر مجھے پلایا اور یہ حدیث بیان فرمائی"۔

من اضاف مؤمناً فکانما اضاف ادم۔

جس نے اخلاص کے ساتھ کسی ایک مومن کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی ضیافت کی اس پر جو اجر ملتا وہ اسے اجر ملے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔

ومن اضاف مئومنین فکانما اضاف ادم وحواء.
"جس نے دو مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے آدم وحوا دونوں کی ضیافت کی"۔

اس کے بعد فرمایا۔

جس نے تین مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسا جبریل و میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو مہمان بنایا۔

اور جس نے چار کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے توراۃ' انجیل' زبور اور قرآن کریم کو پڑھ لیا' یہ کتابیں پڑھنے پر اس کو جو اجر ملتا۔ اس نوعیت کا اجر اس کا ملے گا۔

جس نے پانچ آدمیوں کی مہمانی کی وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کو اجر ملتا جو اول خلق سے برابر جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہا۔ ہزاروں برس نماز پڑھنے پر جو اجر مرتب ہوتا وہ اجر پانچ آدمیوں کی دعوۃ کرنے پر ملے گا۔

اس کے بعد فرمایا۔

جس نے چھ آدمیوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے اولاد اسماعیل میں سے چھ غلام شدہ انسانوں کو آزاد کر دیا۔۔۔ جس نے سات آدمیوں کی دعوت کی تو گویا جہنم کے سات دروازے اس پر بند کر دیئے گئے۔۔۔ گویا اس کا جہنم میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اجر مرتب ہوا۔ اور جس نے آٹھ آدمیوں نے ضیافت کی' اس کے لئے گویا جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے' جس میں سے چاہے داخل ہو جائے اور جس نے نو آدمیوں کی دعوت کی وہ ایسا ہے جیسے اول خلق سے گناہ گاروں سے جتنے گناہ ہوئے ہیں اس نے اتنے اجر کما لئے' گناہوں کی قید اس لئے لگائی کہ نیکیاں کرنے والے کم ہوتے ہیں' گناہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مبالغہ اسی میں تھا۔ اور فرمایا جس نے دس کی ضیافت کی تو حق تعالیٰ اس کے لئے ان لوگوں کا اجر لکھیں گے جنھوں نے نمازیں پڑھیں' روزے رکھے' حج کیا' عمرہ کیا اور قیامت تک کرتے رہیں گے' اتنا عظیم اجر دیا جائے گا۔

گویا اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہمی تعاون اور باہمی امداد اور اعانت کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک ہے خود تنہا نماز پڑھ لینا وہ سب اپنے لئے ہے۔ گویا نماز پڑھ کر اپنی نجات کمالی، اور ایک مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا سامان کیا جس سے پوری امت میں قوت پڑتی ہے۔ اس کے اسباب میں سے بھی ہے کہ ضیافت و مہمانداری بھی ہو۔ تعاون اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔ جیسے کہ فرمایا گیا۔

**واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ.**

اللہ اپنے بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔ تو نماز تو ذاتی فعل ہے اور دوسرے کی مدد کرنے کا تعلق امت سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت پیدا ہو۔ تفریق کی بجائے اتحاد باہمی ہو۔ جس سے قوۃ پیدا ہو۔ اعداء اللہ مغلوب ہوں دین کا کلمہ بلند ہو۔ اس واسطے اس عمل کی زیادہ قدر و قیمت بیان کی گئی۔ ورنہ بظاہر دیکھنے میں سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے ایک شخص نے حج کیا، عمرہ کیا اور ایک نے دس آدمیوں کو کھانا کھلا دیا۔ بظاہر تو بڑی بات نہ تھی لیکن اگر بنیاد پر نظر ڈالی جائے تو ہزار نمازیں بھی پڑھے گا تو اس کی ذات کے لئے ہیں۔ مہمانداری، تعاون اور ہمدردی کرے گا، اس سے امت میں اجتماعیت عامہ پھیلے گی اور مقصود شریعت سے یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت، باہمی اخوت رہے تاکہ اعداء اللہ ضعیف ہوں اور ان کے سامنے قانون الٰہی پیش کیا جا سکے، اور اگر خدانخواستہ اعداء اللہ غالب آجائیں تو وہ اپنا کلمہ آپ کے سامنے پیش کریں گے آپ کا کلمہ تھوڑا سنیں گے۔ قوۃ کی وجہ سے آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے۔ تعاون تناصر اور باہمی قوت کا اثر پوری لمۃ تک پہنچتا ہے۔ اور حج و عمرہ کا اثر ایک آدمی کی ذات تک پہنچتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عمل ہو۔ اس واسطے اس اجر کو بڑھایا گیا، اگر ایک آدمی نے ہزار حج کئے لیکن ایک کام ایسا کیا کہ اس سے امت مل گئی اس کا اجر ہزار حج سے زیادہ ہے۔ کیونکہ مقصود اجتماعیت ہے۔ اس واسطے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھلانا کیسے بڑھ گیا۔؟

غرض یہ حدیث ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مذکور ہے کہ کھجور کھا کر باقی انہیں کھلائی اور پانی پی کر بقیہ انہیں پلایا۔ پھر حدیث بیان فرمائی۔۔۔ حضرت علیؓ نے ان کی ضیافت کی، کھجور کھلائی۔ پانی پلایا اور حدیث بیان کی۔ آگے شاگرد در شاگرد مولانا خلیل احمد صاحبؒ تک سلسلہ پہنچ گیا۔ تو مولانا عبدالقیوم صاحب نے مولانا خلیل احمدؒ صاحب کی ضیافت کی، کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پلایا۔ حضرت مولاناؒ نے میرے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ کھجور کھا کے الس کھلایا اور پانی پی کر پلایا اور یہ حدیث سنائی اور اس کی اجازت دی۔

اب یہ دو حدیثیں ہو گئیں۔ ایک مسلسل بالمصافحہ اور ایک مسلسل بالماء والتمر۔ قولی طور پر آپ نے حدیث سن لی اب عملی حصہ رہ گیا کہ ہر شخص جس کو اجازت دی جائے اس سے مصافحہ کیا

جائے اور کھجور کھا کر کھلائی جائے اور پانی پی کر پلایا جائے۔ اب یہاں اتنے آدمی ہیں کہ اتنی کھجوریں تو میں نہیں کھا سکتا کہ آدمی کھا کر انہیں کھلاؤں۔ اس واسطے ایک آدھ کھجور کھا کے میں ان کھجوروں میں شامل کر دوں گا اس سے انشاء اللہ برکات شامل ہوں گی۔ پانی پی کر جگ میں ڈال دوں گا' اس میں ڈال دوں گا' اس میں سب حضرات پی لیں۔ ورنہ ہر گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ پیوں تو پچاس گھونٹ میں معلوم نہیں پیٹ کہاں پہنچے گا۔

## اسلام کا نظام اجتماعیت

حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ؎

**لا اسلام الا بالجماعة**

اسلام نہیں ہے مگر اجتماعیت کے ساتھ۔ اسلام نام ہی اجتماعیت کا ہے۔ اسی واسطے کوئی عبادت ایسی نہیں جس میں اجتماعیت نہ ہو۔ نماز رکھی تو اس میں امام رکھا۔ اقتدار کھی۔ اجتماع رکھا۔ تاکہ مل کر نماز ادا کریں۔

اسی طرح اگر زکوٰۃ رکھی۔ تو اس میں اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہو تو اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔ وہ عام غرباء میں اس کو تقسیم کرے۔ تاکہ پوری امت تک اس کا اثر پہنچے۔ اب حکومت اسلامی نہیں ہے تو علماء اور اہل فتویٰ کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا تاکہ ان کے فتویٰ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

اسی طرح حج ہے تو وہ بھی اجتماعیت کا نام ہے۔ اس میں بھی امام ہے۔ اور امام کے اشاروں پر سب حج کے افعال ادا ہوتے ہیں۔۔ جہاد ہے اس میں امام و امیر رکھا گیا' جب تک وہ حکم نہ دے نہ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے عام گھروں کے اندر فرمایا گیا کہ ؎

**کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیة.**

تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ اسی سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعایا (گھر والوں) کا کس طرح سے بندوبست کیا' ان کی تربیت شرعی کی تھی یا نہیں؟ یہاں بھی اجتماعت قائم کر دی۔

اسی طرح سفر میں جائے تو اس بات کو سنت قرار دیا کہ چند آدمی ایک امیر بنا لیں' اس کے احکام پر عمل کریں تاکہ سفر نظم کے ساتھ ہو۔۔ غرض اسلام نے ہر چیز میں نظم رکھا' تنظیم و اجتماعیت رکھی ہے۔ اس لئے فرمایا لا اسلام الا بالجماعة اسلام بن نہیں سکتا جب تک جماعتی رنگ نہ غالب آجائے۔ جتنی چیزیں اجتماعیت سے متعلق ہیں ان کے اجر کو انفرادی عبادتوں سے زیادہ بڑھا دیا گیا ہے تاکہ پوری جماعت اس کی لپیٹ میں آجائے۔

## منصب افتاء کی نزاکت

بہت سی جزئیات ایک دوسرے کے مشابہہ ہوتی ہیں اور احکام جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کے الگ اور اس کے الگ۔ مفتی پہچان سکتا ہے کہ ان جزئیات میں کون سا باریک فرق ہے جو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہو گیا ہے' چونکہ مفتی کے سامنے تمام جزئیات ہوتی ہیں اور جن سے واقف ہیں تو جزئیات میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا اور عمل کے طور پر مسئلہ بتلانا ہے۔ ہر پڑھا لکھا بلکہ ہر مدرس بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ یہ بصیرت دیتے ہیں۔

اسی لئے بزرگوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ فتویٰ دینے کی جراۃ نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا تو بتلا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ غلط بتلا دیا گیا۔۔۔ سخت پریشان' گرمی اور بارش میں سارے شہر میں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شخص رات کو ملا۔ تب اس سے کہا کہ بھئی! میں نے مسئلہ غلط بتلایا تھا۔ اصل مسئلہ یہ ہے جب جا کے انہیں تسلی ہوئی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے یہاں رسالہ "النور" میں ایک مستقل باب "ترجیح الراجح" تھا۔ اگر کسی مسئلہ کے بیان میں کوئی غلطی ہوئی تو شائع کرتے تھے مجھ سے غلطی ہوئی حکم یہ ہے اور یہی راجح ہے۔ لوگ اسی پر عمل کریں۔۔۔ بہر حال سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا ہے۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ ہر مدرس یا ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

**منصب تدریس و تبلیغ** اس سے زیادہ آسان درس دینا ہے۔ درس میں کتاب سامنے ہوتی ہے کتاب کے مطابق مضمون بیان کر دیا' کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی' اس سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک موضوع پر جو یاد تھا علمی طور پر کہہ دیا۔ اور اس سے زیادہ آسان ہے وہ تقریر جو علمی نہ ہو۔ محض دنیاداری کی باتیں۔ اِدھر اُدھر کے واقعات لیکچر میں کہہ دیئے یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔ گزرے ہوئے واقعات یوں ہوا تھا' یوں ہوا تھا۔ بیان کر دیا' اور اس سے بھی زیادہ آسان اعتراض کر دینا ہے۔ اس کے لئے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں جس پر چاہا اعتراض کر دیا' جس پہ چاہا شبہ وارد کر دیا۔ جاہل سے جاہل اعتراض کر سکتا ہے۔ اس میں کسی علمیت کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ بعض حضرات مسائل پوچھتے ہیں۔ میں عرض کر دیتا ہوں کہ بھئی مفتی صاحب سے پوچھو۔ میں نہیں بتلا سکتا۔ مسئلہ کا علم بھی ہو تب بھی جرات نہیں ہوتی کہ مسئلہ بیان کر دوں۔ مفتی کے سامنے سب چیز متحضر ہوتی ہیں۔ بعض لوگ برا مانتے ہیں کہ مسئلہ نہیں بتلایا۔ اگرچہ مسئلہ نہیں بتلایا مگر حوالہ تو دیدیا کہ مفتی سے پوچھو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک مسئلہ بتلائے ہی۔ جو بتانے والے ہیں وہ بتلائیں گے جن کو اس کا فن اور سلیقہ ہے۔ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں

ہمیشہ اس سے بچتا ہوں کہ فتویٰ دوں۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔

## علم وعمل کا امتیاز

ایک ہے کسی مسئلہ کی عملی تحقیق کر دینا' وہ الگ چیز ہے اس سے انکار نہیں ہوتا جو اپنے ذہن میں ہو وہ تحقیق کر دی۔ لیکن یہ کہ عمل کیا کرو؟ یہ کام مفتی کا ہے وہ فتویٰ دے گا کہ فلاں پہلو پر یوں عمل کرو فلاں پہلو پر یوں عمل کرو۔۔۔ اس لئے اگر بعض حضرات سوال کریں اور میں مسئلہ نہ بتلاؤں وہ برا نہ مانیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے مسئلہ کا علم بھی ہو۔ اور اگر علم بھی ہو تو میں' احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ فقہی جزئیات پر میری زیادہ نظر نہیں ہے۔ یہ اس کی ہو سکتی ہے جو رات دن اسی میں پڑا ہوا ہو۔۔۔ یہ میں نے بطور تنبیہ اور اصول کے عرض کر دیں۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کا ایک مقام ہوتا ہے۔ میں نہیں ہوں اس قابل کہ مسئلہ بتلاؤں۔ کیا ضرورت ہے زبردستی پوچھا ہی جائے' کسی اہل سے پوچھا جائے۔

## حیات نبویؐ اجماعی مسئلہ ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "حیات النبیؐ" کا لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں اجمالاً اتنی بات ہے کہ "حیات النبیؐ" کا مسئلہ تو مجمع علیہ ہے۔ یعنی امت کے اندر کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ اس کی کیفیت میں گفتگو ہے کہ حیات ہے تو کس کیفیت اور کس نوعیت کی ہے۔ تو کیفیات میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کو اصل مسئلہ میں اختلاف کنندہ نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک انبیاء علیہم السلام کی حیات کا تعلق ہے تو صحیح حدیث موجود ہے۔

**الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون**

"انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں"۔

یا فرمایا گیا۔

**ونبی اللّٰہ حی یرزق.**

اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔۔۔ اب ظاہر ہے کہ اس حیات سے مراد اگر وہ عمومی حیات ہے جو برزخ میں عام طور پر ہوتی ہے تو پھر اس تخصیص ذکری کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی پھر یہ کہنا کہ۔

**نبی اللّٰہ حیی یا الانبیاء احیاء الخ**

اس کی ضرورت نہیں۔ یوں کہا جا سکتا تھا۔ **المسلمون احیاء فی قبورھم یا الناس احیاء فی قبورھم** اس لئے کہ حیات برزخی میں سب کے سب شریک ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص کیا جانا اور اس پر حیات کا لفظ بولا جانا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی حیات

ہے جو عوام کو حاصل نہیں۔

## حیات کامل

پھر یہ کہ "حیات" کے لفظ کو مقید کر کے نہیں لایا گیا یہ نہیں کہا گیا کہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت اس کے حیات ہیں۔یا فلاں جہت سے حیات ہیں بلکہ مطلقاً حی کہا گیا تو جب بھی کوئی چیز مطلق بولی جائی گی' اس کا فرد کامل مراد لیا جائیگا پھر فرد کامل کی صورت سمجھنے کی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم جسے دنیا میں زندگی کہتے ہیں وہی وہاں سمجھیں کہ وہ حی اور زندہ ہیں اور وہ اسی انداز کی زندگی ہے جیسے دنیا میں زندہ ہوتے ہیں۔۔۔ورنہ پھر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص اور حیات کے لفظ کا اطلاق۔۔۔ تو ایک تخصیص اور ایک اطلاق' تخصیص ذکر کی اور خصوصیت بیانی اور لفظ حیات کا اطلاق۔یہ دونوں مل کر یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ کوئی خاص اور اعلیٰ قسم کی حیات ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔۔۔اب یہ کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟

## قبض روح کا امتیاز

تو ہم کیفیت سے واقف نہیں۔نہ ہم اس کا پتہ دے سکتے ہیں۔نہ ہمارے بس کی بات ہے۔اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ممات بھی ہماری جیسی نہیں' ان کی حیات بھی ہماری جیسی نہیں ان کی ممات میں تو یہ بھی ہے کہ ملک الموت آکر اس سے اجازت لیتے ہیں اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اور ان کے علم میں نہ لایا جائے کہ وقت آرہا ہے اور ہم قبض روح کے لئے آرہے ہیں۔اسوقت تک ممات کا آغاز نہیں کیا جاتا۔عامۃ المؤمنین سے اس قسم کی کوئی اجازت یا استیذان نہیں کیا جاتا۔

## دست نبوی ﷺ کا امتیاز

پھر یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں جو حیات ہے تو وہ اور لوگوں کی جو دنیوی حیات ہے۔اس کے مشابہ نہیں۔تو جب حیات مشابہ نہیں تو ممات بھی مشابہ نہیں ہو سکتی۔

یوں تو فرمایا گیا۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ.

میں تم جیسا ایک بشر ہوں۔۔۔ لیکن اس مماثلت کے باوجود آپ کی بشریت اور ہماری بشریت میں کتنا فرق ہے۔یہ سیرت کے احوال دیکھنے سے واضح ہوگا۔ ہم بھی کہیں گے کہ ہمارے ہاتھ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہیں کہ کوئی معنوی اور روحانی نہیں۔۔۔ لیکن ہاتھوں کے اندر خصوصیت سے امتیازی شان موجود ہے جو عام ہاتھوں کو حاصل نہیں۔ ہم اگر کسی کے چپت ماردیں تو چوٹ لگ جائیگی۔انبیاء علیہم السلام اگر کسی کے چپت مارتے ہیں تو چوٹ لگے نہ لگے لیکن اس سے معنوی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ہم اگر آپ کے سینے

میں ہاتھ ماردیں تو آپ چوٹ کھائیں گے اور ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سینے میں ہاتھ مارا توان کو شرح صدر نصیب ہو گیا اور ان کے سامنے آسمانوں تک کی چیزیں روشن ہو گئیں۔

جیسے کہ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ غالباً حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ اپنے محلے کے امام تھے‘ انہوں نے نماز پڑھائی۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی قرآت سنی‘ تو انہوں نے اپنے قبیلے کے لغت پر قرآت کی۔ اور فاروق اعظمؓ لغت قریش کی قرآت جانتے تھے۔ وہ تواشدھم فی امر اللہ ہیں۔ تو خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکیں کس کے کھنچتے ہوئے حضور علیہ السلام کی خدمت میں لائے اور عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے اس منافق کی گردن قلم کردوں‘ اس لئے کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہے“۔

آپ نے حضرت خبابؓ سے فرمایا۔ پڑھو۔

انہوں نے وہ آیت اپنی لغت پر سنائی۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔

انزل القران علیٰ سبعة احرف.

سات لغت پر قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جس میں تمیم‘ نبی طے‘ قریش وغیرہ کی لغات شامل ہیں۔ یہ جو عرب میں سات فصیح لغات ہیں ان ساتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس میں لفظوں میں تغیر ہوتا تھا۔ معنی اور مفہوم میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تو فاروق اعظمؓ نے پڑھا فرمایا۔

ھکذا انزلت.

”یوں ہی نازل ہوا ہے“۔

اس سے فاروق اعظمؓ کے سینے میں کچھ ریب اور شک کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے۔ جس طرح جو پڑھے اسے کہہ دیا جاتا ہے ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ جیسے شبہ یا وسوسہ پیش آتا ہے۔ ایسی کیفیت پیدا ہوئی۔ تو آپؐ نے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔

یا ابن الخطاب۔۔۔۔۔؟

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ‘ فرماتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ لگتے ہی اتنا عظیم شرح صدر ہوا گویا آسمان میرے اوپر روشن ہو گئے۔ اور وہ جو ریب وشک اور وساوس گزر رہے تھے وہ قطعاً ختم ہو گئے۔

تو میں اور آپ کسی کے ماردیں تو چوٹ لگے گی اور پیغمبر نے ہاتھ مارا تو شرح صدر کی دولت

نصیب ہوگئی۔ اِنَّمَآاَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مماثلت نوعیت کے اندر ہے۔ مگر شخصی فرق وہ اتنا ہے کہ ہاتھوں تک میں نمایاں ہے۔

## لسان نبوی ﷺ کا امتیاز

میری اور آپ کی زبان گوشت پوست کی ہے انبیاء علیہم السلام کی زبان بھی گوشت پوست کی ہوتی ہے۔ لیکن میں اگر کوئی غذا کھاؤں تو اس سے کھٹے اور میٹھے کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک مادی ذوق ہے۔۔۔ اور حضور ﷺ تناول فرماتے تھے تو زبان حلال وحرام کا بھی پتہ چلا لیتی تھی۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ انصار میں کہیں میت ہوئی آپؐ بھی جنازے میں تشریف لے گئے۔ جب دفن سے فارغ ہوئے تو میت کے وارثوں نے عرض کیا۔

"یارسول اللہ ﷺ! ہمارے گھر جاکر کچھ تناول فرمالیں"۔

آپ نے قبول فرمالیا۔۔۔ تشریف لائے گوشت لاکے رکھا گیا اور لوگ بھی کھانے لگے۔ آپؐ نے بھی چکھا۔ اور ارشاد فرمایا۔ یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔

بات یوں کھلی کہ جس نے دعوت دی تھی اس عورت نے کہ میں خاوند کو بھیجا کہ فلاں جگہ سے جاکر بکری خرید لا' تاکہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں۔۔۔ لیکن وہاں سے بکری دستیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے ایک پڑوسی کے پاس دام بھیجے کہ تو خرید کر لا۔ اس کو بھی دستیاب نہ ہوسکی۔۔۔ تو میں نے پڑوسی کی بیوی سے کہا کہ تو کہیں سے بکری لادے۔۔۔ اس نے خاوند کی بکری جو اس کی ملک تھی' پکڑ کر بلا اجازت بھیج دیں۔ میں نے ذبح کر کے پکادی'

اس کو حضور ﷺ کی زبان مبارک نے پہچانا کہ مال مغصوبہ ہے۔ جو بلا اجازت کے ذبح کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

"قیدیوں کو کھلادو' ہم یہ کھانا نہیں کھائیں گے"۔

تو زبان کے اندر مماثلت بھی ہے یعنی گوشت پوست اور مادی ہونے میں' اور دم مماثلت بھی ہے اس چیز میں کہ ہماری زبان فقط حاسۂ ذوق رکھتی ہے۔ اور حضور ﷺ کی زبان مبارک ذوق کے ساتھ ساتھ حاسۂ معنویت بھی رکھتی ہے جس سے حلت وحرمت جائز وناجائز یا افضل وغیرہ افضل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تو مماثلت بھی ہے مگر مماثلت کے ساتھ عدم مثیت بھی ہے۔

## صوم نبوی ﷺ کا امتیاز

آپ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَآاَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ.

میں تو جیسا ایک بشر ہوں لیکن حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت کو صوم وصال رکھنے

کی آپؐ نے ممانعت فرمائی کہ بلا افطار روزہ مت رکھو اور خود حضور ﷺ روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے متعدد روزے رکھتے۔۔۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں تو آپؐ نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں"۔

فرماتے ہیں۔

ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی.

تم میں مجھ جیسا کون ہیں۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے تو آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے۔۔۔ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ. میں تم جیسا بشر ہوں اور حدیث بالا میں فرماتے ہیں ایکم مثلی تم میں مجھ جیسا کون اور کون میرا مثل ہے۔ میرے ساتھ پروردگار کا دوسرا معاملہ ہے۔۔۔ تو مماثلت بھی ہے اور عدم مماثلت بھی ہے۔ مماثلت بھی ہے اور امتیازی شانیں ہر ہر عضو کے اندر بھی ہیں۔

## چشم نبوی ﷺ کا امتیاز

میری اور آپ کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادی آنکھ ہے شکلیں، صورتیں ہمیں نظر پڑتی ہیں۔۔۔ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء ﷺ کو بھی مادی آنکھ دی گئی۔۔۔ لیکن حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نماز میں بعض لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئیں تو آپؐ نے متنبہ فرمایا۔۔ اور فرمایا۔

انی اری خلفی کمااری بین یدی.

تم یہ سمجھتے ہو میں دیکھتا نہیں۔ میں پشت کی جانب سے دیکھتا ہوں تو آپ کی بینائی دو طرف کام کرتی تھی۔ پیچھے سے بھی دیکھتی ہے اور آگے سے بھی دیکھتی ہے۔ تو آنکھ آنکھ ہونے میں تو مماثلت ہے مگر آنکھ کی خصوصیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ پیغمبر کی آنکھ دوسری ہے، امتی کی آنکھ دوسری ہے۔

## حیات نبوی ﷺ کا امتیاز

اسی طرح جب ایک ایک جز اور زندگی کے ایک ایک شعبے میں مماثلت کے دعوے کے ساتھ عدم مماثلت اور امتیازی شان بھی موجود ہے۔ تو اگر ہم یوں کہیں کہ مجموعہ حیات میں بے شک مماثلت ہے کہ ہم بھی زندہ اور حضورؐ بھی زندہ ہیں مگر آپ کی زندگی میں جو خصوصیات ہیں وہ ہمیں میسر نہیں۔ تو یہ ہم کہہ سکتے ہیں کیونکہ زندگی کی ایک ایک جزئی میں امتیازی شان موجود ہے۔

## حیات بعد الوفات کا امتیاز

اس طرح سے ممات کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ ممات اور موت کے بعد جو حیات آتی ہے اس میں بظاہر مماثلت ہے لیکن پھر امتیازات ہی، مرنے کے بعد ہمیں وہ حیات میسر نہیں آسکتی جو انبیاء علیہم السلام

کو برزخ کی حیات میسر آتی ہے۔

## علامات حیات

اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ حیات اور زندگی کو پہچاننے کے لئے دو چیزیں ہیں جس سے آدمی پہچانا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے۔۔۔ یعنی حسی زندگی۔۔۔ ایک تو معنوی زندگی ہے کہ روح موجود ہے وہ تو ہر انسان کو حاصل ہے جس کی روح موجود ہے۔ بس وہ زندہ ہے۔۔۔ اور روح کسی کی بھی مردہ نہیں۔

امام غزالیؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ سے تو نہیں تھا، پیدا کیا گیا، لیکن پیدا ہونے کے بعد اب مٹے گا نہیں بلکہ وہ زندہ رہے گا، اس کی حقیقت اور روح قائم رہے گی چولے اور جسم بدل جائیں گے مگر اصل نفس قائم رہے گا۔

تو زندگی کے پہچاننے کی دو ہی علامتیں ہیں ایک کھانا پینا، کھاتا پیتا دیکھ کر ہم کھلے بندوں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی زندہ ہے، اور جس کا کھانا پینا بالکل چھوٹ جائے تو ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ بھئی! اس کی زندگی کیا، یہ تم عنقریب مرنے والا ہے، اس لئے کہ اس کی زندگی کے اسباب جب مفقود ہو گئے تو زندگی کیا رہے گی، آج مر جائے، تو کھانا حسی اسباب میں بقائے حیات کی علامت ہے۔

دوسری علامت زندگی کی یہ ہے کہ ہم نقل و حرکت دیکھیں۔ اگر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ہم اول ہلہ میں یہی سمجھیں گے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔۔۔ لیکن اگر وہ ہل رہا ہے حرکت کر رہا ہے، چلتا ہے پھرتا ہے کبھی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ یہ میت ہے، اس لئے نقل و حرکت زندگی کی بڑی علامتوں میں سے علامت ہے۔ تو زندگی کی دو علامتیں ہوئیں۔ ایک خورد و نوش، کھانا اور پینا، ایک نقل و حرکت، چلنا پھرنا، یعنی مختلف افعال کا سرزد ہونا جو حرکت کی علامت ہے اور یہ زندگی کی علامت ہے۔

اب دیکھئے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

**الانبیاء احیاءٌ فی قبورھم یصلون**

انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں حیات ہیں۔۔۔ کیوں حیات ہیں؟ اس کی علامت بتلائی گئی کہ نقل و حرکت پائی جاتی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں۔۔۔ تو ایک نقل و حرکت مادی ہے کہ ہم ترکاری خریدنے کے لئے بازار میں جائیں یا پڑھنے کے لئے کسی مدرسے میں جائیں، یہ مادی حرکت ہے اور نماز پڑھنے لگیں حرکت یہ بھی ہے مگر یہ روحانی عبادتی حرکت کہی جائے گی جو بازار میں جانے کی حرکت سے یقیناً افضل حرکت ہے۔ اور جو کھانے پینے کی حرکت سے یقیناً افضل ہے، کہ اللہ کے آگے جھک رہے ہیں۔۔۔ تو اس حدیث نے ثابت کیا کہ نبی کریم ﷺ حیات ہیں، اس لئے کہ حرکت بدن حیات کے آثار میں سے ہے۔ تو حرکت وہ ہے جو کامل ترین حرکت ہے، تو عبادتی حرکت ثابت ہوئی

محض کھانے پینے کی حرکت ثابتؔ نہیں ہوئی۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ :

**کانی انظر موسیٰ یلبی**

میں موسیٰ علیہ اسلام کو دیکھتا ہوں کہ لبیک لبیک کہتے ہوئے میدان عرفات میں جارہے ہیں توانبیاء علیہم السلام گویاحج کرتے ہیں۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور اون اور صوف کی لگام ہاتھ میں ہے اور لبیک لبیک پڑھتے ہوئے جارہے ہیں اور حج کررہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مطاف میں نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص طواف کررہے ہیں۔ مربوع الخلق یعنی چوڑے چکلے بدن ان کا سینہ نہایت چوڑا اوراس قدر خوبصورت اور اتنا شاداب رنگ کہ آپ فرماتے ہیں :

**کانه خرج من دیملس.**

کہ یہ شخص ابھی غسل کر کے حمام سے آیا اور گویاپانی اس کے بالوں سے ٹپک پڑے گا تواتنی تروتازہ اور شاداب صورت، چوڑے بدن، میانہ اور ذراپستی مائل قدر اور طوائف میں مشغول ہیں۔ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہے؟

"عرض کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں"۔

تو عیسیٰ علیہ السلام کو طواف کرتے ہوئے دیکھا موسیٰ علیہ السلام کو لبیک لبیک پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یونس علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر دیکھا کہ لبیک لبیک پڑھتے ہو جارہے ہیں۔ اور عام طور سے حضور ﷺ فرماتے ہیں :

**الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون.**

انبیاء اپنی قبور میں سب زندہ ہیں نمازیں پڑھتے ہیں۔۔۔ تو نماز بھی ثابت ہوئی، حج بھی ثابت ہوا۔۔۔ تو بدن کی نقل وحرکت ثابت ہوئی اور وہ حرکت جو عباداتی حرکت ہے، محض آنے جانے کی حرکت نہیں اس سے کہیں مکمل عباداتی حرکت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے :

**ونبی الله یرزق.**

اللہ کا نبی زندہ ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔۔۔ تو رزق کا دیا جانا خود دلیل حیات ہے کیونکہ کھانا پینا دوسری علامت ہے، اب یہ کہ وہ رزق کیسا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ

کس انداز کا تھا اس کی کیا کیفیت تھی؟ اس میں پلاؤ زردہ کیسا ہے؟ یہ اللہ جانے۔۔۔ لیکن رزق بتلایا گیا۔۔۔ تو رزق تناول کی چیز ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام گویا تناول بھی کرتے ہیں اور حرکات بدنی بھی ہوتی ہے۔ تو جیسے حرکات بدنی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں، جو عبادتی حرکت ہیں ممکن ہے کھانا پینا اعلیٰ ہی قسم کا ہو جو جنت کی غذا ہو۔ اس دنیا کی مادی غذا نہ ہو۔۔۔ تو جب نقل وحرکت بھی ثابت، خورد ونوش اور غذا بھی ثابت ہو تو اب حیات میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا، کیونکہ آثار میں سے یہی دو چیزیں ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی حرکت بدن ان کی حیات ہے۔

**حیات شہدا**

اسی طرح سے قرآن کریم نے شہداء کی بھی حیات ثابت کی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ.

جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں انہیں مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ یعنی مردہ تو ہے نہیں تمہیں کہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ ان کے حق میں بے ادبی ہے بلکہ وہ زندگی ہیں لیکن تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے۔۔۔ یعنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے کہ کس کیفیت کی زندگی ہے۔۔۔ تو قرآن کریم میں شہداء کی زندگی ثابت کی گئی۔

اب کسوٹی پر جانچئے جو ہم نے عرض کی تھی کہ حیات کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں خورد ونوش وہ نقل وحرکت کرتے ہیں اور وہاں کی غذائیں کھاتے ہیں۔۔۔ تو رزق بھی دیا گیا اور نقل و حرکت بھی پائی گئی۔۔۔ مگر فرق کیا ہے۔۔۔؟

انبیاء علیہم السلام کی نقل وحرکت عباداتی تھی معاشی نہیں تھی کہ کھانے پینے کے لئے جائیں شہداء کی نقل وحرکت کھانے اور پینے کی ہے کہ جاؤ اور جنتوں میں جا کے چرو۔۔۔

انبیاء علیہم السلام کو ان کی غذا وہیں پہنچتی تھی شہیدوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے جنتوں کے میدان میں جانا پڑے گا۔ اور چونکہ بطور جزاء کے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو دونوں چیزیں شہداء کے حق میں بھی ثابت ہوئیں، نقل وحرکت بھی اور خورد ونوش بھی۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں معاشی نقل وحرکت نہیں تھی بلکہ عباداتی تھی۔۔۔ یہاں معاشی نقل وحرکت ہے کہ کھانے پینے کے لئے جائیں وہاں انبیاء علیہم السلام کے پاس رزق پہنچتا تھا شہداء کے پاس رزق نہیں پہنچتا رزق کے پاس انہیں پہنچنا پڑتا ہے چونکہ انہیں جانا پڑتا ہے تو یہ نمبر دو ہو گئے۔

**حیات صلحاء**

اب ایک عامۂ مومنین ہیں جن کو صلحاء امت کہا جائے گا اس میں درجہ بدرجہ کچھ گناہ بھی ہیں کچھ نیکیاں بھی ہیں مگر ان پر غلبہ نیکیوں کا ہے ان کے بارے میں کیا فرمایا گیا۔۔۔؟

ان کو نقل و حرکت کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ علیین کے مقام پر اپنی جگہ موجود ہیں ان کو جانے آنے کی اجازت نہیں ہے کہ روزق کھانے کی بھی ان کو اجازت نہیں ثابت کیا ہو۔۔۔؟

ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب ایک میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں وہ پورا اترتا ہے، تو پہلے جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے وہ ٹھکانا نظر پڑتا ہے، اسے بتلایا جاتا ہے کہ تیرا یہ ٹھکانہ تھا لیکن تو نے چونکہ صلاح اور نیکی اختیار کی اللہ نے ہمیشہ کے لئے یہ تجھ پر بند کر دیا۔ پھر ملائکہ جنتوں کا دروازہ کھولتے ہیں، دور سے ان کی روح وریحان اور نعمتیں نظر پڑتی ہیں، اور اس کی خوشبوئیں اور لپٹیں آتی ہیں جو دماغ کو معطر کرتی ہیں اور قوت بخشتی ہیں، تو صلحاء مؤمنین کو کھلایا پلایا نہیں جاتا۔ تو معدے کے راستے سے کوئی غذا نہیں جاتی بلکہ دماغ میں بسادی جاتی ہے تاکہ دماغ میں اس سے عطریت اور خوشبوئیں پیدا ہو جائیں، نقل و حرکت نہیں کر سکتے کہ جنتوں میں جائیں لیکن دروازے کھولدئے جاتے ہیں دور سے دیکھتے رہیں تاکہ امید قائم رہے، تو یہ حیات ہے مگر یہ ادنیٰ درجے کی حیات ہے۔

## موت کفار

اب ایک کفار ہیں ان پر اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتے ہیں، نہ ان کو حرکت دی جاتی ہے۔ نہ غذا۔۔۔ حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی حرکت نہیں یعنی ان کی قوت خیالی بھی حرکت نہیں کر سکتی۔۔۔ قوت خیالیہ اگر حرکت کرے تو کم سے کم آدمی بیٹھ کر سوچتا ہے کہ میں گرفتار ہوں، میری رہائی کی یہ صورت نکل سکتی ہے۔ تو چاہے نہ نکلے، مگر دل میں ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کچھ امید کی رمق ہوتی ہے اگر میں نے یوں کر لیا تو شاید میں چھوٹ جاؤں۔ تو جہنمیوں کو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی کہ قوت فکریہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ ان کا خیال بھی محبوس اور مقید ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ رہائی کیا صورت ہو سکتی۔۔۔ تو نہ بدن نقل و حرکت کرے گا نہ خیال نقل و حرکت کرے گا۔ نہ غذا ملے گی اور نہ غذا کا تصور ملے گا۔ یہ تو حقیقی معنی میں اگر میت کہا جائے تو کفار کو کہا جائے گا۔ کہ وہ صحیح معنی میں میت ہیں کہ نہ نقل و حرکت کی اجازت نہ معنوی نہ مادی نہ حسی اور نہ کھانے پینے کی اجازت۔

## مراتب حیات

باقی حیات عوام مومنین کے لئے ثابت۔۔۔ شہداء کے لئے بھی اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی، لیکن درجہ بدرجہ، غرض انبیا علیہم السلام زندہ ہیں۔ ان کی نقل و حرکت عبادتی ہے اور غذا ان کی خدمت میں پہنچائی جاتی ہے۔۔۔ شہداء زندہ ہیں ان کی نقل و حرکت مادی ہے ان کو غذا دی جاتی ہے، مگر غذا کے پاس ان کو جانا پڑتا ہے عوام مومنین کو نقل و حرکت کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے مقام پر رہیں۔ مگر احترام سے رکھے جاتے ہیں اور جنت کی نعمتیں دکھلا دی جاتی ہیں تاکہ ان کی قوت خیالیہ منبسط ہو جائے اور اعلیٰ درجے کی توقعات

باندھیں کہ اب قریب میں وہ وقت آنے والا ہے کہ انشاء اللہ ہم ان نعمتوں میں پہنچیں گے۔ تو نعمت سے بڑھ کر امید نعمت ہوتی ہے توقع لگی ہوئی ہے کہ اب وہ نعمت چند منٹ کے بعد ملی اب وقت آیا کہ یہ نعمت مجھے ملی، تو مومنین کی قوت خیالیہ پر پابندی عائد نہیں ہے۔ ان کی قوت خیالیہ آزاد ہے وہ اس سے لذت لیتے ہیں۔ تو یہ لذت انہیں ملتی ہے۔۔۔ یہ حیات کے تین درجے ہو گئے اس معیار سے زندگی کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی نقل و حرکت اور خورد و نوش ہے تو اقویٰ ترین حیات انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہوئی۔

متوسط حیات شہداء کی ثابت ہوئی۔ ادنی حیات صلحاء کی ثابت ہوئی جس جس درجے کی یہ حیات ہے اسی درجے کے اثرات بھی ہیں دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں۔۔۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات اتنی کامل ہے کہ اقویٰ ترین ہے، دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ دنیا سے جا چکے ہیں لیکن ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئیں، دوسرے خاوندوں سے نکاح نہیں کر سکتیں۔۔۔ دنیا سے جا چکے ہیں لیکن ان کے مالوں میں میراث تقسیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ زندہ کے مال میں میراث تقسیم نہیں ہوتی، تو انؑ کے مال بھی میراث سے مستثنیٰ اور ان کی بیویاں بھی زوجیت اور نکاح سے مستثنیٰ۔

شہداء کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ ان کی بیویوں کا نکاح نہ ہو سکے۔ ان کے مال میں میراث تقسیم نہ ہو سکے، یہ تو سب ہوگا۔۔۔ لیکن ان کے بدنوں کو کچھ ایسی قوت دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر بھی ان کے کچھ ابدان محفوظ رہتے ہیں اور ان میں تغیر بہت کم سے کم ہے یا نہیں ہوتا۔

اور عوام مومنین کا دنیا کے اندر کوئی اتنا اثر نہیں ہے۔ ان کے بدن بھی مٹی ہو جاتے ہیں اور گل جاتے ہیں۔۔۔ تو جس جس درجے کے حیات برزخ میں ہے اسی اسی درجے کے آثار دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں اس لئے دنیوی معیار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی سی حیات برزخ میں نہیں ہے جب کہ دنیا کے اندر بھی انبیاء علیہم السلام کی حیات عام لوگوں جیسی نہیں تھی۔ یہاں حیات کی نوعیت دوسری ہے۔

### ولادت نبوی کا امتیاز

عام طور سے ولادت ہوتی ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آیا روتا ہوا اور اوندھا نکلا۔۔۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت باسعادت اس طرح سے ہوئی کہ ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے، چہرہ مبارک آسمان کی طرف تھا شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی، گویا وحدانیت کا اعلان فرماتے ہوئے تشریف لائے۔ کوئی آلائش نہیں ہوئی۔ نو کے نو مہینے ماں کے پیٹ میں کوئی بوجھ نہیں رہا۔ ہلکا پھلکا رہا پھر انوار و برکات ظاہر ہوئے کہ پیدائش کے وقت اتنا نور نکلا کہ حضرت آمنہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس نور اور چاندنے کی روشنی

میں شام کے محل دیکھ لئے تو عام طور سے ولادت کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ ولادت آپ کی بھی ہوئی۔ لوگوں کی بھی ہوتی ہے، مگر باوجود اس مثلیت کے آپؐ کی ولادت میں اور عام لوگوں کی ولادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

## طفولیت کا امتیاز

اسی طرح سے طفولیت کی زندگی عام بچوں کی بھی ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوئی اور حضور ﷺ کی بھی ہوئی --- لیکن اس طفولیت میں بھی وہ امتیازات ہیں کہ دنیا کے اطفال کو وہ نصیب نہیں --- کہیں شق صدر ہو رہا ہے۔ کہیں برکتوں کے آثار نمایاں ہیں۔ کہیں حلیمہ سعدیہ کی وہ اونٹنی جس پر وہ سوار ہو کر جا رہی تھی باوجود لاغر ہونے کے اتنی تیز دوڑنے لگی کہ بڑے بڑے گھوڑے پیچھے رہ گئے --- قحط سالی عام تھی دودھ پلانے کے لئے جب حضور ﷺ کو لے کر پہنچیں تو اس سال اتنے پھل آئے کہ اس سے پہلے اتنے پھل کبھی نہیں آئے تھے --- تو یہ برکات بھی ہیں جو عام نہیں ہیں۔

## حیات برزخ کا امتیاز

اسی طرح آپ کی جوانی دیکھی جائے تو جوان اور بھی ہوتے ہیں آپؐ بھی ہوئے لیکن پھر جوانی میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ کہ اس کے آثار و برکات جداگانہ ہیں۔

حواس کو دیکھا جائے تو جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم حاسہ بصر سے سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور حضور ﷺ آمنا سامنا اور پیچھے کی دونوں چیزیں دیکھتے تھے۔ ہمارا حاسۂ بطش اور ہاتھ کی قوت فقط سختی اور نرمی کو پہچانتا ہے --- آپؐ کے ہاتھ کی قوت، معنویت اور شرح صدر کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی تھی --- ہماری زبان مادی زبان ہے مگر چکھتی ہے تو کھٹا میٹھا محسوس ہوتا ہے حضور ﷺ کی زبان مبارک حلال و حرام کا بھی پتہ چلا لیتی ہے۔ تو باوجود مثلیت کے بہت سی خصوصیات ہیں کہ جن پر نبی کو غیر نبی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سے برزخ میں حضور ﷺ کی حیات نہایت قوی اور اکمل ہے کہ دنیا سے بھی قوی ہے --- لیکن اس کے باوجود کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ احادیث سے جتنے قرائن بیان کر سکتے ہیں، وہ بیان کر دیئے گئے۔ اب اس کا ادراک کرنا کہ نوعیت کیا ہے۔ یہ ہماری قدرت سے خارج ہے، یہ خلاصہ ہے۔

**نوعیت حیات** اب اس میں علماء کے دو مسلک ہیں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ حیات ہیں. لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو وفات کے بعد پھر حیات دی گئی ہے، اور وہ ایسی دی گئی جیسے دنیا کی حیات تھی لیکن وفات اور قبض روح کے بعد دی گئی ---

اور وہ یہ کہ ہر انسان کو وفات دیدی جاتی ہے اور روح قبض ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کو بھی وفات دی گئی۔ اور روح قبض ہوئی اب جب قبر مبارک میں پہنچے تو وہاں جا کر عامہ مومنین کی شان یہ ہے کہ انہیں پھر زندہ کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کو بھی کہتے ہیں کہ قبر میں پھر زندہ کیا گیا۔ عامۂ مومنین کا یہ حال ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کو حیات دی جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اس موت سے مستثنیٰ ہیں جب قبر میں زندہ ہوئے۔ اب قیامت تک بلکہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ اب موت نہیں آئے گی۔ اسی کو صدیق اکبرؓ نے فرمایا:

"اللہ نے آپ کو اس سے مکرم بنایا ہے کہ آپؐ کے اوپر دو موتیں طاری کرے بس وہ ایک ہی موت ہے جو آئی۔ اس کے بعد اب جو زندگی آئی ہے تو ابدی زندگی ہے پھر موت نہیں ہے"۔

اور عوام مومنین پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک یہاں جس کو ہم موت کہتے ہیں ایک عالم برزخ میں کہ زندہ کرنے کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے اور فرمادیا جاتا ہے: نم کنومۃ العروس اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے۔

تو ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام حیات ہیں ان کی بالکل دنیوی حیات ہے مگر موت سے انقطاع واقع ہوا اور بعد میں جو حیات آئی وہ ویسی ہی تھی جیسی دنیا میں تھی مگر وہ ابدی ہے۔

اور ایک جماعت علماء کرام کی یہ کہتی ہے کہ بیچ میں موت کا واسطہ آیا۔ لیکن اس سے سلب روح نہیں ہوا۔ یعنی موت واقع ہوئی۔ اس واسطے کہ موت تو قطعی ہے قرآن کریم نے شہادت دی ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ

تو موت واقع ہوئی۔۔۔ لیکن موت واقع ہونا اور ہے اور سلب حیات اور ہے۔ موت واقع ہو اور حیات کلیہ سلب نہ ہو یہ ممکن ہے اس واسطے کہ موت عارضی طور پر واقع ہوئی۔ اور حیات انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں ڈالدی گئی تھی تو وہ کلیۃً سلب نہیں ہوئی گو موت بھی واقع ہوئی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کہ پانی۔۔۔ تو پانی کی ذات میں ٹھنڈک ہے کہ وہ آگ آئے تو اسے بجھا بھی دیتا ہے۔۔۔ لیکن پانی میں عارضی طور پر حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے آگ پر تپا دیں تو وہ کھول کر اتنا گرم ہو جائے گا کہ جو کام آگ کرے وہ پانی کرے گا لیکن اس حالت میں بھی اگر اسی آگ کے اوپر ڈال دیں تو آگ کو بجھادے گا معلوم ہوا پانی کے اندر ذاتی برودت باوجود انتہائی گرم ہونے کے موجود ہے اگر انتہائی گرم ہو کر پانی کی حقیقت اس کے اندر سے نکل جاتی تو آگ کو بجھا

نہ سکتا لیکن کھولتا ہوا پانی بھی آگ کو بجھاتا ہے، معلوم ہوا کہ برودت کا ماد موجودہ ہے جو اس کے اصل جوہر میں قائم تھا وہ نہیں نکلا اور اوپر سے حرارت بھی موجود ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں حیات رکھی جاتی ہے۔ موت جب طاری ہوتی ہے تو کلیتہً حیات سلب نہیں ہوتی۔ تو موت بھی ہے اور حیات بھی ہے۔ دونوں جمع ہیں جیسے گرم پانی میں برودت بھی اور حرارت بھی دونوں جمع ہیں ایک اصلی ہے اور ایک عارضی ہے۔ غرض ایک جماعت علماء کرام کی اس کی قائل ہے کہ موت واقع ہوئی مگر سلب حیات واقع نہیں ہوا بلکہ حیات موجود رہی۔ اس آثار موجود رہے کیونکہ وہ اصلی تھی اور موت صرف عارضی طور پر طاری ہوئی۔۔۔ تو اس میں دونوں کا اتفاق ہے کہ برزخ کے اندر حیات ہے اور ویسی ہے جیسے دنیا کی لیکن ایک کہتے ہیں کہ وہ مستمر حیات ہے اور ایک کہتے ہیں کہ وہ منقطع ہو کر پھر پیدا ہوئی ہے، نتیجہ دونوں ایک رائے رکھتے ہیں کہ حیات وہی ہے جو دینوی حیات ہے۔

**سلامتی کا راستہ**

یہ علماء کرام کا اختلاف ہے اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یوں کہیں برزخ میں انبیاء علیہم السلام اسی طرح حیات ہیں جس طرح ہم دنیا میں حیات ہیں۔ اب یہ کہ وہ حیات از سر نو آئی یا وہ پہلی ہی چل رہی ہے، یہ علماء پر موقوف ہے ان کی آراء ہیں ان کی وجوہ ہیں۔ ان کے قرائن اور دلائل ہیں نہ ہم انہیں توڑ سکتے ہیں نہ ان کا خلاف کر سکتے ہیں، ہم گردن جھکائیں گے۔ بس اس قدر مشترک کے قائل ہو جائیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سے زندہ ہیں۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر ایک ہی موت طاری ہوئی اور اس کے بعد جو حیات آئی وہ مستمر اور دائمی ہے جیسا کہ وہ صدیق اکبرؓ کے مقولے سے استناد کرتے ہیں۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے عوام مومنین کی یہ صورت نہیں ہے، ان پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔۔۔ پہلی موت تو وہ جس کہ ہم احتضار کہتے ہیں کہ ایک آدمی انتقال کر جائے۔ دوسری موت وہ جو قبر میں سوال وجواب کے بعد کہدیا جاتا ہے۔ نم کنومۃ العروس اور قرآن کریم میں جو فرمایا گیا:

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْيَاكُمْ.

یہاں موت کے معنی سلب کے نہیں ہیں یہاں موت کے معنی عدم ایجاد کے ہیں یعنی تمہیں وجود نہیں ملا تھا۔ عرف عام میں تو موت اسی کو کہتے ہیں کہ حیات چھین لی جائے یا اس کی کمی کر دی جائے تو ظاہر ہے جو ابتدائی موت ہے وہ عدم ہے اس کو آپ موت کہہ رہے ہیں اور قرآن کریم نے جو موت کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ حیات چھینی گئی بلکہ یہ ہیں کہ اس وقت تک حیات دی نہیں

گئی تھی، البتہ۔

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین.

”دو موتیں مراد ہیں ایک دنیوی موت اور ایک وہ جو قبر کے اندر حیات کے بعد واقع ہوگی“

**انکشاف برزخ** شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خدام میں سے ایک خادم جن کا نام عاشق ہے کے بارے میں لکھا۔ یہ وہی عاشق ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ کے لکھنے کے محرک بنے ہیں۔

تو انفاس العارفین میں ایک واقعہ لکھا ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں جنگل میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر اچھا فاخرہ لباس پہنے ہوئے اور بڑے اچھے شاندار گھوڑے اور چلے آ رہے ہیں مگر ہر سوار کی کچھ ایسی شکل ہے جیسے کوئی متجسس ہوتا ہے اور ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

میں قریب سے گزرا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ادھر تشریف لائے ہیں؟

میں نے عرض کیا۔ کیا آپ حضور ﷺ کی تلاش میں ہیں؟

انہوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ کون ہیں؟

اس نے کہا۔ میرا نام ابوہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور میں آنحضرت ﷺ کی تلاش میں ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں عاشق کا قرآن کریم سننے کے لئے جا رہا ہوں۔

ان کی تلاش میں ہم نکلے ہیں

یہ کہہ کر وہ سوار غائب ہوگئے۔۔۔ تو شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنے والد بزرگوار کی طرف منسوب کیا۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ واقعہ عالم برزخ میں پیش آیا ہو۔ لیکن بعض دفعہ عالم برزخ منکشف ہو جاتا ہے اور اس کی صورتیں ہمیں اس جہان میں بیٹھ کے نظر آتی ہیں۔۔۔ تو یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ برزخ سے نکل کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بلکہ ہماری نگاہ برزخ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں کے احوال منکشف ہو جاتے ہیں۔

**انکشاف سجین** جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت محدثانہ روایات سے اس قسم کے واقعات کتاب الروح میں نقل کئے ہیں۔

ایک جگہ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک اونٹنی پر سوار ہو

کر سفر کر رہے تھے جس وقت بدر کے اس مقام کے قریب پہنچے جس میں کفار کی لاشیں ڈالی گئی تھیں تو مغرب کا ساوقت ہو گیا تھا۔ تو دیکھا کہ بدر کے کنویں میں سے ایک نہایت ہی سیاہ فام اور بدہیئت شخص نکلا اور اس شان سے نکلا کہ بے حد ہی کریہہ المنظر اور ڈراونی صورت۔ اور وہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی طرف دوڑا اور کہا۔

یا عبداللہ اسقنی.

یہ کہہ رہا تھا کہ کنویں کے اندر سے ایک زنجیر پیدا ہوئی اور اس کے پیروں میں جکڑی گئی اور اسے نیچے کی طرف جذب کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس واقعہ کو دیکھ بے ہوش ہو گئے اور اونٹنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بالکل حمائل ہو گئے۔۔۔ اونٹنی وہاں سے بھاگی اور انہیں مدنیہ لے کر پہنچی۔

جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہوش میں آئے تو واقعہ سنایا۔ تو حضرت عثمان غنیؓ نے آرڈر جاری کیا۔ کوئی شخص رات کے وقت بالکل تنہا سفر نہ کرے۔ بالخصوص جب کوئی رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سجین سے نکل کر دنیا میں آگیا لیکن سجین منکشف ہو گیا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ سارا واقعہ دیکھا جو سجین میں پیش آرہا تھا۔۔۔ غرض اس قسم کے واقعات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بکثرت نقل کئے ہیں۔ اور محد ثانہ انداز سے بھی نقل کئے ہیں۔

**عالم منام**

نیز بہت سے منامات بھی نقل کئے ہیں۔ جیسے ابن ابی الدنیا جو مشہور محدث ہیں ان کا واقعہ نقل کیا ہے کسی عارف نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔۔۔ اور وہ شخص بھی عارفین سے میں تھا۔۔۔ ان سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ تو انہوں نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے کہ اجر و ثواب کے
ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے پاس
پہاڑوں کی طرح لگ جاتے ہیں"۔

اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔

ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم ہفتے میں ایک بار ابن ابی الدینا کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ تحائف ہم کو ملتے ہیں جو دنیا والے ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔۔۔ غرض کچھ خوابیں اور منامات اور کچھ محد ثانہ روایتیں ان سے اس قسم کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

**مقام میت کا انکشاف**

ایک واقعہ میں نے اپنے فارسی کے استاذ مولانا محمد یسین صاحب مرحوم

سے خود سنا جو آپ کے پاکستان کے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب (مرحوم) ان کے والد ماجد تھے۔۔۔وہ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ تو وہ ہمارے بھی استاذ بھی تھے۔۔۔انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔۔۔اس واقعہ کا حاصل یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید احمد دہلوی رحمتہ اللہ علیہ مدرس تھے اور عالم جید تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ فنون معقولہ کے امام تھے اور بہت ہی ذکی تھے۔ آپ چھ مہینے تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بھی رہے۔۔۔ان کے صاحبزادے تھے جن کا نام مولوی مصطفیٰ تھا۔ اور ہمارے ہی استاذ مولانا یسین صاحب کے ہم جماعت تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی مصطفیٰ صاحب نے ان سے اپنا واقعہ بیان کیا اور مولانا محمد یسین صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا۔۔۔ بس راوی بیچ میں ہمارے اور صاحب واقعہ کے مولانا محمد یسین صاحب ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ:

"مولوی مصطفیٰ جب دہلی وطن پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب جمنا میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ اور جمنا کے کنارے کچھ قبرستان تھے تو ان میں سے بہت سی قبریں بہہ گئیں ایک قبر جو ٹوٹی تو اس کی مٹی بہہ گئی اور اس کی لاش نمایاں ہو گئی۔۔۔پانی تو ہٹ گیا لیکن وہ لاش رکھی ہوئی۔ مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ اس لاش دیکھنے کے لئے آس پاس کے بہت سے دھوبی جو کپڑے دھو رہے تھے وہاں آکر جمع ہو گئے۔۔۔اور شہرت جو ہوئی تو شہر سے بھی لوگ آئے"۔

"اس کی کیفیت انہوں نے دیکھی کہ اس لاش کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ڈنک مارتا ہے جب ڈنک مارتا ہے تو لاش ایک دم لرز جاتی ہے اور ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہے۔ اور کئی منٹ بعد لاش اصلی حالت پر آتی ہے۔۔۔جب اصلی حالت پر آئی، پھر اس نے ڈنک مارا پھر اسی طرح لرز گئی۔۔۔یہ انہوں نے تماشا دیکھا۔۔۔ اس میں کسی دھوبی نے اس لاش پر رحم کھا کر ایک کنکری زور سے کیڑے کے ماری۔ وہ کنکری کیڑے کے تو نہیں لگی۔۔۔لیکن کیڑے کے پاس جا کر لگی۔۔۔ تو ایک دم اچٹ کر کیڑا اٹھا اور اس دھوبی کی پیشانی پر آبیٹھا اور اسے ڈنک مارا۔ اور اسے ڈنک مار کر پھر اس لاش کے اوپر جا بیٹھا"۔

مولی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ دھوبی چلایا اور اس نے کہا:

کچھ عجیب قسم کی آگ میرے اندر ہے کہ نہ میں یہ کہہ سکوں کہ سانپ نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ بچھو نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ آگ میں جلا کہہ کچھ نہیں سکتا کہ وہ کس قسم کی گرمی ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر رگ میں ہزاروں بچھو

پڑے ہوئے ہیں جو ڈنک مار رہے ہیں"۔

خیر اس کے ہاتھ وغیرہ باندھے گئے اب مجمع بدستور ہے۔ تو مولوی مصطفی صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے یہ سمجھا کہ کیڑا کوئی عالم مادی کی چیز نہیں ہے یہ کوئی عذاب خداوندی ہے جو اس میت پر ہے تو بجائے اس کے کہ اسے کنکر مارتا۔ میں نے اس میت کے قریب بیٹھ کر سورۃ یسین پڑھنی شروع کی۔ اس کے علاوہ کچھ قرآن شریف کی آیتیں اور سورتیں جو مجھے یاد آئیں جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں۔ وہ کیڑا مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے تلاوت کی۔ وہ کیڑا بالکل مضمحل ہو کر ایسا رہ گیا جیسے راکھ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس میت کو دفن کر دیا۔ اور وہ دھوبی دو تین دن زندہ رہا اور یہ کہتا تھا کہ میں اپنے کرب و بے چینی کا بیان نہیں کر سکتا۔

تو یہ اسی قسم کے واقعات ہیں یہ معاملات تو برزخی ہیں لیکن برزخ دنیا میں نہیں آتا۔ نہ میت اپنے مقام پر چھوڑ کر آتا ہے۔ وہ مقام کو رہے لیکن کبھی کبھی حق تعالیٰ عالم برزخ کی چیزیں منکشف فرما دیتے ہیں اور انسان واقعات دیکھنے لگتا ہے۔۔۔ تو وہ برزخ کی چیزیں اسی طور پر دیکھ رہا ہے جیسا کہ خواب میں ہم دوسرے عالم کی چیزیں دیکھتے ہیں۔

جیسے عالم مثال خواب میں دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن دنیا والے بعض اوقات سو کر عالم مثال کے اندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے واقعات دیکھتے ہیں۔

اسی واسطے فرمایا گیا النوم اخ الموت نیند جو ہے یہ موت کی بہن ہے یعنی جو کیفیات موت میں آتی ہیں، وہی نیند میں طاری ہوتی ہیں۔ قوت و ضعف اور دوام وعدم دوام کا فرق ہے۔ تو سونے والا جب خواب دیکھتا ہے اور یہ دیکھے کہ میں کسی شدید عذاب میں مبتلا ہوں اور لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ڈنڈوں سے خبر لے رہے ہیں۔۔۔ بعض مرتبہ وہ خواب میں چلاتا ہے اور چلاتے ہوئے بعض اوقات اس کی آواز جاگنے والے سن لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں! کیا ہوا۔؟

وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔ تو ہم نے نہیں جانا وہ کہاں گیا تھا حالانکہ وہ اس عالم میں گیا اور وہ وہاں تکلیف اٹھائی مگر اس عالم میں اتنا چلایا کہ اس عالم کے اندر اس کی آواز منتقل ہو گئی۔ اور اس عالم والوں نے اس کی آواز کو سن لیا اس لئے بعض برزخ کی آوازیں شروع وہاں سے ہوتی ہیں مگر ہمارے کانوں تک آ کر منتہی ہو جاتی ہیں۔ تو جب بیداری میں صورت ممکن ہے تو عبرت کے طور پر خواب والا ایک دوسرے عالم میں ہو اور وہاں کی چیزیں ہم یہاں دیکھ لیں یا سن لیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ میت اپنے مقام پر ہو اور اس کا عذاب یا ثواب بعض دفعہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ خواہ خواب میں دیکھیں یا کشفی نگاہ سے دیکھیں۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔۔۔ تو اس کو یہ نہ

سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ سے کسی کی روح منتقل ہو کر دنیا میں آگئی۔ یا کوئی یہاں چلا آیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر ہے البتہ اس کا مقام یہاں منکشف ہو گیا۔

## تعدادارض وسماء

اَللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ.

اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کئے اور اس کے مثل سات زمینیں پیدا کیں۔۔۔ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر میں یہ بات بھی ہے کہ ہر زمین میں آبادی ہے اور انبیاء علیہم السلام بھی آتے ہیں۔۔۔ یہ روایت ہے اب یہ کہ وہاں یہی چاند سورج کام دیتا ہے یا وہاں کا چاند سورج الگ ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔۔۔ جب کہ دنیا کے بہت سے خطوں کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں اسی سورج کی روشنی پہنچتی ہے یا نہیں۔۔۔ اگر آپ قطبین کے قریب آبادیاں دیکھیں وہاں چھ چھ اور نو نو مہینے کی رات ہوتی ہے۔ سورج نکلتا ہی نہیں۔ وہاں لوگ اندھیرے میں بسر کرتے ہیں۔۔۔ اب رہا یہ کہ وہ چراغ جلاتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتے ہوں بہر حال اس زمین پر بھی ایسے مواقع ہیں کہ وہاں اس سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ یا پہنچتی ہے تو کئی مہینوں میں جا کر۔۔۔۔ جو سورج اس زمین پر پورا کام نہ دے سکے' اس کے بارے میں آپ یہ کہیں کہ ساتوں زمین میں وہی کام دے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کام دے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ وہاں شاید کوئی اور سورج ہو۔

## میت کا علم وادراک

مسند ابی حنیفہؒ میں امام صاحب سے خود روایت ہے۔ جہاں قبور کے آداب زیارت لکھے ہیں کہ میت کی زیارت اس طرح کی جائے کہ قبلہ کو پشت کی جائے اور میت کی طرف رخ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ تعارف بھی ہوتا ہے۔۔۔ اگر دنیا میں وہ شخصی طور پر پہچانتا تھا وہاں بھی شخصی طور پر پہچانے گا۔ کوئی عمومی طور پر پہچانتا ہے تو ہاں بھی عمومی طور پر پہچانے گا۔ جہاں مواجہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کے ذریعے روح کو متوجہ کرا دیا جاتا ہو گا۔۔۔ جیسا کہ آپ مثلاً جاگ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی ہوئی ہے مگر خیال دوسری طرف ہے تو باوجود یہ کہ آنکھ کھلی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے۔۔۔ بعض دفعہ ہم بازار جاتے ہیں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور ایک بڑا تماشا گزر رہا ہے۔ جب گھر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا گزرا؟ آپ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا۔۔۔؟ کہ وہی جو بازار میں تھا۔۔۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میاں تم آنکھیں کھولے ہوئے تو جا رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ واللہ' مجھے تو خبر نہیں۔۔۔ اس وقت آپ کہتے ہیں کہ افوہ! میرا دھیان دوسری طرف تھا۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے بلکہ دھیان دیکھتا ہے۔ اگر دھیان دوسری طرف ہو آنکھ کھلی رہے گی۔ آپ

کبھی نہیں دیکھ سکیں گے متوجہ ہو جائیں وہی آنکھ دیکھنے لگے گی۔۔۔ اگر آپ غیر متوجہ ہیں۔ کان کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کو آواز نہیں آئے گی۔ توجہ کر لیں تو کانوں میں آواز آنی شروع ہو جائیگی بعض اوقات آذان کی آواز نہیں سن پاتے خیال دوسری طرف متوجہ ہے آپ اسی میں مستغرق ہیں تو قوت خیالیہ کو اگر ان حواس کی طرف متوجہ کر لیا جائے تو وہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر متوجہ نہ کیا جائے تو وہ ادراک نہیں کرتی۔۔۔ تو ہو سکتا کہ ملائکہ کے ذریعے سے میت کو توجہ دلا دی جاتی ہو۔ جب متوجہ ہوا تو اس کی قوت خیال اور حسی کام کرنے لگتی ہے۔ نہ متوجہ ہوا نہیں کرتی۔۔۔

اور یہ جب ہوتا ہوگا جب کوئی جا کر سلام کرے۔ مطلقاً نہیں کہ جو قبرستان سے گزرے میت متوجہ ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔

## علیین و سجین کا مقام

علیین کا آپ اپنے ذہن میں یہ جغرافیہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے۔ علیین اور سجین یہیں کھپا ہوا ہے، جیسا کہ ہماری روح بدن میں کھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن کو الگ کر دیا جائے اور روح دیکھنے کا کوئی آلہ ہو تو روح کے واقعات آپ کو یہیں نظر آئیں گے۔ اسی طرح علیین اور سجین کے مقامات اسی عالم عنصری میں عالم روح کی طرح کھپے ہوئے ہیں۔ حجابات پڑے ہوئے ہیں۔ اگر حجابات اٹھا دیئے جائیں۔ وہ سارا ثواب و عذاب آپ کو یہیں نظر پڑے گا۔ اوپر نہیں جانا ہوگا۔ غرض یہ تو ایک نگاہ کی چیز ہے کہ نگاہ جغرافیہ بنالیتی ہے کہ جب علیین اور سجین ہیں۔ تو وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہوں گے یہ ضروری نہیں وہ یہیں کھپے ہوئے ہیں، مادی حجابات میں غرق ہیں۔ اگر وہ اٹھا دیئے جائیں آپ دیکھنے لگیں گے۔

## حجیت کشف

بعض اہل اللہ پر عذاب قبر منکشف بھی ہو جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب شاہ عبدالقادرؒ کی وفات ہوئی تو اتنی مقبولیت تھی کہ مجھے منکشف ہوا کہ اس روز دہلی کی ساری قبروں میں سے عذاب قبر اٹھا دیا گیا تھا۔ اتنی تکریم ہوئی۔۔۔ اب یہ انکشاف کی بات ہے کہ کوئی حجت شرعی تو نہیں تھی۔ آخر انکشاف ہے۔ کشف بھی کوئی رد کرنے کی چیز تو ہے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ حجت شرعی نہیں۔ نفس وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور صوفیاء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں مگر اپنے نفس کے لئے حجت ہے جب آدمی قطعی طور پر دیکھ رہا ہے۔

نیز یہ کہتے ہیں کہ اس حجت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیا تو آخرت کا کوئی نقصان نہیں۔۔۔ اس لئے کہ آخرت کے نفع و نقصان کا تعلق نصوص سے ہے۔ کشوف سے نہیں لیکن دنیا میں کوئی نقصان ضرور پہنچ جائے گا۔ ایک چیز واقعی تھی اس کو دکھلائی گئی۔ اس کے

تقاضوں پر عمل نہ کیا تو اس کا نقصان پہنچے گا مگر دنیوی۔ اخروی کوئی ادنیٰ نقصان نہیں ہو گا۔

یہ علیین اور سجین کی بارے جغرافیہ کی بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت اسلام کا تو یہ موضوع نہیں البتہ ارباب کشوف اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں وہ اگر چہ حجت تو نہیں۔۔۔ لیکن اگر خلاف میں کوئی دلیل قائم نہ ہو قابل رد بھی نہیں مانی جاسکتی ہے۔

## جنت و جہنم کا جغرافیائی مقام

شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس بارے میں اتنا لکھا ہے کہ یہ آسمان سے لے کر زمین تک اور نچلی زمین تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہے اور قیامت کے دن آگ سے یہی علاقہ تپے گا۔ اور اسی میں وہ سانپ اور بچھو اور وہ سارے عذابات ہوں گے۔ اور آسمانوں سے اوپر جنتیں رکھی جائیں گی۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان جو پانچ سو میل کی مسافت ہے یہ اعراف ہے۔ تو قیامت کے دن اوپر جنت' نیچے نار ہو گی اب تو جنت ساتویں آسمان میں ہے۔

اس لئے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ پر نبی کریم ﷺ تشریف لے گئے تو وہ ساتویں آسمان پر تھی جو مقام جبریلؑ ہے۔ تو سدرۃ المنتہیٰ کا ساتویں آسمان پر ہونا حدیث سے ثابت ہوا۔ اور قرآن کریم کہتا ہے۔

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰىؕ

"سدرہ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے"۔

تو اس آیت اور روایت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جنتوں کی ابتداء ساتویں آسمان سے ہے۔ اور اوپر نیچے جنتوں کے سو درجے ہیں۔ گویا جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور جہنم کا علاقہ ساتویں زمین کے نیچے تحت الثریٰ میں ہے۔ قیامت کے دن جہنم کو کھینچ کر اوپر لایا جائے گا۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ستر ہزار ملائکہ ایک ایک باگ کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور ستر ہزار ہی اس کی باگیں ہوں گی۔ اس کو کھینچ کر اوپر لائیں گے۔۔۔ اور جنت کو کچھ نیچے اتار اجائیگا۔۔۔ اور اگر نہیں اتارا جائے گا تو آسمان توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے۔ تا کہ جنت کے وہ پورے مقامات نظر پڑ سکیں جو اب تک حجابات میں ہیں۔ تو وہ بالاتر رہے گی۔ مگر نظر پڑے گی۔ اور جہنم اس زمین کے اوپر لائی جائے گی۔

اسی واسطے حدیث میں ہے کہ میدان محشر میں ہر انسان کے آگے دو چیزیں ہو نگی ایک جہنم کی ہولناک آوازیں جو آرہی ہوں گی اور ایک اپنے اپنے اعمال جو مجسم کر دیئے جائیں گے۔ قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ دو چیزیں ہر انسان کے سامنے ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہنم کو قریب لایا جائے گا۔ اور اس کی آوازیں ہیبت کے لئے سنوائی جائیں گی۔ غرض قیامت کے دن کچھ تغیر کیا جائے گا کہ جہنم کو اوپر لائیں گے اور جنت کو کچھ نیچے لائیں گے یا اوپر ہی رہے گی' مگر بیچ

میں سے آسمان توڑ دیئے جائیں گے تاکہ وہ حجابات ختم ہوں۔ ادھر جہنم نظر آئے۔ ادھر جنت نظر آئے۔ اور ہر ایک کو اپنا ٹھکانہ محسوس ہونے لگے کہ یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ تو اس وقت یہ زمین و آسمان حائل نہیں رہیں گے۔

فی الحال زمین و آسمان حائل ہیں۔ اس لئے کچھ نظر نہیں آرہا۔۔۔ اور اگر فی الحال ہی نظر آجاتا تو عقیدہ باندھنے اور ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔ عقیدہ تو اسی کو کہتے ہیں۔ کہ آدمی غیب کو سمجھے اور اسی پر ایمان لائے۔

## مقام ارواح

جنت اور دوزخ میں داخلے سے پہلے پہلے ارواح اپنے اپنے مقامات پر رہیں گی اور وہ علیین اور سجین ہیں اور اب یہ کہ شہداء کو جنت میں لے جائیں اور سبز پرندوں کے خول پہنائیں۔ یہ تو لے جانا ہوا۔۔ باقی داخلہ تو جنت میں قیامت کے دن ہوگا۔ اب تو قبر سے اس کو ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا۔ اور روح وریحان اور نعیم کی خوشبو اور تعطر وہاں سے آنے لگیں۔

## جنیہ سے نکاح کا حکم

حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ نے ایک کتاب "آکام المرجان فی احکام الجان" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں جنات کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ دنیا کے ہر مکان میں جنات بستے ہیں کوئی مکان خالی نہیں ہے فرق اتنا ہے کہ جو شری ہے اس کے شر کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جن ہے اور آسیب کا اثر ہے' جو بے چارے صالحین ہیں وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ مگر ہر جگہ موجود ہیں۔۔۔ اور ان میں زیادہ شری ہوتے ہیں۔ نیک بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں شر کا مادہ ہی غالب ہے جبکہ انسانوں میں شر کا غلبہ نہیں بلکہ مادے برابر رکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثریت شر والوں کی ہے۔ خیر والے اقلیت میں ہیں۔

فقہاء نے اس میں بحث کی ہے کہ جنیہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ غیر جنس ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری یا گائے سے نکاح کرلے۔ وہ منعقد نہیں ہوگا۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صورت انسانی میں ہوں تو جنسیت کے اقرب ہوگئے للذا نکاح جائز ہے۔

## حضرت حکیم الاسلام سے ایک جن کی ملاقات

ایک جن سے تو خود ہماری ملاقات قندھاریہ میں ہوئی وہاں کسی شخص کے اوپر جن کا اثر تھا اور اس کی نسبت مشہور یہ تھا کہ جب اس پر اثر ہوتا ہے تو باوجود یہ کہ بے پڑھا لکھا

تھا۔ اس کے باوجود قرآن شریف کے متعدد رکوع پڑھتا۔ مسائل اور علوم بہت بیان کرنے لگتا تھا۔۔۔ اور جب وہ اثر نہیں رہتا تھا تو جاہل مطلق ہوتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی کلام اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔

میرا وہاں جانا ہوا۔ صبح کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ جن ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جن کو میرے سے کیا کام ہے؟ میرے اوپر کوئی اثر ڈالے گا؟ خیر میں نے کہا اگر ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اسے بلالو۔۔۔ تو وہ شخص آیا۔۔۔ اس کی حرکات کچھ ایسی تھیں باہوش انسان کی نہیں ہوتیں۔ جیسے مدہوش سا ہو۔ اور پھر جب بیٹھا تو اس کی آنکھیں اتنی چڑھیں کہ پتلیاں بالکل غائب ہو گئیں۔ اتنی اوپر چڑھ گئیں کہ سفیدی سفیدی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اس کا سانس ٹھکانے پر نہیں تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن اب اس نے کچھ بولنا شروع کیا اور اس کی آواز میں بھی ایک قسم کا کچھ ڈراؤنا پن سا تھا۔۔ اس نے مجھے سلام کیا میں نے وعلیکم السلام کہہ کر جواب دیا۔۔۔ اس کے بعد اس نے معانقہ کرنا چاہا۔۔۔ میں نے کہا اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں جن سے کیا معانقہ کروں؟ لیکن طوعاً و کرہاً میں نے معانقہ بھی کیا۔ کوئی اثر وغیرہ تو ہوا نہیں اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ کیا کیا نام ہے؟ اس نے شاید عباس یا ایسا کچھ نام بتایا۔ میں نے کہا آپ رہتے کہاں ہیں۔؟

اس نے کہا بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے اس میں رہتے ہیں میں نے کہا، آپ اس شخص کو کیوں ستاتے ہیں؟

اس نے کہا نہیں۔ میں تو نہیں ستاتا۔ مجھے اس سے تعلق ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے جب میں نہیں آتا تو یہ خود مجھے ڈھونڈتا ہے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ ہمیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔۔۔؟ اس لئے کہ ہم نے آپ کو بہت نفع پہنچایا۔

اس نے کہا وہ کیا؟

میں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے شاگرد ہیں۔ دارالعلوم میں ہمارے بزرگوں کے سامنے بہت سے جنات نے پڑھا ہے۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کچھ ظاہر بھی ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ ہمارے استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔۔۔ شاگرد تو یوں کہ دارالعلوم میں پڑھا۔۔۔ اور استاذ یوں کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے "حدیث الجن" نقل کی ہے وہ قاضی جن سے سنی ہے۔۔۔ میں نے کہا آپ لوگ استاد بھی ہیں اور شاگرد کثرت سے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ دارالعلوم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔؟

وہ چپکا ہو گیا کہ میں تو کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے کہا۔ پھر آپ جن ہی کیوں بنے؟ پھر وہ

چپکا ہو کر بیٹھ گیا کچھ بولا نہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اس نے اجازت چاہی میں نے کہا جایئے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو تو بہت بولتا تھا بولا کیوں نہیں؟ کہنے لگا بس کچھ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب واللہ اعلم وہ واقعی جن ہی تھا یا کیا تھا۔ مگر بہر حال قرائن تو ایسے تھے کہ وہ انسانی حرکتیں نہیں تھیں اس لئے کہ جب اس کا اثر ختم ہوتا تھا وہ آدمی بالکل اچھا خاصا ہوش وحواس قائم۔ اور جہاں وہ اثر شروع ہوا کہیں قرآن پڑھتا ہے۔ حالانکہ حافظ نہیں ہے۔ اسی طرح مسائل بیان کرتا ہے۔

## اقسام محبت

علماء کرام محبت کی تین قسمیں لکھتے ہیں۔ ایک محبت طبعی ہے۔۔۔ ایک محبت عقلی ہے اور محبت عشقی ہے۔

محبت طبعی تو مادی محبت ہے جیسے باپ کو اولاد سے ہوتی ہے یا اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے یا عزیزوں رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔

اور ایک محبت عقلی ہے۔۔۔ اسی کا نام فی الحقیقت ایمان ہے حدیث میں ہے کہ

لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین.

”تم میں کوئی بھی مومن نہیں بن سکتا جب تک میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی محبت اپنے ماں باپ سے ہو نہ اولاد سے ہو“۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت عقلی ہوتی ہے۔ طبعی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ دلائل پر مبنی ہے۔ ایمان خود استدلالی چیز ہے اور ایمان کی حقیقت محبت ہے۔ تو وہ محبت عقلی ہے۔ اس محبت کی آدمی جب عملاً مشق کرے اور بڑھائے اور عشق کے درجے میں آجائے تو وہ محبت عشقی کہلاتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ.

تو اشد حب ہی وہی عشق ہے۔۔۔ محبت طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔ جیسے اولاد سے محبت ہے اس میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں۔ خواہ مخواہ آدمی محبت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن عقلی محبت وہ اختیاری ہے بایں معنی کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جب اس کے اسباب اختیار کرے گا وہ محبت پیدا ہو جائے گی اور اس محبت کو جب تمرین میں لائے گا اس کی مشق کرے گا اور اس کے متعلقہ اعمال انجام دے گا وہ محبت بڑھ کر عشق کے درجے میں پہنچ جائے گی جیسا کہ مجاہدہ اور ریاضت کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے۔۔۔ اصل ایمان وہ تو محبت عقلی ہے۔۔۔ جب مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں تو محبت حال کے درجے میں پہنچ جاتی ہے وہ عشق کہلاتی ہے۔ یہ جو آپ نے سوال کیا کہ قیامت میں

آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرے۔ یہ در حقیقت محبت عقلی کی طرف اشارہ ہے یعنی ایمان کی وجہ سے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ آدمی اس کے ساتھ ہوگا۔

مثلاً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ سے آپ کو محبت ہے یہ طبعی محبت نہیں بلکہ عقلی محبت ہے۔ ان کے علوم اور کمالات کو دیکھ کر ہے۔ چونکہ آپ کو کمالات سے محبت تھی تو صاحب کمال سے بھی محبت ہے۔ سارے انبیاء اور سارے اولیاء نیز اھل اللہ سے محبت۔ یہ محبت عقلی ہے۔۔۔ آخرت کا تعلق زیادہ تر اسی محبت سے ہے جو امر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری امور پر تکوینی آثار مرتب ہوں گے' وہ دوسرا درجہ ہے۔ اختیاری محبت پر تشریعی آثار مرتب ہوں گے۔ اسی کے بارے میں ہے۔ **المرء مع من احب** اور اسی کو فرمایا گیا۔

**من احب للہ وابغض للہ واعطی لِلّٰہِ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔**

"جس نے محبت کی تو اللہ کی خاطر' عدوات باندھی تو اللہ کے لئے کسی کو دیا تو اللہ کے لئے' کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے اس نے ایمان کو کامل کر دیا۔۔۔ حب فی اللہ اور بغض للہ کے کمال پر ایمان کا کمال بتلایا گیا۔ یہ وہی اختیاری محبت ہے جو اعمال سے بڑھتی ہے۔ ترک عمل سے گھٹ جاتی ہے"۔

## قیام میلاد اور عرس کی تحقیق

ایسا موقع تو میرے علم میں نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان مسائل میں ابتداء حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی رائے جواز کی تھی۔ قیام میلاد یا عرس۔ ان چیزوں میں توسع تھا۔ بعد میں جب تحقیق بدلی ہے پھر شدت پیدا ہوگئی۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ' جو گویا پوری اس جماعت دیوبند کے شیخ طائفہ ہیں۔ ان کے سلسلہ بیعت میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں خود ان چیزوں میں توسع ہے۔۔۔ لیکن جماعت دیوبند کا عمل فقہاء کے اقوال اور نصوص پر اور کتاب وسنت پر ہے۔

قیام میلاد کی جو اصل بنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو قیام ہے ایک حرکت وجدی ہے اور حرکت وجدی صرف اسی صورت میں معتبر ہے کہ کسی حال کے تابع ہو۔ اگر رسم یا نقالی کے تابع ہو اسے حرکت وجدی نہیں کہتے۔۔۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی پر نبی کریم ﷺ کی روحانیت متمثل ہو اور وہ تعظیما کھڑا ہو جائے پھر آگے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ جتنے بھی ارباب طریقت موجود ہوں انہیں بھی کھڑا ہو جانا چاہئے۔ ورنہ اس پر قبض طاری ہو جاتا ہے۔

اب حقیقت میں یہ شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی مسئلہ ہے اور طریق کا ایک معالجہ ہے اس کو جائز و ناجائز کے نیچے لانا یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک حرکت وجدی ہے۔۔۔ اب جو ناجائز کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے قیام کو کہتے ہیں جو کہ وجدی نہیں ہے اور کسی کے تابع نہیں۔ محض نقالی

ہے، رسوم کی اتباع ہے، کوئی صاحب حال نہیں ہے۔ تو جب رسم کی اتباع ہو گی تو رسم پیغمبر اولیٰ ہے۔ اگر کسی پر حال طاری ہو گا، اور وہ مغلوب الحال ہے تو وہ عند اللہ معذور ہے۔ نہ آپ اسے کچھ کہہ سکیں گے نہ ہم کہہ سکیں گے۔۔۔ لیکن جو اپنے ہوش وحواس میں ہے اسے نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور آپ کے لائے ہوئے قانون کی اتباع کرنی پڑے گی۔ بحالت صحت حواس اگر رسول کی اتباع کرنے لگے وہ نقالی سمجھی جائے گی۔

یعنی حضور ﷺ کی روحانیت کا تمثل ہو اور مثالی صورت سامنے آئے۔ خواب میں بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اور آپؐ نے فرمایا۔

**من رانی فقد رانی**

"جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا"۔

اس طرح سے منام جو ہے وہ ایک ابتدائی درجے کا کشف ہے جو ہر انسان کو میسر آسکتا ہے۔۔۔ لیکن مجاہدہ اور ریاضت کرنے والوں کا کشف، اس کا اور درجہ ہے۔ اس میں حضور ﷺ کی روحانیت کسی مغلوب الحال کے سامنے آئے اور متمثل ہو اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ اس پر نہ آپ دارو گیر کریں گے نہ ہم کریں گے کیونکہ وہ اپنے حال میں نہیں، اپنے آپ میں نہیں ہے۔

## ملت اسلامیہ کا ناسور

جامعہ ازہر میں شیعوں کے بارے میں مسئلہ تو چل رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ جو شیعہ سنی کے درمیان منافرت سی ہے اس کو ختم کیا جائے۔ اور جامعہ ازہر میں شیعوں کو بھی داخلے کا حق دیا جائے۔ یہ مسئلہ وہاں چل رہا ہے۔

وہاں کے شیوخ میں شیخ عبدالواحد واصلی ہیں۔۔۔ ایک دعوت میں ہمارا ساتھ ہوا تو اس مسئلہ پر کچھ گفتگو آئی۔ اس پر انہوں نے یہی کہا کہ ایک شیعہ تو وہ ہیں جو بالکل اصول اسلامیہ سے منحرف اور بالکل مختلف ہیں۔ یا بعض حلول خداوندی کے قائل ہیں۔ ان سے تو بحث نہیں۔ وہ اسلام سے خارج ہیں۔۔۔۔ لیکن جو لوگ محض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں ان سے اگر منافرت باقی نہ رہے تو کیا حرج ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت الگ ہے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر فقط اتنا ہی مسئلہ ہو، اہم تو یہ بھی ہے، اس واسطے کہ اب فضیلت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اور ان کی خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اجماع کا خرق اور اس کا توڑ ڈالنا یہ بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو برداشت کیا جائے کہ ایک چیز پر اجماع ہو چکا ہے مگر اس کی جو جانب مخالف ہے وہ کوئی حرام یا ممنوع نہیں ہے۔ اگر فقط ایک مسئلہ ہو تو کچھ صبر کر لیا جائے۔

لیکن ان کے ہاں سارے فرقوں کا قدر مشترک وہ "مسئلہ امامت" ہے اور وہ امامت کے

نبوت سے افضل جانتے ہیں۔ اور امام کو معصوم سمجھتے ہیں کہ امام کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ تو یہ مسئلہ سامنے آئے گا۔ کیا آپ اس کو برداشت کریں گے۔؟

ظاہر بات ہے کہ جب بنیاد کے اندر ہی اختلاف ہو گیا کہ ہم تمام مسلمان اس کے قائل ہیں کہ نبوت سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں۔ امامت توابع نبوت میں سے ہے۔ جب نبوت ختم ہو گئی تو وعدہ دیا گیا۔ الائمۃ من قریش۔

یا یہ کہ بارہ امام گزریں گے۔ یا آئمہ مجتہدین کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں آئیں۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد نبوت کی خلافت باقی رہے گی۔ وہ خلافت خواہ امامت کی صورت میں ظاہر ہو۔ خوہ علم کی صورت میں۔ خواہ کسی بھی کمال کی صورت میں ہو۔ بہر حال وہ فروعات نبوت میں سے ہے۔

یہ امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے اس کے اندر اگر ایک فرقہ آکر یہ دعویٰ کرے کہ نبوت افضل نہیں بلکہ امامت افضل ہے۔ تو پہلے تو اجماع کا خرق ہوا۔۔۔ پھر یہ کہ ان کے نزدیک امام کے لئے عصمت لازم ہے جیسا کہ نبیؑ کے لئے عصمت لازم ہے۔ تو نبوت کے محاذ اور متوازی ایک دوسرا مقام لا کے کھڑا کر دیا۔ تو ہم اس کو شرک فی النبوت سے تعبیر کریں گے۔ جیسا کہ شرک فی الالوھیت ممنوع ہے اسی طرح شرک فی النبوت بھی ممنوع ہے۔ اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں۔ اس لئے کہ انبیاء سابقین میں چونکہ نبوت ختم نہیں ہوئی تھی تو انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ جاری تھی۔۔۔ اس میں اگر کوئی دعویٰ نبوت یا دعویٰ عصمت کرے تو کچھ مناسب بھی تھا۔

ختم نبوت کے بعد جو بھی عصمت کا دعویٰ ہو گا یا نبوت سے افضلیت کا دعویٰ ہو گا۔ تو وہ ختم نبوت کے ٹھیک منافی پڑے گا۔۔۔ ایک ادھر دعویٰ خرق اجماع اور ادھر ایک اسلام کا جو اجماعی مسئلہ ختم نبوت کا ہے اس کے بھی یہ منافی ہے کیا آپ اسے برداشت کریں گے۔؟

## تاریخی تخریبی فرقہ

پھر میں نے عرض کیا کہ دوسری بات یہ ہے کہ ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیجئے یہ دیکھئے کہ ہر فرقے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس فرقے کا مزاج تخریبی ہے۔ اور تاریخ اس پر شہادت دے گی کہ مسلمانوں کو جتنے بھی صدمات اٹھانے پڑے ہیں 'سیاست کو' یا خلافت کو۔ جہاں جہاں تباہی ہوئی نیچے سے یہی فرقہ نکلتا ہے تو تاریخ کی روشنی میں یہ ایک تخریبی فرقہ ہے۔۔۔ جب اس کا مزاج یہ ہے تو ہو سکتا ہے کہ آج وہ آپ کی چاپلوسی کر کے آپ میں شامل ہو جائے۔ لیکن کل کو نوک پنجے نکال کر آپ کو ہی پنج دے۔ آپ کے اوپر غالب آجائے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے پھر آپ کیا کریں گے؟

## ذوق دین کی کمی

آپ نے محض ایک عقیدہ سامنے رکھ لیا یعنی تفضیل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' یہ کوئی زیادہ اہم نہیں۔ اگر صرف اس مسئلہ تک بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر مسائل دوسرے بھی ہیں۔ پھر فرقوں اور طبقات کا مزاج ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لینا تو ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔۔۔ اخیر میں انہوں نے یہ کہا میں تو انہیں چیزوں کا قائل ہوں' میں تو نمائندگی کر رہا تھا کہ یہ خیالات ہیں۔۔۔۔ میں نے کہا الحمدللہ کچھ طبیعتیں ادھر چل رہی ہیں۔ اور جب اس ذوق میں کمی آتی ہے جو خالص دین کا ذوق ہے تو افکار میں اس قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے۔

## بشاشت ایمان (ایمانی کیفیت)

دراصل اس کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے کہ اس پر ہم پرکھیں۔۔۔ بلکہ صحیح بخاری کی جو روایت ہے اس میں ایک لفظ یہ ہے۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے ہیں تو ان میں ایک یہ بھی تھا۔

**هل يرتد احد سخطةً لدينه.**

"کیا ان نبیؑ کے اوپر ایمان لا کر ان کے دین کو برا سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہو جاتا ہے ؟"۔

انہوں نے کہا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مرتد ہو گیا ہو۔

ہرقل یہ کہتا ہے کہ ۔

**ذلك اذا خالص بشاشة القلوب.**

یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب ایمان کی بشاشت قلب کے اندر رچ جائے۔ پھر ارتداد کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔۔۔ تو حدیث میں اس کو انشراح تام اور بشاشت ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔۔۔ یہ مختلف الفاظ جو احادیث میں آتے ہیں۔ کہیں "حلاوۃ ایمان" فرمایا گیا۔ جیسے حدیث میں ہے۔

**من سره ان يجد حلاوة الايمان فليلبس الصوف تذللاً لربه عزوجل.**

جس کو یہ پسند ہو کہ میں ایمان کو مٹھاس چکھوں اسے چاہئے اللہ کے سامنے ذلت نفس اختیار کرنے کے لئے اون کا کپڑا پہنے یعنی دکھلاوے کے لئے نہ ہو۔ تو اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس آجائے گا۔

اب یہ ایک کیفیت ہے کیفیت کو ہم الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کہیں اس کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ.

"جب اللہ سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور شرح صدر نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو ایک خاص نور عطاء کر دیا جاتا ہے"۔

یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ اب قلب کے اندر ظلمت نہیں آسکتی۔ جب شرح صدر ہو گیا۔ تو کہیں حلاوۃ ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں شرح صدر سے، اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ دین کے لئے سینہ کھل جائے اور اس پر طمانیت میسر آجائے اور رضائے کامل حاصل ہو جائے۔ پھر اندیشہ نہیں رہتا۔

**کیفیت مقام**

لیکن یہ کہ اس کا قاعدہ کیا ہے۔ یہ قواعد سے متعلق چیز نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے گا تو یہ ایک قلبی کیفیت ہے وہ خود محسوس کرے گا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لفظوں میں کیفیات ادا نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو ایمانی اور روحانی کیفیات ہیں۔ مادی کیفیات کو آدمی الفاظ سے نہیں سمجھ سکتا کتنی بلیغ تعبیر کیوں نہ ہو۔؟

میں آپ سے کہوں آپ ذرا مجھے سیب کا مزہ سمجھا دیجئے۔ تو آپ کتنی ہی فصیح و بلیغ تقریر کریں، آپ نہیں سمجھا سکتے۔ اس لئے کہ کیفیت الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ آپ یوں کہیں گے کہ صاحب! دو پیسے خرچ کرو، کھا کے دیکھ لو، مزہ معلوم ہو جائے گا۔ یہ مادی کیفیت ہے۔۔۔ یا مثلاً نفسانی کیفیت ہے۔ جیسے انسان کی عمر کے تین درجے ہیں۔ طفولیت، شباب اور کہولت ہے۔۔۔ بچہ اگر آپ سے یہ پوچھے کہ جوانی کی کیا کیفیات ہیں، مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ اس پر قادر ہیں کہ سمجھا دیں؟ کبھی نہیں سمجھا سکیں گے۔ یہ کہیں گے کہ بیٹا! ایک آٹھ دس برس کا انتظار کرو جب جوان ہو جاؤ گے خود محسوس ہو جائے گا کیا کیفیت ہے۔۔۔ یا ایک جوان آدمی یوں کہے کہ مجھے بڑھاپے کے کیفیت سمجھا دو۔ ممکن نہیں کہ آپ سمجھا دیں۔ جب تک وہ کیفیت اس پر گزرے نہیں۔ اور وہ خود صاحب مقام نہیں بن جاتا۔ یا بوڑھا آدمی یوں کہے کہ مجھے محتضر کی کیفیت سمجھا دو کہ نزع کی حالت کیسی ہوتی ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ بھائی! جب یہ کیفیت آئے گی تو خود سمجھ لو گے یہ لفظوں میں میں ادا نہیں کر سکتے۔ جب مادی کیفیت کو لفظوں میں نہیں لا سکتے، نفسانی کیفیت کو نہیں لا سکتے، تو روحانی کیفیات جو مقامات قلب سے تعلق رکھتی ہیں وہ اتنی لطیف ہیں کہ ناممکن ہے کہ وہ لفظوں میں آسکتی ہوں اور جتنی آسکتی ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اس کی علامتیں بتلا دی گئی ہیں کہ جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ گے تو سمجھ لو کہ صاحب مقام ہو گئے۔

**کیفیت برزخ**

کسی بزرگ کا واقعہ ہے انہوں نے کہا ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتلایا کہ مجھ پر گزرا کیا۔ انہوں نے کہا میرا جب انتقال ہو تو تم میری قبر میں کاغذ اور قلم دوات رکھ دینا۔ میں تمہیں ساری کیفیات لکھ کر دوں گا۔ بس تم تیسرے دن آکر اس کاغذ کا اٹھا لینا۔

اور کہا میں نے تیسرے دن کی قید اس لئے لگائی ہے کہ تین دن میں مجھے اپنا اندازہ ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔ میں مقبول ہوں یا نامقبول ہوں۔ جب اپنی طرف سے اطمینان ہو تب میں دوسرے کو اطلاع دوں گا کہ یہ کیفیت میرے اوپر گزری۔

چنانچہ ان کے انتقال کے بعد تیسرے دن لوگ پہنچے تو وہ جو کاغذ اندر رکھا تھا' واقعی اوپر موجود تھا۔ اور اس کے کے اوپر لکھا ہوا بھی ہے۔۔۔ اور لکھا ہوا کچھ ایسے حروف میں ہے کہ وہ روشنائی بھی نہیں ہے۔ بس کچھ حروف سمجھ آتے ہیں۔

غرض لوگ شوق سے دوڑے کہ شیخ نے برزخ کے احوال سے مطلع کیا ہوگا۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک سطر میں سارا حال لکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ۔

"یہاں کی حالت دیدنی ہے' شنیدنی نہیں ہے"۔

دیکھنے اور گزرنے سے تعلق رکھتی ہے سننے سے متعلق نہیں ہے۔ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور جتنی بیان میں آسکتی ہے وہ انبیاءؑ سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ تو حدیث میں عالم برزخ میں جتنے واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں اس سے زیادہ کوئی بیان کر سکتا۔۔۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی قوت بیانیہ ہے کہ ان کی کیفیات کو پھر بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان سے زیادہ کسی کو قدرت نہیں ہے تو یہ جواب دیا کہ یہاں کہ حالت دیدنی ہے' شنیدنی نہیں۔۔ سننے کے لائق نہیں۔ بس دیکھنے کے لائق ہے۔۔۔ غرض ہر کیفیاتی مقام کا یہی حال ہے کہ آپ اس کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ خواہ نفسانی مقام ہو' خواہ مادی کیفیت ہو۔ صاحب کیفیت اور صاحب مقام بن جائیں۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

## تعبیر کیفیت ناممکن ہے

اور بظاہر اس کی بناء یہ ہے کہ جس قدر بھی کیفیات ہیں وہ امور کلیہ نہیں۔ وہ شخصی چیزیں ہیں اگر امور کلیہ ہو توان کو تو آپ تقریر و بیان سے بیان کر سکتے ہیں' جن کا تعلق سارے انسانوں سے ہے۔۔ وہ امور شخصیہ ہیں کسی کی کوئی کیفیت' کسی کی کوئی کیفیت ہے۔ کوئی کسی حال میں ہے۔ کوئی کسی مقام پر ہے۔ اور ایک کا مقام دوسرے کے لئے حجت نہیں۔ اپنے آپ کو آدمی خود ہی سمجھتا ہے اور خود ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اگر کلیاتی چیزیں ہوں تب تو ان کی تعبیر ہو لیکن جب وہ امور جزئیہ ہیں اور ان کا تعلق بھی کیفیات سے ہے تو ان کے لئے تعبیر رکھی نہیں گئی اور جتنی ہو سکتی ہے بس وہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے بیان فرما دی ہے۔ آگے نہ کسی کی جرات ہے نہ قوت ہے۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
بس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کبھی پختہ کار کی کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ جواب یہی ہو گا کہ تم پہلے پختہ کار بن جاؤ پھر خود سمجھ لو گے ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

کسی نے سوال کیا تھا کہ عاشقی کسے کہتے ہیں؟ عاشقی کیا ہوتی ہے ؟ ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ ما شوی بدانی

مجھ جیسے عاشق بن جاؤ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عاشقی کیا ہے۔ لفظوں میں کیسے بتلا سکتا ہوں ۔

### انسان کی قوت بیانیہ کا عجز

اچھا یہ تو کیفیات ہیں جو باطنی چیزیں ہیں۔۔۔ انسان کے چہرے مہرے کی ایک آن اور شان ہوتی ہے۔ وہ لفظوں میں نہیں آسکتی۔۔۔ یعنی آپ چہرے کی تصویر کھینچ دیں گے لیکن چہرے کی جو آن بان ہے اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ وہ تو جب سامنے ہو گا۔ اس کی ادائیں سامنے آئیں گی۔ آپ سمجھیں گے یہ محبوب ہے۔ لیکن لفظوں میں یہ آئیں، یہ ناممکن نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ۔

گر مصور صورت آن دلستاں خواھد کشید

آدمی صورت کھینچ سکتا ہے ۔

گر مصور صورت آن دلستاں خواھد کشید
لیک حیرانم کہ نازش اوچساں خواھد کشید

صورت آدمی کھینچ سکتا ہے لیکن اس کے ناز و ادا کو کیسے کھینچے گا' الفاظ میں کیسے لے آئے گا۔۔۔ کاغذ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق احساسات اور ادراکات سے ہے اور وہ ادراک باطنی ہے۔ بہت سی ادائیں جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں بیان نہیں کی جاسکتیں۔۔۔ اور کیفیات روحانی و نفسانی یہ تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتیں۔ ان کو آدمی کیسے بیان کرے گا۔ ؟ یہ تو آنکھوں دیکھی چیز ہے جب اسے بیان نہیں کر سکتا۔ غرض انسان کو بیان کی قوت نہایت محدود دی گئی ہے ہاں جو چیز جسمانی ہو۔ لفظوں میں بھی آسکتی ہو' آواز کی گرفت میں بھی آسکتی ہو' اسے ہم بیان کر سکیں گے جو نہ آواز کی گرفت میں آئے' نہ لفظوں کی گرفت میں آئے' اسے کیسے بیان کریں۔۔۔ ؟ سوائے اس کے کہ سکوت کر کے صاحب مقام پر محول کر دیں کہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

### عدم احصاء ثناء باری کی وجہ

اب نبی اکرم ﷺ نے حق تعالیٰ شانہ' کی مدح و ثناء اتنی انتہاء کو پہنچائی کہ عالم میں اتنی مدح و ثناء کرنے والا کوئی نہیں۔

جتنی حمد وثناء حق تعالیٰ شانہ ٗ کی آپ ﷺ نے کی ہے اور تعریف و توصیف آپ ﷺ نے بیان کی ہے کسی نے نہیں کی ۔۔۔۔ لیکن اخیر میں فرماتے ہیں۔

اللهم لااحصى ثناءً عليك انت كما اثنيت على نفسك.

"اے اللہ! میں تیری ثناء وصفت کا احاطہ کر ہی نہیں کر سکتا۔ بس مختصر یہ کہ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے کو فرمایا ہے"۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ثناء وصفت مقامات کمال کی ہوتی ہے۔ اور کمالات الوہیت انبیاء علیہم السلام جتنے دیکھ سکتے ہیں۔ اتنی ثناء کر سکتے ہیں۔ باقی کمالات الوہیت لفظوں کی گرفت میں تھوڑا ہی آسکتے ہیں۔ جب بندوں کے مقامات بندوں کے قبضے میں نہیں آتے تو الوہیت کے مقامات کس طرح سے بندوں کے قبضے میں آجائیں گے' تو سوائے اس کے کہ سپر ڈال دی جائے اور عجز کا اقرار کیا جائے' کچھ نہیں ہو سکتا۔

نہ ہر جا مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر یا ید انداختن

ہر جگہ گھوڑا نہیں دوڑایا جا سکتا۔ بہت سی جگہ آتی ہیں کہ لگام روک لینا پڑتا ہے اور آدمی سپر ڈال دیتا ہے کہ اس خاردار جنگل میں میں نہیں گھس سکتا' گھوڑا وہیں دوڑے گا کہ زمین سیدھی ہو' گھاس بچھی ہوئی ہو۔ اور جہاں اونچ نیچ ہو' پہاڑ ہوں' گھاٹیاں ہوں اور نشیب و فراز ہوں وہاں گھوڑا بیچارہ کیا دوڑے گا' وہاں تو خیال بھی نہیں دوڑ سکتا چہ جائیکہ گھوڑا دوڑے۔

میری ایک لمبی چوڑی نظم تھی وہ تو یاد نہیں ہے۔ اس میں ایک شعر یاد ہے وہ حق تعالیٰ کی ثناء وصفت کے بارے میں ہے۔

خدا کی ثنا کامل یہی ہے
کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں

جو یوں کہہ دے کہ میں آپ کی تعریف کر ہی نہیں کر سکتا۔ اس نے تعریف کی۔ جو تعریف کرنے کا مدعی بن کے بیٹھے' ممکن نہیں کہ کر سکے۔ ترک دعویٰ کر دینا ہی تعریف ہے۔

## تسلیم عجز ادائیگی شکر ہے

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہ ٗ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا.

"اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو"۔

اور داؤد علیہ السلام کا وصف اور خلق شکر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت داؤد

علیہ السلام پر شکر کا غلبہ ہے۔ تو امر کیا گیا کہ شکر ادا کرو۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے امر اور حکم کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا وہی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور کیا مقصد ہے۔

تو عرض کیا کہ اے اللہ! یہ تو میرا فرض ہے کہ میں شکر ادا کروں اور جب حکم ہے تب تو میں شکر ادا کروں گا ہی۔۔۔ مگر حیران یوں ہوں کہ کس طرح شکر ادا کروں' اس لئے کہ نعمتوں کے اوپر جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا' جب آپ توفیق دیں گے جبھی تو ادا کروں گا۔ اور توفیق دینا یہ خود ایک نعمت ہوگی' تو اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا تو اس کے توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ یہ ایک اور نعمت بن گئی۔ تو پہلے اس نعمت کا شکر ادا کروں گا بعد میں اس کا۔ اور جب اس کا ادا کرنے بیٹھوں گا اس کی توفیق بھی آپ دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت ہوگئی تو پہلے اس کا۔۔۔ اس طرح ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو شکر کی ابتداء ہی نہیں کر سکتا تو کس طرح سے شکر ادا کروں' بس میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔ میرے قبضہ قدرت میں آپ کا شکر ادا کرنا ہے ہی نہیں

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا۔

"اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ادائے شکر سے عاجز ہو' تو یہ اقرار کر لینا ہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو شکر کا ادا کرنا یہی ہے کہ عجز تسلیم کرلے"۔

اس لئے کہ کوئی بھی بندہ کمالات الٰہیہ کا حق ادا نہیں کر سکتا' یہی کہے گا کہ اے اللہ! عاجز ہوں۔ تو عجز مان لینا یہی ادائے حق ہے۔ ورنہ اگر واقعی شکر کی ادائیگی لازم ہو تو حقوق تو لامتناہی ہیں اور بندہ متناہی اور محدود ہے یہ کیسے کرے گا؟ لامتناہی کا حق متناہی نہیں ادا کر سکتا۔۔۔ تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ لامحدود شکر کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنا عجز مان لے کہ ہم عاجز ہیں۔۔۔ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے شکر ادا کر دیا۔ یہی ثناء وصفت کا حال ہے۔

**لااحصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك**

حضور اقدس ﷺ سے زیادہ حمد وثناء کرنے والا عالم میں کوئی نہیں اور آپؐ سے زیادہ عارف باللہ کوئی نہیں کہ آپؐ معرفت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اخیر میں آکر آپؐ بھی یہ فرماتے ہیں کہ۔

**لااحصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك**

## یاجوج ماجوج میزان تحقیق پر

یہ امر حق ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا' یاجوج ماجوج ایک قوم ہے جو قرب قیامت میں نکلے گی۔ اور ان کے اوصاف بیان کئے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائیں گے اور دریاؤں کا پانی پینے پر آئیں گے تو دریاؤں کو خشک کر دیں گے لوگوں کے اموال پر اس درجے غاصب بنیں گے ساری اشیاء ان کے قبضے میں آجائیں گے' اس طرح کی علامتیں یاجوج موجوج کی بیان فرمائی گئی ہیں۔

لیکن زیادہ تفصیل نہیں فرمائی گئی کہ کون ہوں گے۔۔۔؟اتنا کہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوں گے کوئی جنات میں سے نہیں ہیں۔

صحیح روایات اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو آیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک قوم ہے جو قوی ہوگی پورے عالم پر چھا جائیگی۔ پورے عالم کے خزائن اور دفائن پر قبضہ کرلے گی۔ اور انسانوں کو عام طور سے قابو میں لے لے گی۔ چاہے ختم کردے چاہے باقی رکھے۔ پورے عالم میں اس کا اقتدار پھیل جائے گا اور ساری زمین کے خزائین اور دفائن ان کے قبضے میں آجائیں گے۔ جسے چاہیں دیں۔ جسے چاہیں نہ دیں تو روایات میں اس قسم کے احوال اور ان کی صفات آتی ہیں۔ اب آگے یہ کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلی روایات ہیں مستند روایات نہیں ہیں۔

### اقوام یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جاسکتا ہے۔؟

اب اس میں علماء کی بحثیں ہیں۔۔۔ بعض محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ یورپ کی اقوام کو "یاجوج ماجوج" قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جتنی علامتیں فرمائی گئی ہیں یہ سب ان کے اوپر منطبق ہوتی ہیں۔ پورے عالم اسلام پر ان کا تسلط بھی ہے پورے عالم کے خزائن اور دفائن بھی ان کے ہاتھ میں آگئے۔ دنیا کی ہر قوم گویا ان کے قابو میں ہے جسے چاہیں نیچا رکھا کے ختم کردیں۔ چاہیں آگے بڑھادیں۔ تو پورے عالم پر اس طرح سے ان کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔

### سد سکندری

اب آگے جو چیزیں آتی ہیں کہ وہ سد سکندری کے پیچھے ہیں ان کو وہ چاٹتے ہوں گے اور چاٹ چاٹ کر خستہ کردیتے ہیں اور قرب قیامت میں وہ انشاء اللہ کہہ کے بڑھیں گے تو وہ ختم ہو جائیگی اور وہ باہر نکل پڑیں گے۔ اس میں پھر تاویلیں کی گئی ہیں۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ، انکے اوپر ایک روک ڈالی گئی ہے۔ وہ قرب قیامت میں اٹھادی جائے گی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دیوار مادی ہو۔ اور پہاڑوں کے اندر بنائی گئی ہو۔ بہر حال بعض حقیقت کے قائل ہیں کہ واقعی دیوار ہے اور قوم اس کے پیچھے ہے اور وہ اسے چاٹتی ہے۔ چاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے توڑنے پھوڑنے کی فکر میں ہے۔ مگر قابو نہیں ملتا۔ جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تو من جانب اللہ قدرت دیدی جائے گی۔ توڑ کر نکل پڑیں گے۔

اور جو اس کے قائل ہیں کہ یہ موجود یورپ کی اقوام ہیں۔ یہی "یاجوج یاماجوج" ہیں۔ وہ اس کی مجازات پر محمول کرتے ہیں۔ حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔

### آیت قدرت

لیکن قرآن کریم اور احادیث کے الفاظ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک

حقیقت بن سکے' مجاز لینا یہ اصول کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں ہے کہ کوئی قوم ہو اور وہ پہاڑوں کے آگے پیچھے بند ہو اور واقعے میں سد سکندری ہو جس تک ابھی ہماری نگاہیں نہیں پہنچیں۔ اور وہ اس کو توڑنے پھوڑنے میں لگے ہوئے ہوں اور اخیر زمانہ ایسا آئے کہ وہ نکل پڑیں' اس لئے کہ قران وحدیث سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی قوم ہے۔ عام طور پر جیسے انسان ہوتے ہیں اس انداز کے نہیں ہیں۔ چاہے وہ بشر ہی ہوں مگر غیر معمولی ہیں۔۔۔ اور ان کے اسباب ووسائل بھی کچھ غیر معمولی ہوں گے۔۔۔۔ اس کا ایک ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ ان اقوام کو نہ مانا جائے بلکہ وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو محبوس رکھا ہے وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ جیسے دجال کا ظاہر ہونا اس کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ قرب قیامت میں آگ کا ظاہر ہونا قدرت کی نشانی ہے۔ اسی طرح سے اس قوم کا ظاہر ہونا یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ مگر غیر معمولی چیز ہے۔۔۔ لیکن صحیح کیفیت کی تفاصیل زیادہ موجود نہیں ہیں بس قیامت کی علامات میں سے ہے جہاں اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں ظاہر ہوں گی ان میں ایک یہ بھی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَنْسِلُوْنَ.

ادھر سے ادھر ہر گھاٹی میں سے نکلتے ہوئے نظر آرہے ہوں گے۔ یورپ والوں کی یہ صورت نہیں ہے ان کا تو ایک مستقل ملک ہے وہ آتے ہیں' جاتے ہیں مگر تجارت کی لائین سے دنیا پر قبضہ کررکھا ہے۔

لیکن یہ کہ وہ ایک غیر معمولی انداز سے اس طرح خروج کریں کہ عالم میں ہر گھاٹی سے نکل کر ایک نئی قوم آرہی ہو یہ صورت نہیں ہے۔ بہر حال الفاظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدرت کی غیر معمولی نشانی ہے جو قرب قیامت میں ظاہر ہوگی۔

اب اس غیر معمولی کو غیر معمولی سمجھ کر ایسے اوصاف بیان کرنا کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے یا ان کے کان لمبے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔

### حضرت کشمیری کی رائے

ہمارے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کی رائے بھی کچھ اس طرف مائل تھی کہ شاید یہ قومیں مراد ہوں۔ قطعی طور پر تو نہیں فرماتے تھے مگر خیال ظاہر فرماتے تھے کہ شاید یہی مراد ہوں۔ کیونکہ بہت سی علامتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

### اقوام یورپ کے مورث اعلیٰ کا نام

اور کل ہی یہ ذکر ہورہا تھا کہ انگلینڈ میں جو اسمبلی ہال ہے جو بہت پرانا اور قدیمی ہے اس کے

دروازے پر پتھر سے کندہ ہے۔یا گوگ ماگوگ۔اس کو اگر معرب کیا جائے تو یاجوج ماجوج بنتا ہے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ۔۔۔ہاشمی صاحب بیان کررہے تھے کہ روس والے کہتے ہیں کہ ہمارا مورث اعلیٰ، جس کی ہم اولاد ہیں اس کا نام ”ماگوگ“ تھا۔۔۔اس قسم کی علامتیں دیکھ کر بعض علماء کا رجحان اس طرف ہو گیا کہ شاید یہی یاجوج ماجوج ہوں۔

## ظہور خاتم الدجالین کے آثار

آفتاب کے نمایاں ہونے سے پہلے اس کے آثار نمایاں شروع ہونے لگتے ہیں۔ پھر پو پھٹی ہے۔۔۔ اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع سے پہلے قلوب کے اندر آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تو جس طرح خاتم الانبیاء علیہ کے آثار نمایاں ہوئے تاکہ صلاحیت اور استعداد ان کے دین کے قبول کرنے کی پیدا ہو۔۔۔یہی صورت بعینہ دجال کی ہے کہ اس کے ظہور سے پہلے قلوب میں دجل وفساد، ڈپلومیسی، مکاری وعیاری اور دغابازی اس کے آثار اور صلاحیتیں پیدا ہونی شروع ہوں گی۔۔۔اس درجہ کو ہر انسان اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کرے گا کہ قلب کے اندر کچھ ظلمت اور کدورت اور کچھ فریب ہے اور دنیا کے تمدن کی بنیاد بھی فریب اور دکھلاوے پر نمایاں ہونا شروع ہو گی۔ تو اس قسم کی چیزیں نمایاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب وہ ظہور کرے گا اس وقت ہزاروں قلوب اس کو ماننے کے لئے مستعد ہو گئے۔ سوائے اس کے جن کے قلوب کے اندر ایمانوں کی صلاحیت بہت اقویٰ ہے۔وہ جھکیں گے لیکن عام طور سے اثر پیدا ہو گا۔۔۔ تو جس طرح سے خاتم الانبیاء علیہ کے ظہور سے قبل صلاح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو ضروری ہے کہ خاتم الدجالین سے پہلے قبول دجل و فساد اور مکروفریب کو قبول کریں' گویا دنیا سے اخلاص مضمحل ہونے لگے اور مکروفریب دنیا پر غالب آنے لگے یہاں تک کہ وہ ظاہر ہو جائے۔

## خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے دجال کا تقابل

چونکہ خاتم الانبیار کمالات سے بھرپور ہیں اور ختم کرنے والے یعنی سارے کمالات کے منتہیٰ ہیں۔۔۔ تو دجال سارے فسادات کا منتہیٰ ہو گا۔اور اس درجہ کو کہ جیسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ آپؐ کے بائیں مونڈھے کے قریب مہر نبوت تھی' جس پر یہ لکھا ہوا تھا جیسے کہ بعض روایات میں ہے۔

سر حیث شئت فانك منصور.

”تم جہاں بھی جاؤ' نصرت خداوندی تمہارے ساتھ ہو گی“۔

بعض روایات میں ہے کہ لفظ خاتم الانبیاء یا محمد کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے اس

کی ہیئت احادیث میں آتی ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس درجہ آپ کمالات نبوت سے بھرپور ہیں کہ وہ چھلک کے اوپر آ گئے اور نمایاں ہو گئے' اسی طرح سے خاتم الدجالین دجل وفریب میں اتنا بھرپور ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا ک۔ف۔ر۔ یعنی کفر مجسم۔ تو علامت اوپر آ جائے گی غرض نبی کریم ﷺ سے ٹھیک تقابل ہے۔

## تقابل اضداد کی حکمت

اس امت میں جس درجہ کمالات ظاہر ہوئے اسی درجہ فسادات کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔۔۔ اول تو کمال سے فساد کا تقابل ہوتا ہے۔ ہر کامل کی خوبی تب کھلتی ہے جب اس کے مقابلے میں نقص آتا ہے۔ ایمان کی قوت تب کھلتی ہے۔ جب اس کے مقابلے میں کفر آ جائے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھوزاھق

ہم باطل کو ٹکرا دیتے ہیں حق سے اور جب وہ حق سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہوتا ہے تو حق کی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔۔۔ اگر باطل نہ رکھا جائے تو حق کی قوت نمایاں نہ ہو۔ تو اضداد رکھی گئیں۔

اس لئے انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں دجال رکھے گئے جس درجے کا نبی اس درجے کا دجال۔۔۔ بہرحال میری غرض یہ تھی کہ جیسے شیاطین کا مقابلہ ملائکہ سے ہے دجالوں کا مقابلہ انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ انبیاء کے متبعین میں جو مقابل لوگ ہیں انہیں آئمہ ہدایت کہتے ہیں۔ ادھر کفر کے سلسلہ میں آئمۃ الکفر ہیں۔ تو آئمہ ہدایت کا آئمہ ضلالت سے مقابلہ ہے۔ اسی طرح اتقیاء کا مقابلہ فجار سے ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک تقابل چل رہا ہے۔۔۔ بہرحال انبیاءؑ سے دجالین کا مقابلہ ہے۔ اسی لئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خاتم الدجالین کا مقابلہ ہے۔

**استدراج دجال** ظاہر بات ہے کہ جس پر دجل کے سارے مراتب ہوں گے معمولی قسم کی روحانیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔۔۔ بڑے بڑے اولیاء کاملین بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں گے۔۔۔ اسی لئے حدیث میں حکم فرمایا گیا کہ دجال ظاہر ہو تو سیر وتماشے کے طور پر بھی اسے دیکھنے کے لئے مت نکلو۔ وہ ایمانوں کو اس طرح سلب کرے گا جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے۔ تو تماشا دیکھنے کے لئے بھی مت جاؤ۔ بلکہ مقفل اور محبوس ہو جاؤ۔ اس کے سامنے مت جاؤ گویا یہ اس کی علامت ہے کہ کوئی کتنا بڑا صالح ہو گا' روحانیت والا ہو گا لیکن اس کا دجل اور فریب اور جو اس کے ہاتھ پر کرشمے استدراج کے طور پر ظاہر ہوں گے وہ اتنے بڑے ہوں گے کہ ولایت کام نہیں دے گی کوئی کتنا ہی بڑا ولی کامل ہو کر اس کا مقابلہ کرے۔۔۔ جب تک نبوت کی قوت مقابلہ پر نہ آئے۔ کیونکہ اصل دجال کا مقابلہ ہی نبوت سے ہے۔

### قتل دجال کی صورت

اب ایک صورت یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ سے مقابلہ ہے تو آپ کو شکست دینی چاہیئے۔ تب تو وہ قتل ہو۔ عام ولایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

غرض ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور ﷺ کے زمانے میں دجال کو ظاہر کر دیا جاتا' آپ اسے قتل کر دیتے۔۔۔ وہ قتل تو ہو جاتا۔۔۔ لیکن اگر وہ اس زمانے میں ظاہر ہو کر قتل ہو جاتا تو اس کے دجل و فریب کے جو مراتب اور مقامات ہیں وہ نہ کھلتے کہ ان سے تقابل ہو کر ایمان کی قوتیں ظاہر ہوتیں۔ بلکہ وہ یکدم سامنے آتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔۔۔ اور مقصد یہ تھا کہ دجال ظاہر ہو اور اس کے سبب باطل کی استعدادیں پیدا ہوں۔ اس باطل سے پھر حق کی قوتیں ٹکرائیں۔ اور حق کی قوت نمایاں اور واضح ہو' اگر اس وقت ظاہر ہوتا تو یہ تقابل ختم ہو جاتا بس وہ ہاتھ کے ہاتھ قتل ہو جاتا۔ اس لئے اس کا ظاہر آخر دور میں رکھا گیا تاکہ اس کے قلب کے اثرات سے امت میں باطل بھی ظاہر ہوتا رہے۔ اور اسلام اس کا مقابلہ بھی کرتا رہے۔

اب دوسری صورت قتل کی یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کو اس وقت تک باقی رکھا جاتا کہ وہ ظاہر ہو اور آپ اسے قتل کر دیں۔ یہ آپ ﷺ کی شان سے فروتر بات ہے کہ محض قتل دجال کے لئے آپ ﷺ کو عالم میں باقی رکھا جاتا۔۔۔ نیز یہ کہ اگر آپ ﷺ کو باقی رکھا جاتا تو دجل و فساد کے مراتب سامنے نہیں آ سکتے تھے۔۔۔ نبوت کی قوتیں اتنی پھیلی ہوئی ہوتیں کہ دجل کا ضعف حق کے مقابلے میں واضح ہو۔

### حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتل دجال بنانے کی حکم

اب کئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ دجال کا قتل بغیر نبوت کی طاقت کے نہیں ہو سکتا۔ اور نبوت بھی معمولی نبوت نہیں بلکہ ختم نبوت کی قوت ہو جب وہ ختم ہو۔ ولایت کام نہیں دے سکے گی۔ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی رکھا جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا کہ محض اسکے قتل کے لئے باقی رہیں۔

اب اس کے جمع کی صورت حق تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دجال کا قاتل قرار دیا۔ ان میں اور نبی کریم ﷺ میں متعدد مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں جو اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہیں۔

### وصف خاتمیت میں مماثلت

مثلاً پہلی بات یہ ہے نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور خاتمیت کا مقام آپ ﷺ کو عطا کیا گیا۔۔۔ تو ایک گونہ خاتمیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہے کہ وہ خاتم انبیاء نبی اسرائیل گویا سب سے بڑا دور جو

نبوت کا ہے وہ اسرائیلی نبوت کا ہے۔ ہزار ہا انبیاء اس کے اندر پیدا ہوئے اور فرمایا گیا وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ.

ہم نے اس خاندان کو جہانوں پر برگزیدہ کیا۔

اور اس خاندان میں ہم نے نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی دی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّالَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ.

نبوت کی دولت دی، ملوکیت کی دولت دی اور وہ نعمتیں دیں جو علم میں ان سے پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں، ایک عظیم انسانی خاندان جس میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان پر آکر اسرائیلی نبوت منتہی ہوگئی۔ تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبوت کے خاتم ہیں۔ مسیح علیہ السلام خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ تو خاتمیت کے مقام میں ایک گونہ مناسبت ہوئی

## وصف رحمت میں مماثلت

پھر جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت مجسم فرمائی گئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ.

یہی رحمت مجسم حضرت مسیح علیہ السلام کی شان بتلائی گئی ہے۔ جہاں ان کی پیدائش کا ذکر ہے اس میں فرمایا گیا ہے۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا.

جب حضرت مریم علیہا السلام نے کہا کہ۔

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ " وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ " وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا.

"میرے بیٹے کہاں سے ہو سکتا ہے۔ بشر نے مجھے چھوا نہیں، زانیہ و باغیہ میں نہیں ہوں"۔

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ " وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا.

یوں ہی ہوگا۔ اللہ کا حکم ہو چکا ہے۔ اور یہ اس لئے ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو ہم نے اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے بطور نشان قدرت کے ہم نمایاں کریں گے کہ بلا باپ کے بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہ امر طے شدہ ہے۔ ایسے ہی ہوگا۔

جو رحمت مجسم حضور ﷺ کو فرمایا گیا۔ وہی رحمت مجسم ہونے کی شان مسیح علیہ السلام کی فرمائی گئی۔

**تربیت اتباع میں مماثلت** جس طرح نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کی شان فرمائی گئی رُحمآ بینھم خود ان صحابہؓ میں رحمت کا غلبہ ہے۔

وہی شان متبعین عیسیٰ السلام کے بارے میں فرمائی گئی۔ فرمایا گیا۔

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰیٓ اٰثَارِھِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً.

”ان کے اتباع کرنے والوں کے قلوب میں ہم نے رافتہ اور رحمت بھر دی۔“

اتباع عیسوی میں غضب کا غلبہ نہیں تھا بلکہ رحمت کا غلبہ تھا۔ تو جو غلبہ اصحاب محمدی میں فرمایا گیا وہی غلبہ اصحاب عیسوی کے اندر فرمایا گیا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ تربیت کے اندر مشابہت ہے۔ جو شان تربیت حضور ﷺ میں ہے وہی شان تربیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ہے جو شان رحمت آپؐ میں ہے۔ اسی کے قریب شان رحمت حضرت مسیح علیہ السلام میں ہے غرض یہ مناسبات ہیں۔

**زہد و شوکت کی زندگی میں مماثلت**

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوی مناسبت یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو دو زندگیاں عطاء کی گئیں۔ ایک مکی زندگی کہلاتی ہے۔ ایک مدنی زندگی کہلاتی ہے مکہ کہ زندگی تیرہ سالہ اور مدینہ کی زندگی دس سالہ ہے۔ اس طرح نبوت کے تئیس برس ہوتے ہیں۔ تو مکہ کی تیرہ سالہ زندگی انتہائی زہد اور قناعت کی ہے جس میں تشدد کی اجازت نہیں مار کھاؤ۔ سہو اور جواب نہ دو۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ

اے نبی در گزر اختیار کرو۔۔۔ کہیں فرمایا۔

اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ.

اگر یہ بک بک بھی کریں تو تم اعراض کرو۔ در گذر کرو۔ جاہلوں کی باتوں کی طرف دھیان مت کرو۔ اگر یہ تمسخر بھی کرتے ہیں تو انہیں ہم پر چھوڑ دیں۔ انہیں ہم نپٹ لیں گے۔ آپ انہیں جواب نہ دیں۔

کہیں فرمایا۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا. اِنَّھُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰهُ قَرِیْبًا.

اگر یہ ایذائیں پہنچائیں تو آپ تحمل کریں اور صبر جمیل اختیار کریں۔ کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انجام کچھ دور ہے۔ حالانکہ وہ بہت قریب آگیا ہے۔ عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

غرض جگہ جگہ حکم ہے کہ نہ تلوار اٹھاؤ۔ نہ زبان کھولو، نہ ہاتھ ہلاؤ، ماریں تو مار کھاؤ گالیاں

دیں تو چپ ہو جاؤ۔

ہاں کیا کرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا.

ان کے ساتھ جہاد کبیر کرتے رہو۔اس کے راستے میں مار کھانی پڑے تو مار کھالو پٹنا پڑے، پٹ لو۔۔۔ گویا تلوار کے جہاد کو جہاد صغیر کہا گیا۔اور زبان سے اعلائے کلمۃ اللہ کو کہا گیا کہ وہ جہاد کبیر ہے، وہ جہاد کرتے رہو لیکن مار کھانے کے لئے تیار رہو مقابلہ میں یہ اف نہ کرو۔ تیرہ سال اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گذری ہے۔

جب مظالم کی انتہاء ہوگئی کہ گالیاں بھی دی گئیں، ساحر بھی کہا گیا۔ کذاب و مجنون بھی کہا گیا اور اشر بھی کہا گیا۔ اونٹ کا بوجھ بھی ڈالدیا گیا کانٹے راستے میں بچھائے گئے۔ کتے بھی پیچھے لگائے گئے۔ پتھر بھی مارے گئے اور اخیر میں وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔۔۔ تو وطن سے بے وطن بھی کیا۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تب یہ آیت نزل ہوئی:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا. وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ".

اب ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن مظلومیت کی حد آگئی ہے کہ اب وہ مقابلہ کریں اور جواب دیں۔۔۔ بہرحال دس سالہ زندگی شوکت کی زندگی ہے۔ اور تیرہ سالہ زندگی درویشی اور انتہائی فقر و قناعت کی زندگی ہے، تیرہ سالہ زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔۔۔ مدینے کی زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ لیکن اس شوکت کو پیش خیمہ یہی تیرہ سالہ زندگی بنی۔ زہد و قناعت، صبر وحیا، شجاعت و سخاوت بھر دی تاکہ تیرہ برس کے بعد جب یہ مجاہد قوم نکلے تو حظ نفس کی وجہ سے جہاد نہ کرے، نفسانیت کی وجہ سے نہ کرے بلکہ خالص للھیت کے جذبہ سے میدان میں آئے۔

تو تیرہ برس تربیت کی تاکہ مخلص مجاہد پیدا ہو جائیں۔ اخیر میں جا کے انہوں نے تلوار اٹھائی اور قتال کیا۔۔۔ پھر فتح مکہ ہوئی شوکت کا آغاز ہوا اور یہ سارے کام ہوئے۔ غرض یہ دو زندگیاں۔۔۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ السلام میں پائی جاتی ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی ہے یعنی پیغمبری کی ابتداء۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ داہنا سامنے کر دو 'اف نہ کرو' جواب نہ دو، مسیح علیہ السلام کی شریعت میں انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ عفو اور درگزر واجب ہے، غرض تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی مارے تو اور گردن جھکا دو کہ بھئی! ایک اور مار تا جا خدا تیرا بھلا کرے، یہ گویا مکہ کی زندگی کے مشابہہ ہے کہ جس کے اندر نہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے، نہ زبان کھولنے کی اجازت۔۔۔ لیکن جب مظلومیت کی انتہاء ہوئی۔ یہود نے یہاں تک کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دو۔۔۔ تب حق تعالیٰ شانہ نے دوسرا بندوبست کیا کہ جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے اندر گھسا۔ اس پر عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈالدی اور وہ پھانسی پا گیا اور حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی عزت کے ساتھ اوپر اٹھالیا گیا۔۔۔ دنیا چاہتی تھی کہ انتہائی طور پر ذلیل کریں کہ اس دنیا کے اندر ان کا وجود نہ رہے' حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنی عزت دیں گے کہ آسمانوں پر قیام کرائیں گے اور زندہ رہیں گے یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ . وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ.

نفی کی گئی ہے کہ نہ انہیں پھانسی دی گئی ہے نہ انہیں قتل کیا گیا' قتل یا پھانسی کے مدعی ہیں وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس شخص کے اوپر شبیہ ڈالی گئی ہے جو لینے کے لئے پکڑنے کے لئے گیا تھا اس کو قتل کیا گیا۔۔۔ انہیں علم ہے۔۔۔ اور اخیر میں پھر مؤکد طریق سے کہا کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا۔۔۔ تو جب قتل نہیں کیا اور پھر موت کے سامان نہیں ہوئے تو رفع کا مطلب یہی ہے کہ جسم کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا۔۔۔ اگر قتل کر دیئے جاتے اور پھانسی دے دیئے جاتے۔ پھر روح محض کا رفع ہوتا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی نفی کر کے فرمایا گیا کہ اللہ نے انہیں اٹھالیا تو وہ اٹھانا زندگی کے ساتھ ہو سکتا ہے اور جسم کے ساتھ ہو سکتا ہے۔۔۔ اس کا حاصل یہ کہ جیسے مظلومیت کی انتہاء پر حکم دیا گیا کہ زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرو' اس لئے کہ حضور ﷺ کی قوم چاہتی تھی کہ یہ اس مکہ شہر میں نہ رہیں۔ تو ملک میں ہجرات کرائی گئی۔ یہود چاہتے تھے کہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ اس واسطے آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی گئی' تو ایک جگہ ہجرت یثرب کی واقع ہوئی ہے اور ایک جگہ آسمان کی واقع ہوئی۔

جیسا کہ حضور ﷺ کو ہجرت کے بعد لوٹایا گیا اور دس سالہ شوکت کی زندگی بھی ہے اس میں تلوار ہاتھ میں ہے اور فاقین ومنافقین اور فاجرین کے مقابلے پر تلوار بھی ہے حدود بھی ہیں اور قصاص بھی ہے' اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لائیں گے تاکہ اس زہد کی زندگی کے مقابلے میں اب ان کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی دجال کا مقابلہ بھی ہوگا دجال کے متبعین کے مقابلے میں تلوار لئے ہوئے ہوں گے۔ قتل وقتال بھی ہوگا جہاد میں بھی کھڑے ہوں گے۔ اور استیصال کریں گے جیسا کہ مشرکین مکہ سے حضور ﷺ کے زمانے میں جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے اسلام تھا یا قتل تھا۔۔۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ اس وقت دنیا کی قوموں کے لئے یا اسلام ہوگا۔ یا قتل ہوگا۔ جزیہ کا واسطہ بیچ میں نہیں ہوگا۔ یہ جزیہ منسوخ کر دیا جائے گا۔۔۔ تو ٹھیک مشابہت اور مناسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم ﷺ سے حاصل ہے' شان رحمت میں بھی' وصف خاتمیت میں بھی اتباع اور متبعین کی شان رحمت کے اندر بھی ہجرت کے اندر بھی دونوں زندگیوں کے اندر بھی ابتدائی زندگی عدم تشدد کی۔۔۔ انتہائی زندگی تشدد کی ان سب چیزوں میں مشابہت تامہ آپ کو حاصل ہے۔

## ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہ محمدی کا دخل

اور اس میں لطیفے کے طور پر ایک چیز اور بھی ہے وہ یہ کہ شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے بعض تابعینؒ کا ایک اثر نقل کیا ہے۔ وہ اس درجے میں تو نہیں ہے کہ اسے بہت بڑی حجت شرعیہ سمجھا جائے ایک تو اثر ہے، اور وہ بھی تابعینؒ کا مگر لطیفے کے درجے میں مویدات کے درجے میں اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئی جس کا واقعہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے:

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا

ایک بشر تام الخلقت وکامل الخلقت نوجوان جس کے کسی جوڑ وبند میں فرق نہیں تھا نہایت حسین وجمیل صورت کا انسان نمایاں ہوا۔ جس کو دیکھ کر حضرت مریم علیہا السلام گھبرا گئیں۔ اور فرمایا:

اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا

"اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو متقی آدمی ہے"۔

تو کہاں ایک نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں آیا۔۔۔؟

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا.

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تیرے پروردگار کا رسول اور قاصد بن کے آیا ہوں تاکہ تجھے ایک بیٹا عطا کردوں"۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا.

میرے بیٹا کدھر سے ہو جائے گا بشر نے آج تک مجھے چھوا ہی نہیں، بقول شخصے کسی مرد کی آج تک صورت تک میں نے نہیں دیکھی۔ اور ویسے بھی اپنی ذات سے میں کوئی بغیا اور زانیہ نہیں ہوں۔ عفیفہ اور پاکدامن ہوں۔ کبھی کوئی چیز عفت کے خلاف مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ غرض اپنی ذات سے پاک دامن۔۔۔ اور مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ زنا کا احتمال تک نہیں، پھر کیسے بیٹے آجائے گا؟ گویا عادت عامہ کے اعتبار سے حضرت مریم علیہا السلام نے ظاہر کیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آنے والے تھے، وہ خرق عادت کے طور پر تھے۔ عادت کے طور پر نہیں تھے۔

تو جبریل علیہ السلام نے کہا:

قَالَ كَذٰلِكِ. قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ.

"یوں ہی ہوگا اور تیرے رب پر آسان ہے"۔

جو نر اور مادہ کو ملا کر اولاد دے سکتا ہے وہ فقط مادہ سے بھی دے سکتا ہے وہ فقط نر سے بھی پیدا

کر سکتا ہے' دونوں نہ ہوں' ہوا سے پیدا کردے۔ اب میں کہتا ہوں کہ یہ ہزاروں جاندار بھنڈے اور مچھر پسو ہیں وہاں نر اور مادہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے' ہوا سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو پروردگار بلا نر و مادہ کے جاندار پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو بلا ماں باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت حوا علیہا السلام کو بلا واسطہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلا باپ کے کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟ --- چونکہ خرق عادت کے طور پر پیدا کرنا تھا۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام کو عادت کے طور پر اشکال تھا اس کو دفع کر دیا کہ:

قَالَ كَذٰلِكِ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ

"تیرے رب پر یہ آسان ہے۔ اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں۔ غرض انہوں نے پھونک ماردی اور وہ حاملہ ہو گئیں"۔

اس پر شیخ عبدالغنی نابلسی" لکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بشر سوی یعنی کامل الخلقت بشر کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے بارے میں بعض تابعین کا اثر نقل کیا کہ وہ شبیہ نبی کریم ﷺ کی تھی یعنی صورت محمدیؐ بن کر نمایاں ہوئے --- تو حقیقت جبرئیلی تھی اور صورت محمدی تھی۔ نفخہ تو جبرئیلی ہوا لیکن نبی کریم ﷺ کی شکل میں ہوا --- اس کا حاصل یہ نکلا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں شبیہ محمدی کو کچھ دخل ہے اور کچھ مناسبت ضرور حاصل ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے اوصاف میں مناسبت ہے' وصف خاتمیت میں بھی' وصف رحمت میں بھی' اتباع کی شان تربیت میں بھی اور زندگیوں کے ادوار میں بھی یہ اس شبیہ مبارک کا اثر ہے کہ ساری مناسبتیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

## زوجیت حضرت مریم علیہا السلام

اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حضرت مریم علیہا السلام بطور زوجہ کے نبی کریم ﷺ کو دی جائیں گی --- یہ روایات میں موجود ہے --- اس سے گویا مناسبت نکلتی ہے کہ شبیہ محمدی ﷺ کے سامنے حضرت مریمؑ مثل زوجہ کی تھیں۔ اب اس شبیہ کے ساتھ میں وہ حقیقت اور ذات بھی پیش کر دی گئی کہ اب وہ اس کے لئے زوجہ بنے --- بہرحال یہ چیزیں لطیفے کے طور پر عرض کر رہا ہوں --- یہ تو حجت ہے کہ آپ کو زوجہ بنا کر دی جائیں گی --- لیکن یہ جو اثر میں نے نقل کیا ہے یہ اتنی قوی حجت نہیں ہے۔ مگر لطائف اور مویدات کے درجے میں پیش کیا جا سکتا ہے --- بہرحال اتنی مناسبتیں ہیں۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام تجدید

جب اتنی مناسبتیں ہیں اور وصف خاتمیت میں بھی مناسبت ہے تو قتل د

دجال کے لے زیادہ مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جب کہ وہ بمنزلہ بیٹے کے بھی ہوئے۔ تو باپ کے دین اور مشن پر جب آفت آئے تو بیٹا ہی زیادہ حق دار ہوتا ہے کہ باپ کی طرف سے مدافعت کرے اور باپ کی طرف سے حمایت کرے۔

یہ دجال گویا دین محمدیؐ کے اوپر آفت لائے گا حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ مستحق تھے کہ دین کی حمایت کے لئے بطور مجدد کے بڑھیں اور قتل کریں اور دین محمدیؐ کو دنیا کے اندر برپا کریں۔۔۔ چنانچہ اسے قتل کریں گے۔

**غلبۂ اسلام**

اور حدیث میں ہے دجال کے ساتھ کثرت سے یہود ہوں گے۔ جن کے اندر تھوڑی بہت سعادت ہوگی وہ حضرت مہدیؓ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے۔ اس لئے کہ مہدیؑ وہ تبرکات نکالیں گے جو "تابوت سکینہ" میں ہیں۔ اور تابوت سکینہ کی روایات میں ذکر آتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پگڑی ہوگی۔ اور "الواح تورات" ہوں گی۔ یہ تابوت جو دفن کیا تھا اس کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن حضرت مہدیؓ پر منکشف ہوگا اس میں سے وہ چیزیں دکھلائیں گے۔۔۔ تو جس جس یہودی کے اندر ذرا بھی سعادت ہوگی وہ ایمان قبول کرے گا۔ اور جس نصرانی میں سعادت ہوگی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کرے گا۔

تو دنیا میں تین ہی قومیں بڑی ہیں۔ ایک مسلمان ایک یہود اور ایک نصاریٰ۔۔۔ یہی عظیم قومیں ہیں جو مستند ہیں۔ یہود کا وجود اس طرح ختم ہو جائے گا جن میں سعادت ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ جن میں نہیں ہے وہ دجال کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور مقتول ہو جائیں گی۔ ایک قوم ختم ہوگئی۔

نصاریٰ کے بارے میں یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ یہ قوم یوں ختم ہوئی۔ اب ایک ہی قوم مسلم رہ جاتی ہے۔

فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ.

تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔۔۔ پورے عالم میں ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی پلیٹ فارم ہوگا۔ اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نقطۂ نظر ہو جائے گا۔۔۔

غرض جس طرح نبی کریم ﷺ کی زندگی میں دس سالہ شوکت قائم ہوئی اور حجاز کے بارے میں فرمایا گیا۔

يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا.

"فوج در فوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے"۔

تو مسیح علیہ السلام کے سامنے پوری دنیا کے انسانوں کا بھی یہی نقشہ ہوگا۔ کہ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ

اَفْوَاجًا۔

## مراتب تکمیل دین کی صورتیں

فرق کیا ہوگا۔۔۔؟

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔۔۔ دین کو کامل کر دیا گیا۔ تو تکمیل دین کی دو صورتیں ہی ایک کیفی طور پر ایک اور کمی طور پر۔۔۔ ایک تو کیفیت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ ہر ہر فرد دین کا ایسا مجموعہ بن جائے کہ گویا اسلام مجسم ہے۔ تو یہ کیفیت کے لحاظ سے ہے۔۔۔ اور کمیت تعداد کے لحاظ سے اسلام کی تکمیل کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔ ساری تعداد مسلمانوں ہی کی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ عدد کے لحاظ سے اب مکمل ہو اور کیفیت کے لحاظ سے یوں تکمیل ہے کہ چاہے آدھے ہوں تھوڑے ہوں مگر ہر ایک اسلام مجسم ہو۔ تو نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر اسلام کی کیفی تکمیل کی۔۔۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب قریب ایسے صحابہؓ پیدا کئے جو آپ کی ذات کے نمونے تھے۔ اور ایک ایک فرد اسلام مجسم تھا۔۔۔ اس لئے امت کا اجماع ہے کہ نیت، عدل، کمالات و اخلاق اور علم و معرفت کے لحاظ سے۔

الصحابة کلهم عدول۔

"ان سے زیادہ متقی اور پارسا دنیا میں نہیں ہے"۔

امت میں بڑے بڑے غوث پیدا ہو جائیں۔ صحابیتؓ کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے اس لئے کہ براہ راست آفتاب نبوتؐ نے ان کی تربیت کی ہے۔ اور بلا واسطہ آفتاب نبوت کا نور ان کے قلب پر پڑا ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ایمان کی تکمیل کیفیت کے لحاظ سے کی۔ تعداد تو تھوڑی تھی کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نفوس قدسیہ نمایاں ہوئے۔ مگر ایک ایک فرد ایک ایک امت کے برابر تھا۔۔۔ لیکن کمی تکمیل باقی تھی کہ عددی طور پر اسلام اتنا پھیلے کہ دنیا میں غیر مسلم کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ تکمیل آخری مجدد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوگی۔

فَیَکُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

ہر قوم ختم ہو کر ایک قوم رہ جائے گی اور وہ اسلامی قوم ہوگی۔ تو پورے عالم میں دین واحد پھیل جائے گی۔

## اسلام کا غلبۂ تام

اس لئے دعویٰ فرمایا گیا ہے:

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ

اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا اور ہدایت بھیجی تاکہ تمام ادیان پر اس دین کو غالب کر دے۔ اور غلبۂ تام کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ مغلوب چیز کالعدم اور صفر کے درجے میں ہو جائے غالب ہی کا وجود رہ

جائے۔ تو ایک ہی دین غالب آجائے گا جو خاتم الانبیاء علیہ السلام کا دین ہوگا اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گونا گوں مشابہتیں اور مناسبتیں نبی کریم علیہ السلام سے حاصل ہیں۔ اوصاف میں بھی افعال میں بھی۔ وجود میں بھی ذات میں بھی۔

اور سب سے زیادہ زمانے کے لحاظ سے اقرب بھی حضور علیہ السلام کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، کیونکہ آپ کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں کوئی نبوت نہیں آئی تو عہد کے لحاظ سے اشبہ ترین بھی وہی ہیں۔ تو وہ زیادہ احق تھے کہ دین محمد کی خدمت اور مدافعت کریں اور اس دجال اعظم کو قتل کریں تو نبی کریم علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل نہیں کرایا گیا بلکہ آپ کے شبیہ کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ جس میں وہی طاقت رکھی گئی۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کی حکمتیں

اور اس کے ساتھ میں ایک فائدہ اور مصلحت یہ بھی حاصل ہوئی کہ یہ جو آپ نے فرمایا:

**لو کان موسی حیا لما وسعه الا اتباعی۔**

اگر آج کے دور میں موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا اتباع کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میرے ہی دین میں داخل ہو کر رہنا پڑتا۔ تو حق تعالیٰ نے اس کو عملی طور پر نمایاں کر دیا کہ جس قوم کی ابتداء موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی ہے اس کا نچوڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کو امتی بنا کر لایا گیا تاکہ کل اسرائیلی پیغمبر امتی شمار کئے جائیں۔ خاتم سے جو چیز سرزد ہوتی ہے وہ پورے دائرے کی شمار کی جاتی ہے۔ تو یہ بھی اس سے نمایاں ہو گیا۔۔۔ غرض خاتم الدجالین کا ظہور خاتم الانبیاء ہی کے دور میں ہونا چاہئے تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے دور میں نہیں ہونا چاہئے تھا۔۔۔ اس کا حقیقی تقابل آپ سے ہے، ولایت کی روحانیت اس کے مقابلے کے لئے کافی نہیں ہے نبوت کی روحانیت ضروری تھی اور اس میں بھی ختم نبوت کی کچھ نہ کچھ شان موجود ہو تاکہ وہ خاتم الانبیاء کی طرف سے قابل بنے۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع کیا گیا۔

اور اس لئے بھی رفع کیا گیا کہ یہود نے انتہائی تذلیل کا ارادہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی اعزاز دیا۔ تم ان کو زمین میں بھی رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ ہم زندگی کے ساتھ آسمانوں میں باقی رکھیں گے۔

اب آگے روایتی مسئلہ ہے تو احادیث ان مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ یہ چیزیں لطائف اور اسرار کے درجے میں ہیں کہ اگر کوئی یوں پوچھے کہ مصلحت آخر کیا تھی؟ تو یہ مصالح تھیں۔۔۔ لیکن معاملے کی بنا مصالح کے اوپر نہیں ہے۔ بنا تو روایت کے اوپر ہے جو نبی کریم علیہ السلام نے فرمائی۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو حکم اپنی جگہ حق ہے۔

## اسلام کی شان خاتمیت

لیکن یہ اسلام کی ایک خاتمیت کی شان ہے کہ جو حکم آیا اس میں حکمت ضرور ہے جو کوئی امر آیا اس میں کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔ جو ہدایت دی گئی اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔

عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ. وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَا اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ.

جس کو آپؐ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے صحابہؓ معاذ اللہ صماو عمیانا، اندھے بہروں کی طرح سے نہیں گرتے بلکہ حجت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ دین میں بصیرت ہے۔ دین اسلام رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رواج جمع ہو گئے جن کی نہ مصلحت معلوم ہو نہ کچھ اور۔ باپ دادا سے سنتے آئے بس عمل کر لیا۔

جیسا کہ دوسرے مذاہب میں رسوم غالب ہیں۔ ان رسوم کی مصلحت پوچھی جاتی تو جواب یہ ہوتا ہے کہ:

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَ عَلٰی اُمَّةٍ ـ

باپ دادا کو اسی طرح سے کرتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں۔۔۔ کوئی علت یا کوئی حکمت جو منجاب اللہ نازل کی گئی ہو۔ نہیں ہے۔۔۔ تو اسلام ایسی چیز نہیں ہے۔ اس میں جو حکم بھی ہے اس میں حکمت ہو گی۔۔۔ جو امر ہے اسمیں کوئی نہ کوئی علت ہو گی۔ جو ہدایت ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ تو مصالح اس طرح سے عارفین نے بیان کی ہیں۔ حکم کی بناء مصالح پر نہیں ہے۔۔۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ جو اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا۔ اس سے ایک طمانیت حاصل ہو جاتی ہے جب مصلحت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ چلو مصلحت بھی سامنے آگئی۔۔۔ لیکن نفس ایمان مصالح کے اوپر موقوف نہیں۔

## تعوذ دجال کی دعاء کی حکمت

اگر حضور ﷺ کے زمانے میں دجال پیدا ہو جاتا تو اس کا فتنہ حضور ﷺ پر معاذ اللہ کارگر تھوڑا ہی ہو سکتا تھا۔۔۔ اس دعاء میں دجال کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں۔ جس میں دجال سے پناہ مانگی گئی ہے۔۔۔

اللهم انی اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال.

"اے اللہ! میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتا ہوں"۔

اب میں امت کی تعلیم مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں کو دجال سے سابقہ پڑے گا ان کا فرض ہے کہ وہ یہ دعاء مانگیں۔۔۔ یا جیسے فرمایا گیا جو شخص سورۃ کہف کثرت سے تلاوت کرے گا بالخصوص جمعہ کے دن تو فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ایک دجال ذات ہے اور ایک دجالیت ہے اور اس کے اوصاف اور اس کا

فتنۂ۔۔۔ اوصاف اور فتنہ اس کے ظہور پر موقوف نہیں، اس کی آمد کے قرب میں دجل وفساد کے آثار شروع ہو جائیں گے۔ وہ اس کے ظہور کا اثر ہوگا۔ جیسے آفتاب کا اثر دو گھنٹے پہلے کچھ نہ کچھ سفیدی اور کچھ چاندنا شروع ہو جاتا ہے۔ یا جیسے حدیث میں فرمایا گیا:

اذا اراد الله شيئاهيئاله اسبابه۔

جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب کا ایک سلسلہ بچھاتا ہے کہ تدریجاً رفتہ رفتہ ایک مدت میں جا کے وہ چیز ظہور کرتی ہے مگر پہلے سے اسباب بچھنا شروع ہو جاتے ہیں تو دجال کے ظہور سے پہلے اسباب مہیا ہوں گے۔ قلوب میں اس کی باتیں قبول کرنے کی استعدادیں پیدا ہوں گی تو دجل اور فسادات اس کے آثار میں سے ہیں۔ باقی حضور ﷺ کا دعاء مانگنا تو اس کے لئے ہے تاکہ امت کو اسوہ معلوم ہو جائے کہ یہ دعاء کرنی چاہئے۔

## عبدیت عیسوی علیہ السلام

احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسجد اقصیٰ کی چھت کے اوپر ملائکہ کے کندھوں کے اوپر ہاتھ ٹیک کر آئیں گے۔۔۔ اور لباس یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اوپر دو چادریں ہوں گی۔ ایک زرد اور ایک گیروے رنگ کی۔ گویا جو زہد وقناعت کا مظاہرہ ہے اسی رنگ کا لباس ہوگا۔ اور آکر فرمائیں گے کہ سیڑھی لگاؤ، گویا جو اور فضا میں تو بواسطہ ملائکہ آئے۔ یعنی باطنی اسباب کے تحت، اور جب چھت کے اوپر آکر ٹک گئے۔ اب مادی دنیا کا معاملہ شروع ہو گیا۔ تو اب مادی اسباب کی طلب ہوئی کہ سیڑھی لگاؤ کہ میں اتروں۔ ورنہ ملائکہ کے واسطہ ہی سے نیچے اتر سکتے تھے لیکن ملائکہ نے جو اور فضا تک پہنچایا جہاں اسباب نہیں پہنچتے۔ اور جہاں سے اسباب شروع ہوئے وہاں سے اسباب اختیار کئے۔ کیونکہ عبدیت کا ظہور اسی میں ہوتا ہے کہ اسباب کو قطع نہ کیا جائے بلکہ اختیار کیا جائے۔۔۔ جب آئیں گے تو نماز کا وقت ہوگا اور حضرت مہدیؓ تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ فرمائیں گے نہیں۔ یہ امت اللہ کے ہاں بڑی معظم ہے:

وامامكم منكم۔

تمہارے امام تمہارے ہی اندر سے ہوں گے آپ ہی احق ہیں کہ نماز پڑھائیں چنانچہ مہدیؓ نماز پڑھائیں گے۔ بہر حال یہ سارے واقعات تفصیل سے آتے ہیں۔

## مدفن حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضور ﷺ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور حضرت صدیق اکبرؓ کے قبر مبارک کے درمیان میں جگہ خالی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے۔ اولاد بھی ہوگی۔ اس

واسطے کہ جب آسمان پر گئے ہیں جب تک تو نکاح نہیں ہوا تھا۔ آئیں گے تو نکاح بھی ہو گا۔ اولاد بھی ہوگی پھر وفات ہو گی اور حضور علیہ السلام کے قریب دفن ہوں گے۔

یہ تمثیلی طور پر ایسا ہے جیسے کسی کی اولاد کوئی عظیم کارنامہ کر کے باپ کے اوپر آفت کو ٹلائے اور فاتح بن کے آئے کہ میں نے آپ کے مشن کو بالکل محفوظ کر دیا تو باپ شاباش کے طور پر بغل میں لے لے کہ میرے قریب آجا۔۔۔ دجال کو قتل کیا عالم میں دین پھیلایا۔۔۔ فرمایا گیا کہ اب میرے پہلو میں آجاؤ جو تمہارا حق ہے۔

**علامات ظہور مہدیؓ**

جیسی تفصیل مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے ویسی ہے ظہور مہدیؓ کے بارے میں بھی ہے، امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں وہ ساری حدیثیں جس میں بعض صحیح ہیں بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔۔۔ مگر ساری قابل احتجاج ہیں۔ وہ سب نقل کر دی ہیں اس میں تمام علامات ذکر ہیں۔ حضرت مہدیؓ کا نسب نامہ ان کا حلیہ اور ان کے ظہور کی نوعیت پھر علامات قریبہ اور علامات بعیدہ بھی بیان کی ہیں۔ بعض وہ علامات ہوں گی جو بالکل ظہور کے قریب میں آئیں گی۔

قریب ترین علامت مثلاً یہ فرمائی گئی کہ حجاز کے اندر سونے کا پہاڑ ظاہر ہو گا۔ تو سونے کی کان تو حجاز میں نمایاں ہو چکی ہے۔۔۔ یہ بھی فرمایا گیا زمین اپنے خزائن اور دفائن اگلنا شروع کر دے گی، تو آج کوئی حجاز کو جا کر دیکھے تو وہاں پانی بھی ہے، سبزی بھی اگ رہی ہے، اسی طرح معدنیات کے بھی آثار ہیں وہ بھی نکل رہے ہیں۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین حجاز نے سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کے ملکوں کے پاس آج اتنی دولت نہیں جتنی عربوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دے رہے ہیں۔۔۔ یہ علامتیں ہیں۔

**منیٰ میں جنگ عظیم**

مگر قریبی علامت یہ فرمائی گئی کہ جس سال ظہور ہو گا وہ مکہ میں ہو گا اس سال منیٰ میں حجاج میں باہم جنگ عظیم ہو گی اور اتنا قتل و قتال ہو گا کہ جمرۂ عقبہ خون سے بھر جائے گا اور ہزاروں انسان آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ عدد بھی مذکور ہے کہ ۳۱۳ آدمی باقی بچیں گے۔ باقی سب قتل ہو جائیں گے اب انہیں فکر پڑے گا کہ کوئی تو ہمارا سرگروہ ہو ورنہ ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اب ہم کہاں جائیں؟۔۔۔ پھر وہ مکہ مکرمہ میں آئیں گے۔ اور وہ اس علامت کو پہچانتے ہوں گے کہ منیٰ میں قتل ہونا اور جمرہ عقبہ کا خون سے بھرنا یہی ظہور مہدیؓ کی علامت ہے، تو انہیں یقین ہو گا کہ مہدیؓ کی طرف رجوع کریں۔ اور مہدیؓ ان سے چھپ کر مکے میں آئیں گے۔ پھر مطاف کے اندر یہ انہیں

پکڑیں گے۔ وہ فرمائیں گے کہ میں ایسی قوم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جو اس درجہ آپس میں خونریزی کرے۔ تم لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔۔۔ یہ انہیں بھی دھمکی دینا شروع کر دیں گے۔ پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔۔۔ اسی کے بارے میں وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک آواز بھی غیب سے ظاہر ہو گی کہ:

**هذا خليفة الله المهدىؑ فاسمعوله واطيعوه۔**

"یہ خلیفۃ اللہ مہدیؑ ہیں ان کی سمع وطاعت کرو۔۔۔"

## شام کی جنگ عظیم

جب وہ ان سے بیعت لے لیں گے پھر یہ آواز پھیلے گی اور شہرہ ہو گا تو پھر بجانب عراق ابدال شام اور اقطاب ہند تمام اطراف سے جو مسلمان منتشر ہوں گے اور انتہائی کمزوری کی حالت میں ہوں گے وہ سب سیاہ جھنڈوں کے نیچے خراسان کی طرف سے شام کی طرف بڑھیں گے تاکہ مہدیؑ کے لشکر میں داخل ہوں۔۔۔ اور حضرت مہدیؑ شام کو اپنا مرکز بنائیں گے اور شام ہی میں وہ ملحمۂ کبریٰ اور جنگ عظیم نمایاں ہو گی جس کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا کہ اتنا لمبا چوڑا محاذ ہو گا کہ کوا جو سب سے زیادہ اڑتا ہے یہ دن بھر اڑے گا اور لاشیں ہی لاشیں اس کے نیچے ہوں گی۔ یہ دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ اتنا لمبا محاذ ہو گا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ محض تیر و تفنگ کی جنگ نہ ہو گی۔ ہزاروں میل کا لمبا محاذ جنگ جبھی ہو سکتا ہے جب مشین ہو ورنہ اگر ایک میدان میں جنگ ہو جائے چاہے دو لاکھ آدمیوں کی ہو۔ وہ میل دو میل یا دس میل میں ہو گی لیکن ہزاروں میل مقتولین کی تعداد ہو جائے اور پھیلے ہوئے پڑے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی عظیم الشان اور لمبا چوڑا محاذ ہو گا۔

## مغرب کی طاقتوں کی شکست

وہ ملحمۂ کبریٰ جس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں۔ کہ مغرب کی طاقتیں ان کے ہاتھ پر ٹوٹیں گی۔ اور پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہو گا اور دین واحد ہو جائے گا۔

اس وقت سب سے زیادہ طاقت نصاریٰ کی ہو گی۔ پورے عالم پر انہیں کا غلبہ ہو گا۔ یہ طاقت مہدیؑ کے ہاتھ پر ٹوٹے گی۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دوامی مقابلہ اگر کسی قوم سے ہے تو وہ عیسائی قوم ہے

## مشرکین سے اسلام کا مقابلہ

اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو مشرکین عرب سے مقابلہ پڑا لیکن وہ ختم ہو گیا اس واسطے کہ جب فتح مکہ ہوئی یا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا قتل ہوئے جلاوطن ہو گئے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ آج شیطان مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں

اب اس کی پوجا کی جائے۔ یعنی اب دوسرا دین نہیں آئے گا مگر مسلمانوں میں آپس میں تفریق اور گروہ بندیاں ہوگی۔۔۔ مگر کوئی دوسرا دین اسلام کے مدمقابل آجائے یہ نہیں ہوگا۔۔۔ گویا مشرکین سے حجاز میں دوامی طور مقابلہ ختم ہو گیا۔

### مجوس سے اسلام کا مقابلہ

دوسرا مقابلہ مجوس سے پڑا ان کی بڑی عظیم شوکت تھی کسریٰ کی سلطنت تھی اور پورا ایران اور خراسان گویا ان کے ہاتھ میں تھا' تو حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کسریٰ کے نام فرمان لکھ کر بھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس نے آپؐ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے کر کے چاک کر کے پھینک دیا۔ جب آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا۔۔۔

"جس طرح میرا فرمان ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ خدا اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کرے"۔

یہ پیشن گوئی حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی۔۔۔ اور وہ یہ ہوا کہ کسریٰ پرویز جو ایران کا بادشاہ تھا وہ اپنے دوائی خانے میں قوت باہ کی دوا کھانے لئے گھسا۔۔۔ مگر غلطی سے وہ معجون کھا گیا جو سمی تھا اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔۔۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے حکومت کا دعویٰ کیا سرداروں نے الگ حکومت کا دعویٰ کیا' بھائی بھتیجوں نے الگ دعویٰ کیا۔۔۔ پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔۔۔ یہ پیشن گوئی فرمائی گئی تھی اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں پورا ایران اور خراسان فتح ہو گیا۔ اس طرح مجوس سے مقابلہ دوامی نہ رہا اور ختم ہو گیا۔

### یہود سے اسلام کا مقابلہ

تیسرا مقابلہ حجاز میں یہود سے مدینے اور خیبر وغیرہ میں ہوا۔ یہاں یہ لوگ آباد تھے اور دو ان کے بڑے عظیم قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے۔۔۔ جب انہوں نے پے در پے غدر کیا اور معاہدہ شکنی کی۔ تو آخر میں یہ ہوا کہ بنو قریظہ قتل ہو گئے اور بنو نضیر جلاوطن کر دیئے گئے جو مختلف بلاد میں جا کر آباد ہوئے۔ تو حجاز میں یہود سے بھی مقابلہ ابدی طور پر ختم ہو گیا۔

### عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اور اس کا انجام

اب رہ گئے نصاریٰ۔۔۔ ان کی روم وغیرہ کی طرف مستقل قوت تھی اور قیصر حکمران تھا۔ ان کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا مقابلہ ان سے ختم ہو جائے گا بلکہ یہ فرمایا۔

الروم ذوات القرون اذا هلك قرن خلفه قرن
الحرب بيننا وبينهم سجال ينالون منا وننال منهم۔

روم جو ہیں ان کے درجات و قرن اور طبقات ہوں گے ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی ایسی رہے گی جیسے ڈول رسی کو کبھی ڈول نیچے جائے گا۔ کبھی اوپر آئے گا کبھی ہم غالب، کبھی وہ غالب۔ کبھی وہ مغلوب کبھی ہم مغلوب۔

ہزار برس تک مسلمان غالب رہے، اس کے بعد ان کا غلبہ شروع ہوا۔ تین چار سو برس سے ان کا غلبہ ہے مسلمان مغلوب ہیں۔ ظہور مہدیؓ کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت مسلمان پھر غالب ہوں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ اور مغلوب بھی ایسے کہ مدغم ہو جائیں گے اور اس پر دور دنیا ختم ہے۔

غرض ان کے بارے میں دوامی مقابلہ فرمایا گیا۔ ورنہ اور کسی قوم سے دوامی مقابلہ نہیں۔ وقتی مقابلے ہوں گے لیکن یہ رہے گا کہ کبھی وہ غالب اور کبھی ہم غالب۔ ایک مجموعی طور پر اور ایک جزوی طور پر کہ کسی علاقے میں وہ غالب آگئے۔۔۔ بلقان کی ریاست میں کبھی وہ مغلوب ہم غالب، کبھی ہم مغلوب وہ غالب۔۔۔ کاغان میں کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کبھی وہ مغلوب کبھی ہم غالب۔

ٹرکی کے علاقوں میں یہی ہوتا رہا ہندوستان میں یہی رہا عراق میں یہی رہا یہ غلبہ و مغلوبیت چلتی آرہی ہے۔ آخری طور پر اس کے ختم کا نتیجہ ظہور مہدیؓ کے وقت نکلے گا اس وقت اس قوم سے بھی مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اور اقوام سے ختم ہوا۔

## مقام تجدید

جو بھی مجدد ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے علم میں ہو کہ میں مجدد ہوں مگر جذبہ تجدید تو اس میں ہوتا ہے اور عمل بھی وہ وہی کرتا ہے جو ایک مجدد کرتا ہے اور بعد میں اس کے اعمال سے کھل جاتا ہے کہ یہ مجدد تھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدد کو اپنے بارے میں معلوم ہو۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدد دعویٰ کرے کہ میں مجدد ہوں بلکہ اس کا عمل تجدید ہوتا ہے خود بخود دل میں آجاتا ہے کہ یہ دین کی تجدید کر رہا ہے سوائے اس کے جو لوگ مامور من اللہ ہوں اور ان کو اجازت دی جائے کہ تم دعویٰ بھی کرو وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن نفس مقام تجدید کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجدد کو یہ معلوم ہو کہ میں مجدد ہوں مگر کام اس سے وہی نمایاں ہوں گے جو ایک مجدد کرتا ہے۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال عدل

حضرت مہدیؓ عظیم الشان جنگ کریں گے۔۔۔ اس جنگ کی تفصیل آتی ہے۔۔۔ تین جنگیں ہوں گی۔ عظیم ترین جنگ ''ملحمۂ کبریٰ'' اس میں اتنے مقتولین ہوں گے کہ مسلمان فاتح تو ہو جائیں گے مگر ان کے لئے کوئی خوشی اور مسرت باقی نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہو گا اور حدیث میں ہے کہ ساٹھ برس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمرانی کریں گے اور ان کے دور میں اس درجہ گویا امن و امان ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہو گا۔ جیسا کے روایت میں فرمایا گیا کہ سانپ اور انسانوں کے بچے ایک جگہ کھلیں، نہ سانپ کے دل میں یہ خطرہ ہو گا کہ یہ مجھے ماردیں گے نہ انسانوں کے دل میں یہ خطرہ ہو گا یہ کاٹ لیں گے۔ نیز یہ کہ بھیڑ اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ اتنا امن ہو گا کہ بکری اپنے امن کو محسوس کرے گی، عدل کی اتنی برکات ہوں گی کہ فرمایا گیا کہ انگور کا خوشہ اتنا پھیلے گا کہ پورا گھرانہ اور قبیلہ اس سے سیر ہو جائے گا۔ ایک بکری اتنادودھ دے گی کہ پورا قبیلہ اس کے دودھ سے سیراب ہو جائے گا۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک مالدار زکوٰۃ صدقات دینے کے لئے نکلے گا تو جس کو دے گا وہ کہے گا کہ میرے گھر میں ڈھیر لگے ہوئے ہیں تو ہی آکر لے لے۔ جسے دے گا کوئی قبول کرنے والا نہیں ہو گا کہ میرے گھر میں خود بہت موجود ہے، اس درجہ گویا فراوانی اور برکات ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوں گی۔

اس لئے کہ عدل کا اثر اطمانیت ہے، اور جب قلوب میں اطمینان سا ہوتا ہے تو ہر چیز میں آدمی کو برکت محسوس ہوتی ہے۔

اسی واسطے جو بادشاہ اور حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس کی علامت ہے کہ قلوب کے اندر اطمینان سا ہوتا ہے ورنہ بے چینی رہتی ہے، ظلم میں کبھی امن و اطمینان نہیں ہوتا، عدل میں اطمینان ہوتا ہے، تو جب کسی حکومت میں آدمی محسوس کرے کہ قلب میں تسلی کی کیفیات ہیں تو سمجھ لے کہ حکمران نیک نیت ہے اور عدل کر رہا ہے۔

### عدل کی حسی برکات

اور حسی طور پر بھی اس کی برکات ظاہر ہوتی ہیں، چنانچہ ہارون الرشید کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ شکار کھیلتے ہوئے کسی جنگ میں دور چلے گئے اور فوج و لشکر سے بھی الگ ہو گئے، پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو ایک باغ نظر آیا۔ اس میں گھس گئے۔۔۔ باغ کا مالک بوڑھا تھا۔ اس سے انہوں نے جاکر کہا کہ بھئی! پانی ہو تو دو۔ وہ لباس سے اور چہرے مہرے سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے کوئی امیر ہے۔

اس نے بہت تہذیب سے بیٹھنے کو جگہ دی اور بٹھلایا۔ اور ایک انار توڑا اور اس کو دبایا تو اس کے عرق سے پورا گلاس بھر گیا۔ وہ ہارون الرشید کو پلایا وہ نہایت شیریں تھا۔۔۔ ہارون الرشیدؒ کے دل میں خیال یہ پیدا ہوا کہ اتنا عظیم باغ میرے پاس بھی نہیں۔ یہ کون امیر ہے جس کا یہ باغ ہے۔۔۔ اب جو میں جاؤں گا تو اس باغ پر قبضہ کروں گا۔ یہ باغ بادشاہ کے لئے مناسب ہے، غیر بادشاہ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مجھے قیمت دینی پڑے یا دباؤ سے لینا پڑے مگر باغ میرے پاس آنا چاہئے۔

پھر کچھ ستائے اور آرام کیا۔ اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو مالی سے کہا کہ بھئی! پانی اور پلاؤ۔ اس نے پھر ایک انار توڑا اب وہ اس کو خوب دباتا ہے مگر آدھے سے زیادہ گلاس بھرتا ہی نہیں۔۔۔ ہارون الرشیدؒ نے کہا۔ درخت بھی وہی ہے۔ انار بھی وہی ہے۔ یہ کیا بات ہے گلاس بھرتا کیوں نہیں۔۔۔؟ اس بوڑھے مالی نے کہا کہ۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت کی نیت میں فرق آیا ہے"۔

ہارون الرشید سمجھ گیا۔ بادشاہ تو وہ خود ہی تھا۔ فوراً اپنے دل میں توبہ کی اور استغفار کیا۔ اور کہا کہ اے اللہ! میں مجرم ہوں۔ میں ہرگز قبضہ نہیں کروں جس کا باغ ہے اسی ہی کو مبارک رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو بقیہ عرق تھا وہ بھی نکل آیا اور گلاس بھر گیا تو بوڑھا کہتا ہے معلوم ہوتا ہے بادشاہ وقت کی نیت درست ہو گئی۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس قدر بشاشت وطمانیت اور اس قدر برکات کا ظہور ہوگا کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان میں بھی دشمنی کا احساس باقی نہیں رہے گا۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاء سبعہ

یہ جو کلی خیر و برکت کا زمانہ ہے یہ چالیس برس رہے گا۔ اور اس چالیس برس میں عیسیٰ علیہ السلام کے سات خلفاء حکمرانی کریں گے۔۔۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ فساد کی طرف زمانہ بڑھتا جائے گا۔ جب ساتویں خلیفہ نمایاں ہو کر ختم ہوں گے اب گویا فساد کا غلبہ شروع ہوگا اور پھر اتنا غلبہ ہوگا کہ لوگ اس درجہ پر آجائیں گے کہ "شر محض" رہ جائیں گے اور ایمان والے گنے چنے ہوں گے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر پناہ لیں گے۔ شہروں میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہو گی۔۔۔ یہ گویا بالکل قرب قیامت کا وقت ہوگا۔ اور یہ علامت ہو گی کہ اب اس کائنات کے خیمہ کو ختم کرنا اور فنا کرنا ہوگا۔

## دابۃ الارض

اسی وقت دابۃ الارض ظاہر ہو گیا "نار حجاز" ظاہر ہو گی جو منتشر جگہ سے ہنکا کر مومنوں کو ایک سمت میں لے آئے گی، دابۃ الارض کا جو خروج ہوگا تو یہ عجیب شکل وشباہت کا جانور ہوگا کہ چہرہ انسانوں جیسا اور ہر جانوروں کی شباہت اس میں ہو گی۔ یہ نشان بناتا جائے گا۔ مومن کے چہرے پر مومن اور کافر کے چہرے پر کافر کا۔

پھر ایک وباء بھیجی جائے گی جس سے دو تین دن کے اندر اندر جتنے ایمان والے ہوں گے سب ختم ہو جائیں گے اور انتقال کر جائیں گے۔

### جن پر قیامت قائم ہوگی

اب شرار الخلق باقی رہ جائیں گے۔ جو شر محض ہوں گے ان کی شان فرمائی گئی نہ ان کا کوئی دین ومذہب ہوگا۔

**لا یعرفون معروفاً ولا ینکرون منکراً**

نہ اچھے برے کی تمیز باقی رہے گی۔ گدھے، کتے کی طرح سے سڑکوں پر بدکاریاں کرتے پھریں گے۔ کوئی انسانیت کی حس نہیں ہوگی محض شہوانی جذبات ہوں گے ان پر قیامت قائم ہوگی، یوں عالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

### عالم کی بنیاد

اس سے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ عالم ذکر اللہ سے تھما ہوا ہے۔ ایک بھی جب تک اللہ اللہ کہنے والا رہے گا۔ عالم مٹنے والا نہیں ہے۔ غرض عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب روح نکل جائے گی تب لاش بن کے پھولے گا، پھٹے گا اور سڑے گا۔ اس سے پہلے نہیں حدیث ہے ۔

**لاتقوم الساعة حتی یقال فی الارض اللہ اللہ۔**

قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا عالم میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا اب شر محض رہ جائے گا۔ اس وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔

### قبولیت بعدد

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جہاں چالیس آدمی جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک ان میں مقبول ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجے کی بھی قبولیت ہو۔ تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں کوئی بھی مقبول نہ ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبولین ہوں گے۔

### کیا اہل دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟

دیکھئے آسمان میں جانے کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔ نہ شرعی اصول اس کی اجازت دیتے ہیں نہ یہ واقعہ ہوگا۔ آسمان سے نیچے فضا ہے۔ یہ اس دنیا کا دائرہ ہے۔ تو دنیا والے اپنے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اپنے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ آسمان کا دائرہ وہ انسانوں کا دائرہ نہیں ہے۔ وہ ملائکہ کا دائرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔۔۔ پھر شریعت نے آسمانوں کے دروازے بتلائے ہیں ان پر بڑے مستعدد ربان ہیں۔ جن میں مقبولین کو بھی بغیر اجازت کے جانے کی صورت نہیں بنتی۔

جناب رسول ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو دروازے بند تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے گویا دروازہ کھٹکھٹایا تو بواب کی طرف سے اندر سے یہ جواب آیا۔

من انت.

”تم کون ہو؟“۔

حالانکہ جبریل علیہ السلام سید الملائکہ ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے۔۔۔پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔اس لئے پوچھا گیا۔

من انت.

”تم کون ہو؟“۔

فرمایا جبریل۔

پھر پوچھتے ہیں

ومن معك؟

اور ساتھ کون ہیں؟“۔

یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے علم میں ہے کوئی ساتھ آرہا ہے اور وہ نبی کریم ﷺ ہیں۔۔۔ لیکن ادائے فرض میں اتنی مستعدی کہ یہ پوچھا کہ ساتھ کون ہیں؟۔۔۔جبریل علیہ السلام نے کہا۔ محمد ﷺ۔۔۔۔۔۔۔

پھر یہی نہیں کہ دروازہ کھول دیں۔ تیسرا سوال اور کیا گیا۔

بلائے ہوئے آرہے ہیں یا ویسے ہی خود بخود آگئے ہیں؟

تو حضرت جبریلؑ نے جواب دیا۔

وقد ارسل اليه ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں۔۔۔تب دروازے کھولے گئے اور کہا گیا۔

مرحبا بکم نعم المجیئی جاء۔

”بہترین آنا ہے جو آپ آئے۔خوش آمدید“۔

جب مقبولین کے لئے آسمان میں جانے میں اتنی پابندیاں ہیں تو مردودین وہاں کیسے جائیں گے؟ وہ خود بخود ہی پہنچ جائیں گے؟

## سیارات کا تعلق اہل دنیا سے ہے

اس کی بنا یہ ہے کہ جو اس دنیا میں بسنے والے انسان ہیں وہ اپنی دنیا کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن دنیا کے دائرے سے نکل کر ایک دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے اس عالم میں یہ دخل نہیں دے سکتے۔رہے ستارے.تو وہ اس دنیا کے عالم میں ہیں اس لئے کہ قرآن کریم نے فرمایا گیا۔

اِنَّازَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ.

آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ یہ ستارے اس آسمان کی زینت ہیں۔ اور زینت ہمارے لئے بنائی گئی۔ یہ زینت جبھی ہو سکتی ہے جب یہ ستارے آسمان کی نچلی سطح سے نیچے ہوں۔ اگر اوپر کی سطح پر ہوتے تو ہمارے لئے زینت نہ بنتے۔

معلوم ہوا یہ ستارے زمین ہی سے متعلق ہیں۔ سورج اور چاند جو گردش کرتے ہیں یا یہ رات اور دن یہ دنیا ہی کے لئے ہیں۔ آسمانوں اور جنتوں کے لئے تو رات اور دن نہیں ہیں۔ یہ رات دن کی گردش اس دائرہ دنیا کے اندر ہے اور اس کا تعلق ان سیارات سے ہے۔ یا مثلاً جڑی بوٹیاں ہیں۔ تو ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی ستارے کی تاثیر ہے جس سے وہ دفعیہ امراض میں مؤثر ہوتے ہیں گل بنفشہ میں فلاں خاصیتیں ہیں۔ وہ جب جڑی بوٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ویسی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ویسے ہی امراض کا دفعیہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارے ستارے گویا ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا

وَبِالنَّجمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ.

"ستارے سے ہی لوگ راستے پاتے ہیں"۔

یہ جہاز رانی کا فن ستاروں ہی کے ذریعے سے ہے۔ سمندروں میں سڑکیں تو نہیں ہوتیں۔۔۔ ستاروں سے سمتیں متعین کر کے جہازوں کو چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ستارے ہمارے لئے بنائے گئے ہیں دائرہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسمان سے تعلق نہیں ہے۔ آسمان کی چھت میں جس طرح سے بھی لٹکا دیئے گئے ہیں۔ غرض جب یہ دنیا سے متعلق ہیں تو دنیا والوں کا ان تک پہنچنا ممکن ہے لیکن اپنی دنیا کے دائرے سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ جائیں۔ انسان میں یہ طاقت نہیں ہے۔ دعوے کوئی کتنے ہی کرے' اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے چاند' سورج اور مشتری میں چلے جائیں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے جلدی چلے جائیں تاکہ زمین میں کچھ فساد کم ہو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے؟

### توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت

حدیث میں آتا ہے کہ آفتاب جب مغرب سے طلوع کرے گا اور نصف النہار تک آئے گا اور پھر لوٹ جائے گا اور معمول کے مطابق طلوع کرے گا' جب یہ آیت کبریٰ ظاہر ہو جائے گا تب توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے ایمان لانے سے مقصود قلوب کی آزمائش ہے۔ اور جب اتنی نمایاں خرق عادت ظاہر ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد آزمائش کا موقع نہیں گا اب تو وہ چیزیں سامنے آگئیں جن کی خبریں دی جا رہی

تھیں جن کو محض پیغمبر کے اعتبار پر ماننا چاہئے تھا۔ مشاہدے سے مانا تو اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ پیغمبر کے اعتماد پر ماننا چاہئے۔ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ آنکھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ماننا کہ پیغمبر غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایمان ہے۔ تو اپنی عقل سے کسی چیز کو سمجھ لینا یہ ایمان نہیں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ میں ایمان لے آیا کہ دو کا دو گنا چار ہوتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہتے۔ یہ تو قضیہ عقلیہ ہے۔

## التفات حقائق کا اسلام موضوع ہے

اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو، حقائق کی طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔۔۔ اسی واسطے تصویر کی ممانعت فرمائی گئی، ہو سکتا تھا کہ اس زمانے میں بھی مصور ہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک رکھتے ہوں۔ مگر ممانعت فرما دی گئی کہ صورتوں میں الجھ جائیں گے اور حقیقت رہ جائے گی، اس لئے مسلمانوں کو صورتوں سے ہی الگ رکھا ہے۔ آج کل سب کچھ مظاہرہ اور نعروں میں آگیا ہے حقیقت گم ہو گئی۔

## ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ

(ہندوستان میں) سارے مسلمان اکٹھے ہو گئے اور یہ طے پایا کہ مشترک معاملات میں مل کر متفقہ طور پر گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنی خصوصیات ہیں وہ آپ اپنے گھروں میں انجام دیں۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے گا۔ لیکن جب گورنمنٹ کے سامنے آئیں تو مل کر آئیں اور وہ یہ نعرہ ہو کہ پرسنل لاء اور عائلی قوانین میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ نہ گورنمنٹ کو نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کو۔۔۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرا گاندھی کو اعلان کرنا پڑا کہ۔

"ہم کوئی دخل دینا نہیں چاہتے۔ مسلمان چاہیں کہ دخل دو، تب ہم دخل دیں گے"۔

ہم نے کہا وہ مسلمان کون ہے جو چاہے گا۔ سب تو یہاں آگئے، سب کے نمائندے یہاں جمع ہیں۔ شیعہ وسنی بھی، اہلحدیث بھی۔ اب وہ کون سے مسلمان ہیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب دب دبا گئے اور وہ جو نعرے لگا رہے تھے کہ ترمیمات ہوں گی سب چپکے ہو کے بیٹھ گئے۔

## دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ

اس موقع پر ہم نے بریلوی حضرات سے بھی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بھی آئیں عام طور پر وہ مذہبی معاملات میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے نہیں۔۔ مگر اس موقع پر شریک ہوئے۔ اس لئے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ

اگر ہم نہ گئے تو سب نکٹو کہیں گے اور ہماری بات گر جائے گی تو اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔۔۔ سب سے بڑے مفتی، مفتی برہان الدین صاحب جو جبل پور کے رہنے والے ہیں وہ آئے۔۔۔ مجھے اس موقع پر صدر بنادیا تھا۔ میں نے انتہائی ان کی آؤ بھگت کی، جب وہ تشریف لائے تو بیس قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا، ہر پانچ منٹ کے بعد پان پیش کرنا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چائے پیش کرنا۔ اور ان کی باتیں بھی بڑی عقیدت کی نگاہ سے سنیں کہ جو سچی بات کہے اسے ماننا چاہئے۔۔۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔

جب جلسہ ختم ہوا تو انہوں نے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ حج کے لئے جانے والے ہیں؟

میں نے کہا ارادہ تو ہے۔۔۔ انہوں نے کہا

"روضۂ اقدس پر میرا سلام عرض کر دینا"۔

میں نے کہا انشاء اللہ ضرور عرض کروں گا۔

خیر میں نے کہا تکفیر تو ختم ہوئی۔ کسی کافر کے ذریعے روضہ اقدس پر کوئی تھوڑا ہی سلام پہنچتا ہے

غرض ملنے سے بھی سینکڑوں شبہات رفع ہوتے ہیں۔ بہت سے منافع ان کے ہاں ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ اور بہت سے منافع ہمارے ہاں ہیں جن سے وہ محروم ہیں، ملیں گے تو ایک دوسرے سے فائدہ تو اٹھائے گا۔

## باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں

یہ باہمی نفرتیں پیدا کرنا یہ اسلام کا ذوق نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ.

"یہ کفار جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو بھی برامت کہو کہ وہ چڑ میں آکر تمہارے بڑوں کو برا کہیں۔ اس لئے انہیں بھی گالی مت دو"۔

اب یہاں گالم گلوچ بھی ہے اور یہ کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ وہ ایسا وہ ویسا۔

تو اسلام کا یہ ذوق ہی نہیں۔ یہ ایک مصیبت ہے۔ بس جہل عام ہے۔ آدمی دین کچھ پڑھے لکھے تو ذوق پیدا ہو اور پتہ چلے، بس بھیڑ چال ہے، جس نے جو رسم ڈال دی اور دو تین برس کی بعد وہی دین کا جز بن گیا۔

## رسوم کا غلبہ

چنانچہ میرا امریکہ جانا ہوا تو۔۔۔ قوم کے کچھ لیڈر ملنے کے لئے بیچارے نیک طینت اور نو مسلم آئے۔۔۔ میں نے حسب معمول پان کھایا۔۔۔ وہ یوں سمجھے کہ کوئی دینی چیز ہے۔ کہنے لگے اب ہم سب پان کھایا کریں گے اور ڈبہ بٹوہ رکھیں گے۔ میں نے کہا! یہ کوئی دینی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک عادت کی بات ہے۔ ایسا مت کرنا۔ اتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں اب اگر وہ پان کا ڈبہ رکھتے اور اسے دین سمجھ کر رائج کرتے تو ان میں یہ رائج ہوتا کہ پان کھانا دین اسلام

کارکن ہے اور جو نہیں رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لئے وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

## اختلافی مسائل کا آسان حل

ورنہ اگر مسائل میں نگاہ ہو تو قرآن کریم کا صاف حکم ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

اگر تم میں تنازع ہو تو اللہ ورسول کو حَکَم بنا کے رجوع کرو' صحابہؓ کا عمل موجود ہے' رجوع کرو۔۔۔ جب وہ عمل پیش کیا جائے تو کہتے ہیں' صاحب! یہ تو سر آنکھوں پر ہے۔ مگر رواج یہی ہے۔ تو رواج پر چلیں گے۔ نہ صحابہؓ کے تعامل پر' نہ نبیؐ کے تعامل پر' اس کا کوئی علاج نہیں۔ بس جہالت ہے اور اسلامی ذوق نہیں ہے۔

## بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں

اب مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں۔۔۔۔ ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی مجلس میں ۔۔۔ غالباً خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ

"احمد رضا یوں کہتا ہے"۔

بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا۔

عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کیا حق ہے؟

کیوں نہیں تم نے مولانا کا لفظ کہا؟

غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا۔۔۔ بہر حال تو اس طریق پر ہیں کہ قطعاً ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے کافر۔ فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو خلاف سنت امور ہیں۔ انہیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں۔ خلاف سنت ہیں انہیں ترک کرو لیکن کرنے والے کی توہین کریں۔ یہ نہیں ہے۔

## مولانا احمد رضا خان صاحبؒ دیو بند کے فیض یافتہ ہیں

مولانا احمد رضا خان دیو بند کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ وہ اس طرح کہ مولانا محمد یسٰین صاحب رحمہ اللہ علیہ جنہوں نے بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم قائم کیا یہ ان کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں مگر اسے ظاہر نہیں کرتے۔۔۔ اور ابتداء ابتداء میں مولانا محمد یسٰین صاحبؒ کو مولانا احمد رضا خانؒ جو خط لکھتے تو نہایت تعظیم سے لکھتے' ایسے جیسے کوئی ایسے شیخ کو لکھ رہا ہے۔۔۔۔ بعد میں ان کے خیالات بدلے۔ کیا بات پیش آئی' وہ اللہ ہی جانے۔ پھر تو کافر سے ورے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

## اپنے کام سے کام

ہم تو یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم مولانا احمد رضا خان صاحب کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں نہ کبھی کہا۔۔۔ دار العلوم میں آپ آ کے دیکھیں کوئی ذکر یا چرچا ہے ہی نہیں۔ کون بریلوی اور کون وہ۔ سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ادھر دیکھو تو ابجد کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ وہ کافر' وہ کافر' وہ فاسق۔۔۔۔ وہاں کفر و اسلام کا یہ قصہ نہیں۔ سب تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ برسہا برس نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اپنا مشغلہ ہی بہت ہے' کہاں اس جھگڑے میں پڑیں کہ فلاں کافر' فلاں کافر۔ ہو گا وہ ہمیں اس سے کیا؟

وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

لعمری ان فی ذنبی لشغلاً
بنفسی عن ذنوب بنی امیہ

میرے اتنے گناہ ہیں کہ مجھے شمار کرنے کے فرصت نہیں۔ بنی امیہ کے گناہوں کو کہاں شمار کروں۔۔۔؟ برسوں نام بھی نہیں سنیں گے۔ کون ہے بریلوی اور کون ہے رافضی۔۔۔؟

## مسجد دھلوانے کا قصہ

بمبئی میں یہ کیفیت تھی کہ کوئی دیو بند والا مسجد میں چلا جائے تو مسجد دھلوائی جاتی تھی' حالانکہ مسجد نبوی ﷺ میں کفار آتے تھے لیکن دھلوائی کبھی نہیں گئی' جب کہ وہ صحیح کافر تھے۔ اس لئے کہ نجاست اعتقاد کی ہے' بدن کی نجاست نہیں ہے۔ جو مسجد آلودہ ہو۔

پھر بمبئی میں جانا آنا ہوا۔ اب قصہ برعکس ہو گیا' ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی جو معتدل ہے اور ان خرافات کو سمجھ گئی۔

## حضرات دیو بند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم

پیر مہر علی شاہ صاحب نے دیو بند سے کوئی استفادہ نہیں کیا' مگر دیو بند کے لوگ ان کے معتقد تھے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ ان سے بڑی عقیدت سے اور بڑی نیاز مندی سے ملتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ایک تو کچھ رسوم ہیں۔ ان بزرگوں میں اگر کوئی رسم بھی ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہم بھی کریں گے۔۔۔ لیکن دوسروں کی تکفیر نہیں کرتے اور برا بھلا نہیں کہتے۔ چونکہ ان میں اخلاص تھا اس لئے دیو بند کے حضرات بھی ان سے عقیدت سے ملتے تھے۔

## ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات

ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ مولانا خیر محمد صاحبؒ نے

خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا' یہاں کوئی بزرگ کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں۔۔۔ انہوں نے کہا۔ مولانا محمد بخش صاحب ہیں اور بریلوی فرقے کے ہیں۔۔۔ میں نے کہا ہم انہیں فرقہ نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ' نہ وہ فرقے۔۔۔ مولانا عبدالخالق صاحبؒ نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملو گے۔۔۔ میں نے کہا خلاف کا وقت آئے گا خلاف بھی کریں گے۔ اور وہ مسئلہ کی بات ہوگی لیکن ملنے میں کیا حرج ہے۔

ان سے چھپ چھپا کر' میرے ساتھ حافظ شریف احمد تھے' مغرب کے وقت اُن کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہ مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لوٹے میں برف کا پانی بھی رکھا ہوا تھا۔

کسی نے میرے آنے کی انہیں اطلاع کر دی۔۔۔ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اس پانی کے لوٹ کو منہ سے لگا کر پہلے خود پیا اور مجھے کہا تم بھی پیو' میں نے پانی پیاء۔

اس کے بعد کہنے لگے' دیوبند کے بزرگوں کے کچھ احوال تو سناؤ میں نے وہاں کے بزرگوں کے حالات سنائے۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا' مگر ایک کو تو وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ واپس چلا آیا اور ایک البتہ سال رہا۔ مگر امتحان سے پہلے وہ بھی چلا آیا۔ خدا جانے کیا مجبور پیش آئی۔۔۔ بہر حال ان کے گھرانے سے تکفیر نکل گئی۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو۔ اپنی رائے ہے۔ اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہیں۔ تو اس پر عمل کریں' لیکن نفرتیں پیدا کرنا یہ صحیح نہیں۔

## سنت و بدعت کا تاثیری امتیاز

مگر مشکل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا۔

**ما اوتی قوم بدعة الا او توا الجدل.**

جس قوم میں بدعت آئے گی اس میں دنگا فساد اور جھگڑا ضرور آئے گا۔ یہ بدعت کا خاصہ ہے۔ سنت میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سنت تو ایک ہی ہے جس کا جی چاہے عمل کرے اور بدعات ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ تو بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اصل دین ختم ہو جائے گا۔ نزاع و جدال اور گروہ بندی و پارٹی بازی یہ شروع ہو جائے گی۔

## تقسیم ہند کے بارے میں علمائے دیوبند کا اختلاف

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو کانگریس کے کٹر قسم کے حامی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس میں خون خرابے مچیں گے۔ اور مسلمان ادھر سے ادھر ہو جائیں گے۔ تو جانیں تلف ہونگی۔ اور اسی طرح کے دیگر مصالح ان کی

پیش نظر تھے۔

لیکن یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو فرمایا اب اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں' اب ہماری آبرو اسی میں ہے کہ وہ قوی ہو اور مضبوط رہے یہ تو ان کا حال ہے' جو مخالف تھے۔

اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ حضرت تھانویؒ دیوبندی نہیں تھے؟ مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ یہ سارے پاکستان کے حامی تھے۔ تو یہ کہ دینا کہ دیوبند مخالف تھا۔۔۔ رائیں ہوتی ہیں' کسی کی کچھ' مگر بن جانے کے بعد مخالفین کی رائیں بدل گئیں کہ اب ہم کس قسم کا نزاع یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو ہماری عزت اس میں ہے کہ پاکستان قوی اور مضبوط ہو۔

دیوبند کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اشخاص کے اندر اختلاف تھا' دیوبند تو ایک ادارہ ہے وہ نہ لیگی نہ کانگریسی' ہمیشہ غیر جانبدار رہا۔ تو دیوبند اور چیز ہے۔ افراد اور چیز ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حامی تھے اور حامی ہونے کی بناء یہ تھی کہ یہ نعرہ لگایا جارہا تھا کہ ہمیں ایک اسٹیٹ چاہئے جس میں اسلامی قوانین جاری کرسکیں' سارے مسلمان اس کے حامی تھے کہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔۔۔ تو جس نے رائے دی یہ سمجھ کر دی کہ وہاں اسلام رائج ہوگا۔

دوسرے حضرات کی رائے یہ بھی کہ یہ ہوگا نہیں اس لئے کہ جو لوگ بناء رہے ہیں انہیں خود دین سے مناسبت نہیں ہے' وہ نیک نیتی سے بھی چاہیں کہ اسلام رائج ہو' تب بھی نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے کہ ان کے اندر اسلامی ذوق ہی نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ جب ملک تقسیم ہوگا تو یہ بھی ہوگا کہ کچھ لوگ ادھر آئیں کچھ لوگ ادھر جائیں اس میں خون خرابے بھی مچیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو خون کے دریا نظر آتے ہیں۔

اور یہ ہوا۔۔۔ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔۔۔ لاکھوں مسلمان عورتوں کی آبرئیں بھی لٹیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ تو یہ چیزیں ان کے پیش نظر تھیں جس کی بنا پر ان حضرات کی رائے تھی کہ نہ بننا چاہئے۔

اور جن کی رائے تھی کہ بنے تو وہ اس پر تھے کہ جب ایک اسٹیٹ بنے گی اس میں اسلامی قانون جاری ہوگا۔ تو زیادہ نہ سہی پورے ہندوستان میں ایک جگہ تو اسلامی اسٹیٹ ہو جائے۔ ان کی نگاہ اس پر تھی۔

اور ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ ملک مضبوط ہو اور ہم وہاں بیٹھ کر دعاء ہی کرسکتے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔؟

اور اس کے متمنی ہیں کہ اس ملک کو سب متفق و متحد ہو کر ملک سنبھالیں' اللہ نے جب ایک

ملک دیدیا ہے' باہمی لڑائی سے اسے ختم نہ کریں اور ان لوگوں سے عبرت پکڑیں جن میں نزاع ہوا۔ اور تیسرا آکر غالب ہوا۔ افغانستان میں یہی ہوا کہ بیس پارٹیاں خلاف میں کھڑی ہوگئیں' باہمی نزاع ہوا۔ توروس نے آکر غلبہ پایا' اسی طرح سے اور جگہوں پر بھی ہوا کہ جب باہمی نزاع ہوا تیسرا غالب۔

## مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے

ملک ابن سعود کا ایک مقولہ ہے جب ان سے کہا گیا کہ یہود بڑی قوت پکڑتے جارہے ہیں اور ممالک اسلامیہ کے لئے خطرہ بڑھ رہا ہے۔۔۔ ملک نے جواب دیا۔

"ساری دنیا کے یہود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں مجھے ذرہ برابر فکر نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم ہی آپس میں لڑو گے اور غیروں کو موقع دو گے کہ وہ آکر غالب ہوں اور دخل دیں"۔

غرض یہ واقعہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت تباہ ہوئی ہے باہمی نزاع اور باہمی رقابتوں سے تیسرے کو موقع ملا۔ اور دوسری قومیں ہمیشہ اس کی ساعی رہی ہیں کہ ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب وہ جائے تو پھر غالب آجاؤ۔

## حضرت امیر امعاویہ رضی اللہ عنہ کا کلب روم کو جواب

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جب جنگ ہوئی تو قیصر روم کا پیغام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ ؎

"میں نے سنا ہے کہ علی تمہارے مقابلے پر ہیں اور میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ فوجی مدد' مالی مدد"۔

اس کا مقصد یہ کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مغلوب کرو اور جب مغلوب جو کر ختم ہو جائیں تو انہیں بھی مغلوب کر دینا آسان ہوگا۔ یہ د گویا اس کی ذہنی کیفیت تھی۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب لکھا ؎

اس میں لقب لکھا الی کلب الروم رومی کتے کی طرف یہ خط پہنچے اور لکھا کہ۔

"تو یہ سمجھتا ہے کہ میں علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہوں۔ میرا ان کا اختلاف مسئلہ کا اور حجت کا اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف نہیں ہے' اگر تو نے یہاں آ کے قدم رکھا تو میں علی رضی اللہ عنہ کا ادنیٰ سپاہی ہو کر تجھ سے جنگ کروں گا"۔

اور اس کی ساری امیدیں ختم کر دیں۔۔۔ اور اگر وہ معاذ اللہ دب جاتے وہ قیصر ہی غالب آتا۔ اسی کی حکومت ہو جاتی۔

## غیر قوموں کا طریق واردات

غرض ان قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ پہلے ملک میں اور قوم میں تفریق ڈالوتی ہیں اور سینکڑوں معاملات میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے اخوت اسلامی سکھلائی تھی کہ مشرق ومغرب کے مسلمان ایک ہوں۔

انہوں نے کیا کیا۔۔۔۔وطنیت کا رشتہ الگ ڈالا۔ اب جغرافیائی خطوط پہ لڑائی کرائی' نسلیت کا رشتہ الگ ڈالا کہ گورے الگ اور کالے الگ' غرض اس قسم کے سینکڑوں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اور لوگوں کو لڑا رہے ہیں جغرافیائی خطوط پر کہیں لڑ رہے ہیں' کہیں رنگ ونسل کے مسئلہ پر لڑ رہے ہیں' کہیں زبان کے مسئلے پر لڑ رہے ہیں۔۔۔ لیکن وہ جو اصل وحدت کی بنیاد تھی اس کو سب چھوڑے ہوئے ہیں جس میں سارے مسلمان ایک ہوتے ہیں۔

ایک تو اختلاف آراہوتا ہے اور حجت کا اختلاف ہوتا ہے وہ علماء وعقلاء میں آرہا ہے وہ مضر نہیں ہے اس اختلاف کو نزاع وجدال اور جھگڑے پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ مضر چیز ہے۔ یہ جذبات کا کام ہے۔ مسئلہ کا کام نہیں ہے مسئلہ لڑائی نہیں سکھلاتا۔ ہم مسئلہ کو آڑ بناتے ہیں اور جذبات اپنے نکالتے ہیں پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

## اجلاس صد سالہ

اجلاس صد سالہ کو "جشن" کہنے سے ہم ہر جگہ احتیاط کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے جشن کا نام نہ دیا جائے۔ یہ ایک دستار بندی کا اجلاس ہے جبکہ جشن ایک رسم ہے۔

دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ میں شرکت کے لئے یہاں کے لوگوں کا کام ہے کہ وہ صدر پاکستان سے ملیں اور اس کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ پھر جو وہ فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے۔۔۔ معلوم ہوا ہے ایک وفد ان سے ملا ہے تو انہوں نے پانچ سو آدمی کی اجازت دیدی ہے۔۔۔ ان پانچ سو کا انتخاب کرنا بھی یہاں کے لوگوں کا کام ہے۔

## گروہی خصوصیت کی دعوت کا نقصان

دعوتیں مختلف ہوگئیں۔ اپنی اپنی خصوصیات کی لوگ دعوتیں دیتے ہیں اور اسے اسلام پکارتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سب سے زیادہ بلند چیز ہے جماعتی خصوصیات کا نام اسلام تھوڑا ہی ہے۔ ہر شخص اپنی گروہی خصوصیات کو اسلام کے نام سے تعبیر کرتا ہے اسلام کو مسلمانوں سے خطرہ ہے اور کسی سے نہیں ہے۔

## اسباب اتحاد

دوسرے میں نے ہر جگہ کہا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اتحاد اتفاق کی ضرورت ہے۔ سب مل کر باہم متحد ہو کر اپنے ملک کو مضبوط بنائیں۔

اور یاد رکھئے! اتحاد جو قائم ہوتا ہے کبھی تو وہ قوت عقیدت سے قائم ہوتا ہے کوئی ایک بزرگ شخص ہے لوگ اس پر جمع ہو گئے۔ ان میں باہمی اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ کوئی عالم ربانی یا شیخ طریقت ہے۔ اس کے متوسل جمع ہو جاتے ہیں۔ مرکز ایک ہو گیا۔ مگر وہ اتحاد محدود ہوتا ہے۔

ایک قوت قہری یعنی حکومت کی قوت ہے وہ بھی ایک مرکز پر جمع کرتی ہے۔۔۔ اس لئے میں نے کہا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں اور اتفاق کریں اور حکومت کو مضبوط بنائیں۔ اور بیرونی خطرات پہ نگاہ رکھیں۔۔۔ اس لئے کہ آپ کے اختلاف سے غیروں کو دخل اندازی کا موقع ملے گا۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سارے مسلمان متحد ہو کر ملک کو اور حکومت کو مضبوط کریں۔

## عشرہ فنڈ

میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفاو کرامۃً) میں حاضر ہوں۔ اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آدمی میرے پاس پہنچا، اور اس نے دس روپے دیئے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارسال فرمائے ہیں کہ یہ دارالعلوم میں داخل کر دیئے جائیں۔۔۔۔ میں نے اس آدمی سے عرض کیا کہ یہ زکوٰۃ ہے یا عطیہ؟ اس نے کہا یہ عطیہ ہے۔ خواب ہی میں یہ بات دل میں جم گئی کہ میں اس مبارک رقم کو اجلاس صد سالہ کے سلسلہ میں داخل کروں گا۔

چنانچہ صبح کو میں نے یہ مفصل خواب لکھ کر اور دس روپے کا نوٹ نتھی کر کے دفتر اجلاس میں بھیجوا دیا۔ وہاں شہر کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو خواب سنا تو بہت سے لوگوں نے کسی نے ماں کی طرف سے، کسی نے بیوی کی طرف سے، کسی نے بہن کی طرف سے دس دس روپے دیئے، جس سے دو ڈیڑھ سو روپے جمع ہو گئے، اس کے بعد گھر میں تذکرہ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو میاں سالم، اسلم اور اعظم تینوں نے ایک ایک بچے اور ایک ایک عورت کی طرف سے دس دس روپے دیکر دو سو سے کچھ زائد انہوں نے جمع کر دیئے۔۔۔ پھر طلباء میں چرچا ہوا تو کچھ طلباء میرے پاس آئے کہ اس قسم کے خواب کا چرچا ہے۔ اس کی کیا اصلیت ہے؟ طلباء چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ طلباء کا اجتماع ہوا ڈیڑھ دو ہزار طلباء جمع ہوئے۔ اور میں نے خواب بیان کیا۔ پھر جو پیسوں کی بارش ہونا شروع ہوئی حالانکہ بے چارے غریب اور غریب الدیار طلباء مگر چودہ سو روپے انہوں نے اسی مجلس میں جمع کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہاتھ کی گھڑی اتار کر مجھے دے دی۔۔۔ اب شہر میں یہ چیز پھیلی جو آرہا ہے دس روپے کا نوٹ لئے آرہا ہے صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی برکت ہے کہ نام آتا ہے تو لوگ اڈ پڑتے ہیں۔ اور عشرہ فنڈ میں خوب پیسہ جمع کراتے ہیں۔

اس پر میں نے دفتر اجلاس کو لکھا کہ جتنی بھی رقم آئے وہ حضرت ام المومنین رضی اللہ

تعالیٰ عنہا کی طرف سے داخل کی جائے اور دینے والے کا نام معرفت میں لکھ دیا جائے کہ معرفت فلاں کی اور من جانب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔۔۔ اس طرح بہت سارو پیہ جمع ہو گیا۔۔۔ اس کے بعد میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ یہاں بھی خواب کا چرچا ہے۔ وہاں بیان کیا تو کوئی چھ سات ہزار روپیہ لوگوں نے دس دس روپے دیکر جمع کر دیا۔۔۔ تو میں نے کہا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لاکھوں روپیہ دے سکتی تھیں مگر دس روپے اس لئے دیئے کہ ہر ایک کو دس دینے آسان ہیں۔ اور سو، ہزار دینے مشکل ہیں۔ اس لئے دس روپے عنایت فرمائے۔ تو اس کا نام ہم نے "عشرہ فنڈ" رکھ دیا۔ اس کا یہاں پاکستان میں لاہور میں ذکر ہوا تو یہاں لوگوں نے دینا شروع کیا۔ اب تک "عشرہ فنڈ" میں پندرہ، سولہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے یہ اس خواب کی حقیقت ہے

**عطیۂ رحمت** اسی طرح دو روپے کے بارے میں یہ ہے کہ الٰہ آباد کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب انہوں نے خواب دیکھا اور مجھے خط لکھا۔

> "مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپؐ نے مجھے دو روپے عنایت فرمائے اور میرا نام لیا کہ اس کے پاس بھیج دو کہ دارالعلوم میں داخل کرے، ایک صد سالہ اجلاس کے فنڈ میں داخل کرے۔۔۔ چنانچہ وہ خود لے کر پہنچے"۔

میں نے اس پر کہا۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ تو ایک دو روپیہ اس لئے رکھا کہ ہر شخص کو دینا آسان ہے۔

**انفاق محبوب کا التزام** اگر خرچ کرو تو محبوب ترین چیز خرچ کرو، محبوب چیز ہو۔ یہ نہ ہو کہ جسے اپنے نزدیک ردّی سمجھ رکھا ہے اسے اللہ کے نام پر دیدو، اچھی چیزیں خود رکھو۔ غرض دو وہ محبوب چیز ہو۔۔۔ یہ نہیں فرمایا جو محبوب چیز ہو وہی دو۔۔۔ اس سے لزوم ہے کہ جو دو وہ محبوب ہو۔ جو محبوب ہو وہ سب کچھ دیدو یہ نہیں ہے۔۔۔ کسی کے پاس اگر دس چیزیں ہیں اور وہ محبوب ہیں ایک چیز دے دے وہ بھی کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ دس کی دس دیدے ترغیب پر عمل کرے گا درجات ملیں گے۔ امر نہیں ہے کہ اگر نہیں دے گا تو گنہگار ہو گا۔

## نعمائے جنت

جنت میں جو نعمتیں ہیں وہ، وہ ہیں کہ:۔

لاعین رات۔۔۔ نہ کسی آنکھ نے دیکھی۔۔۔ ولا اذن سمعت۔۔۔ نہ کسی کان نے سنی۔۔۔ ولا علی قلب بشر خطر۔۔۔ نہ کسی قلب پر ان کا خطرہ گزرا۔۔۔ اس لئے کہ آدمی نے دیکھا تو ہے نہیں جو کچھ سمجھے گا عقل سے سمجھے گا۔ تو یہ سمجھے گا کہ جیسی دنیا میں نعمتیں ہیں ایسی ہی جنت میں

ہونگی۔ حالانکہ وہ اس سے بالاتر ہیں۔

یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل محض سے سوچتے ہیں۔۔۔ لیکن جو "وحی خداوندی" سے سوچتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ کو جنت کا معائنہ کرایا گیا' آپؐ نے ساری نعمتیں دیکھیں۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہے جنت کی ساری نعمتیں دیکھیں' تو ایک ہیں انبیاء علیہم السلام اور مقربین وہ محض عقل سے نہیں سوچتے وہ تو وحی خداوندی اور مشاہدے کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔

یہ حکم عوام کے لئے کہ عقل سے جتنا سوچو گے اس کی چیزیں عقل سے بالاتر ہیں اس لئے انبیاء علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

## انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے

انسانی صفات بہت محدود ہیں۔ ہر طرف سے انسان کو عدم نے گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ صفت علم کی بات ہے۔ ایک انسان کو چار سو پانچ سو مسائل کا علم ہوگا' ہزار کا ہوگا' اس کے بعد وہی عدم العلم ہے۔ تو جہل نے گھیر رکھا ہے' بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یا مثلاً ہماری قدرت ہے۔ ہم آپ سے کہیں گے کہ اگالدان اٹھالاؤ۔ آپ اٹھالائیں گے' قدرت ہے۔ یا آپ سے کہیں گے چارپائی اٹھالاؤ' مشقت سے سہی' آپ اٹھالائیں گے' ہم کہیں گے مکان اٹھالاؤ۔ آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں۔ تو بیچ میں قدرت ہے چاروں طرف عدم القدرت ہے۔ زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جو قدرت سے خارج ہیں۔

اسی طرح سے دیگر صفات میں بھی۔ مثلاً آپ محافظ ہیں اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایک بچے کی کریں گے دو بچے کی کریں گے۔ گھر والوں کو ساتھ ملا کر دس کی حفاظت کریں گے۔ ہم کہیں گے سارے شہر کی حفاظت کرو' آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں' امیر اور پریزیڈنٹ جو ہے وہ کر سکتا ہے۔ ہم اس سے کہیں گے ساری دنیا کی حفاظت کرو' سمندروں میں جو مچھلیاں ہیں ان کی بھی حفاظت کرو' وہ کہے گا میرے اندر تو قدرت نہیں تو پھر عدم القدرت آگئی۔۔۔ تو بیچ میں تھوڑی سی حفاظت اور قدرت ہے۔۔۔ غرض ہر انسان کی ہر صفت کمال کو عدم الصفات نے گھیر رکھا ہے' عدم چاروں طرف سے محیط ہے۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود دیا گیا ہے۔

خود ہماری ذات جو ہے پہلے نہیں تھے۔ بعد میں نہیں ہوں گے۔ بیچ میں تھوڑے سے ہیں۔ تو دو طرف سے دم میں گھرے ہوئے ہیں۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود ہے جب وجود ہمارا تھوڑا سا ہے تو صفات وجود بھی تھوڑی سی ہیں۔ کمالات بھی تھوڑے سے ہیں۔ لامحدود کمالات نہیں ہو سکتے۔

## وجود حقیقی

لامحدود کمالات اسی کے ہو سکتے ہیں۔ جس کا وجود لامحدود ہے۔ جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ اور وہ اللہ کی ذات برکات ہے۔

یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ حق تعالیٰ کا علم محیط' اس کی قدرت محیط' اسی لئے فرمایا ۔

وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْاَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا.

"ہر چیز اس کے علم کے احاطے میں ہے"۔

اور قدرت کے بارے میں فرمایا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

"وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

کہیں فرمایا ۔

عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ.

"اس کا اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے"۔

کہیں فرمایا ۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ.

"مالک الملک وہی ہے جسے چاہے ملک دیدے' جس سے چاہے چھین لے' جس کو چاہے بادشاہ بنادے۔ جسے چاہے گدی سے اتار دے"۔

غرض سب کی بادشاہتیں تو حد رکھتی ہیں کہ ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی بادشاہت بھی ازلی اور ابدی ہے۔ تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

## اسلام میں انتخاب امیر کا ایک طریق

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کے وقت چھ نام منتخب کئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی کو امیر بنالو' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ' عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔۔۔ فرمایا ان سے زیادہ کوئی مستحق خلافت نہیں ہے ان میں سے کسی کو منتخب کر لیا جائے۔ مگر انتخاب میں تین دن سے زیادہ دیر نہ کی جائے۔

چنانچہ یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف ؓ نے فرمایا۔ چھ میں سے تین کو سب اختیار دے دیئے جائیں' تو حضرت زبیر ؓ نے حضرت علی ؓ کو' حضرت طلحہ ؓ نے حضرت عثمان ؓ کو اور حضرت سعد ابن ابی وقاص ؓ نے اپنا اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف ؓ کو دیدیا۔

پھر حضرت عبد الرحمنؓ نے فرمایا۔ حضرت عثمانؓ وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنھما میں سے جو خلافت نہ چاہتا ہو انتخاب کا اختیار اسی کو دید جائے اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ تو حضرت عبد الرحمنؓ نے فرمایا۔ میں اپنے لئے خلافت نہیں چاہتا لہذا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں یہ اختیار ان دونوں حضرات کی طرف سے سونپ دیا گیا۔ اور انہیں تین دن مہلت دی گئی۔

پھر آراء کی کثرت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہوئی تو ان کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور اہل حل وعقد نے تسلیم کر لیا۔۔۔ گویا اسلام میں دونوں طریقے ہیں۔ نامزدگی بھی ہے اور انتخاب بھی ہے۔

## انتخاب کا مغربی طریقہ

مگر انتخاب کا ایک تو موجودہ طریقہ ہے کہ جتنے بالغ ہوں سب سے رائے لی جائے' اور امیر کے بارے میں کیا رائے دیں گے۔ اس میں غیر عالم بھی ہیں' جہلاء بھی ہیں' جنہیں یہ ہی پتہ نہیں امارت کے معنی کیا ہیں۔۔۔ یہ مسئلہ اہل حل و عقد کے اوپر رکھا گیا کہ جو قوم کے اندر علم اور دیانت کے لحاظ سے نمایاں طریق پر بڑے ہیں اور ان کی تقویٰ و طہارت پر لوگوں کو اعتماد ہے وہ مل کر جسے منتخب کر لیں' قوم اس کو مان لیتی ہے۔ اس لئے طریقہ تو سہل ہے اور ایک معقول طریقہ ہے۔

لیکن اس میں نقصان اس سے ہوتا ہے کہ لیڈر اس فکر میں رہتا ہے کہ میں بنوں اور وہ اپنے مناقب و فضائل خود بیان کرتا ہے کہ میرے یہ کارنامے ہیں۔ لہذا مجھے منتخب کرو' ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے والا ہی تو اپنے مناقب بیان کرتا ہے کہ میری کارگزاریاں یہ ہیں اور فلاں نے مجھے یوں کہا۔۔۔ اس کے بارے میں صراحۃً اسلام نے فرمایا ؎

لانُوَلِّیْ اَمْرَنَا ھٰذَا مَنْ طَلَبَہٗ.

جو خود کسی عہدے کا متلاشی اور خواہاں ہو ہم اس کو عہدے دار نہیں بنائیں گے اس کی جڑ کٹ گئی یہیں سے نزاع شروع ہوتا ہے اب اہل حل وعقد جو سیاسی امور سے بھی واقف ہوں اور ان میں دیانت بھی ہو۔۔۔ ایک تو ہے کوری سیاست یعنی جوڑ توڑ۔۔۔ اور ایک یہ کہ ضمیر کی سچائی اور دیانت و تقویٰ اور قلب کی طہارت اور ضمیر کی صداقت۔ اس سے جو وہ رائے دیں گے وہ خیر و برکت کی ہوگی' قوم بھی قبول کرے گی۔

## امیر تغلب

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی تغلب کے ساتھ امیر بن گیا زور اور قوت کے ساتھ اس نے قبضہ کر لیا۔۔۔ پھر اس میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی امیر بن جاتا ہے اس لئے کہ ہٹانے میں فتنہ ہے اور فتنے سے بچانا ضروری ہے اس لئے کہ **والفتنة اشد من القتل**۔۔۔ اگر خود بھی بن گیا ہو اور اس میں صلاحیت بھی موجود ہو۔ قوم کا فرض ہے کہ اسے مان لے جھگڑے نہ

ڈالے۔

### اقتدار میں رسہ کشی کا سبب

جھگڑے جو پڑتے ہیں وہ اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں خرابی ہے۔ خرابی سے تو کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ ہر ایک میں کمزوری ہوتی ہے بلکہ اس لئے پڑتے ہیں کہ ہر ایک خواہاں ہوتا ہے کہ میں اس عہدے پر آجاؤں۔ یہ اقتدار پسندی جھگڑے کی بنیاد ہے۔۔۔ تو اس کے لئے پہلے ہی فرمادیا کہ جو طالب ہوگا ہم اسے عہدہ نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ وہ خود غرض ہے اس کے اندر اغراض پوشیدہ ہیں۔

اب اہل حل وعقد جو ہوں جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ہو۔ یا قوم کو ان کی دیانت وتقویٰ پر اعتماد ہو۔ اور یہ کہ وہ خود غرض نہیں ہیں۔ ان کو جمع کر کے کسی کا انتخاب کر دیا جائے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری قوم سے کہا جائے۔ جو اوپر کے لوگ ہیں ساری قوم کا وہی تو خلاصہ ہیں۔ وہ حقیقت میں قوم ہی کی نمائندگی ہوتی ہے۔

### رائے عامہ کی ہمواری

اس میں البتہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں خلاف ہو اسے رفع کیا جاتا ہے کہ میاں' یہ واقعہ یوں نہیں یوں ہے۔ قوم سنبھل جاتی ہے۔

اب جیسے حضرت عثمانؓ کو امیر بنایا گیا تو اسی چھ آدمیوں کی مجلس میں طے تو ہو گیا تھا' لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گھر گھر جا کر پوچھا کہ کس کو چاہتے ہو۔۔۔؟ چونکہ بنی امیہ کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں اقتدار بھی بڑھا ہوا تھا' اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند کیا اور اکثریت کی رائے ادھر ہی آئی اور ان کو امیر بنا دیا گیا۔۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے رائے لی۔ حتی کہ لوگوں کے گھر جا کر رائے لی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ رائے عامہ کو ایک حد تک ہموار کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ جو امیر ہے اس کے واقعی فضائل بیان کئے جائیں کہ اس میں اہلیت ہے۔ اس کے خلاف کوئی جذبہ ہو اس کو دفع کیا جائے۔

### امیر کی غلطی کا حکم

اب ایسا ہی آدمی جو بالکل مزکی اور مقدس ہو جس میں غلطی کا نشان نہ ہو' عالم بشریت میں کوئی نہیں ملے گا۔ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی غلطی اور خطاء ہوتی ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کے بارے میں تو یہ فرمادیا گیا کہ اگر امیر کوئی غلطی بھی کر جائے تو حتیٰ الامکان نصیحت کرو' کچھ نہ ہو تو اس کا اتباع کرو' فتنہ نہ پیدا کرو اگرچہ وہ رائے غلط بھی ہے۔

بنیاد سب کی یہ نکلتی ہے کہ خود غرض نہ ہو۔ دیانت اور تقویٰ قلب میں موجود ہو۔ پھر سب

آسان ہے ورنہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص میں ملک کے سنبھالنے اور چلانے کی اگر فی الجملہ صلاحیت ہے تو اس کے خلاف نہ کیا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر وہ غلطی بھی کرے تو اس غلطی کو اچھالا نہ جائے۔ الا یہ کہ وہ اسلام کی تخریب کے لئے کام کرے پھر بے شک اس کو بدل ڈالو۔

## افراط و تفریط فرقہ واریت کی بنیاد ہے

مولانا احمد رضا خانؒ اور بریلویت کے بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آج تک کہیں ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بہر حال وہ مسلمان ہیں۔

ایک ہے کسی چیز میں غلو اور مبالغہ کرنا اور تشدد کرنا' اس کو دنیا میں بھی پسند نہیں کیا گیا' اور دین میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔۔۔ دین کے بارے میں فرمادیا گیا؎

**لاتغلوا فی دینکم.**

دین کے اندر غلو مت کرو۔ سادہ سادہ طریق پر چلتے رہو۔ جس قوم نے غلو کیا ہے وہ افراط و تفریط سے ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہود نے تو یہ افراط کی کہ انہیں ولد غیا کہا کہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ انتہائی گستاخی کی۔ نصاریٰ نے کہا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تفریط کی۔۔۔۔ تو ایک ادھر بڑھ گیا اور ایک ادھر بڑھ گیا۔ جو اصلیت تھی کہ اللہ کے پاک بندے ہیں اور اس کے پاک رسولؑ ہیں۔ اس کی طرف کوئی نہیں آیا۔ یا خدا بنایا یا معاذ اللہ ایک بدکار انسان ثابت کیا۔ یہ ہے وہ افراط و تفریط سے جس سے فرقے بنتے ہیں۔

یا جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔۔۔ ان

**فیك مثل عیسیٰ ابن مریم.**

تم میں عیسیٰ ابن مریم کی مثال پائی جاتی ہے بعض فرقے تمہاری محبت میں پڑ کر تباہ ہوں گے اور بعض تمہاری عداوت میں پڑ کر تباہ ہوں گے۔ تو خوارج نے تو عداوت کا راستہ ختیار کیا۔ اور یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کو قتل کر دیں اور روافض کے بعض فرقے جو کہتے ہیں کہ ان میں خدا حلول کئے ہوئے ہے اور امام تسلیم کیا اور امام کے معنی معصوم کے لئے۔ اور کہا امام شریعت میں تصرف کر سکتا ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ پانچ نمازوں کو تین کرو' تو اسے کر دینے کا حق ہے۔۔۔ حالانکہ اس کا رسول کو بھی حق نہیں' قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

**قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَه، مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ.**

"مجھے اس کا حق نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنے نفس کی رائے سے کچھ

تبدیلی کر دوں۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور میں امین ہوں"۔

غرض نبی کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت میں تصرف کرے اور وہاں امام کو حق دیدیا گیا۔۔۔ یہ ادھر غلو ہے اور وہ ادھر غلو ہے۔ یہیں سے فرقہ بندی شروع ہو گئی۔۔۔ یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے کہ بعض مسائل مختلف فیہ ہیں یعنی اختلافی مسائل میں اگر غلو نہ کیا جائے اور اعتدال سے چلا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ اب اس اختلاف کو لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ ہی بنایا جائے' یہ جذبات کی بات ہوئی۔ مسائل کی بات تو نہ ہوئی۔

**عرس کا مسئلہ** اس میں دیو بند کے حضرات معتدل ہیں۔۔۔۔۔ مان لیجئے عرس کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس اپنی ذات سے کوئی بری چیز نہیں۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ اہل اللہ میں سے کسی شیخ طریقت کا انتقال ہوتا تو جو متوسل ہوتے وہ جمع ہو جاتے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ جو لوگ ضعیف النسبت ہوتے انہیں قوی النسبت لوگوں سے قوت پہنچتی تھی اور تقویت حاصل ہوتی تھی' ان کی نسبت مضبوط ہوتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کو مختلف ولایات میں بھیجا جاتا تھا کہ تم وہاں جا کے اصلاح کرو' تم وہاں جا کے اصلاح کرو۔۔۔ اور تم وہاں جا کے اسلام پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کی بدولت پھیلا ہے۔ ان کے ہاں عرس کا موضوع ہی یہ تھا کہ سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے وجود بھیجے جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہاں ہر قصبے اور ہر ضلع میں تقریباً شاہ ولایت کی قبر ہے' سہارن پور میں بھی شاہ ولایت کی قبر۔ دیو بند میں بھی شاہ ولایت کی قبر۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہوں میں سنا گیا۔

وہ اصل میں یہ تھا کہ جس وفد کو بھیجا جاتا اس کا ایک امیر بنا دیا جاتا۔ اس کا نام شاہ ولایت ہوتا تھا۔ وہ جہاں انتقال کر گیا وہاں دفن ہوا۔۔۔ تو شاہ ولایت کے طور پر دفن ہو گیا۔۔۔ وہ شاہ ولایت ہو گیا۔

غرض وہاں ولائتیں تقسیم ہوتی تھیں کہ تبلیغ دین کرو' مسلمانوں کی اصلاح کرو' حضرت خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ ان کے بارے میں عیسائیوں کی شہادت ہے۔ مسٹر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت کس طرح سے پھیلی۔۔۔ اس میں لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان میں حضرت خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے اور ننانوے لاکھ آدمی بلاواسطہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔

اور جو ان کے خلفاء کے ہاتھ پر ہوئے ہیں ان کی تعداد الگ ہے''۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نو سو خلیفہ دکن میں پہنچے وہاں جا کے اسلام پھیلایا' ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔۔ وہاں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں ایسی تنگ جگہ کہ آدمی کا جانا مشکل' مگر کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے یا مزار موجود ہے۔ وہاں تک یہ حضرت پہنچے ہیں نو سو خلفاء بھیجے جنہوں نے دین پھیلایا۔

تو اصل میں عرسوں کا یہ مقصد تھا لیکن وہ ہوتے ہوتے مثل مشہور ہے۔ الولایۃ سردہ آمد رفتہ رفتہ کچرہ شد آیا تھا سردہ بن کر ہو گیا کچرہ' اب عرسوں کے معنی میلے کے ہو گئے' عورتوں اس میں' ناچ گانا اس میں' دکانیں اس میں' ہر طرح کی خرافات۔ اس کو کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں عرسوں کو روکتے ہیں۔ وہ عرسوں کا روکنا نہیں ہے۔ وہ خرافات کا روکنا ہے جو خلافت سنت ہی نہیں بلکہ بدعات ہیں۔ جو رسمیں پڑی ہوئی ہیں اور جہلاء کی ایجاد کردہ ہیں۔۔۔ میں کہتا ہوں اگر عرس ان چیزوں سے پاک ہو جائے وہاں سے تبلیغ کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مواعظ ہوں' تقریریں ہوں اور تلاوت ہو کوئی بھی نہیں روکتا۔

ہمارے دار العلوم دیوبند کے سب سے بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے' ہر سال سرہند شریف عرس میں جاتے تھے اور دیوبند والا کوئی انہیں نہیں روکتا تھا' اس لئے کہ وہاں یہ خرافات ہی نہیں تھیں۔۔۔ یا تلاوت ہے یا تبلیغ ہے۔۔۔ یا مواعظ ہیں۔ غرض اصل میں عرس کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان خرافات کو روکا جاتا ہے۔ عوام ان خرافات کے خوگر ہیں وہ اس پر عار دلاتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! عرس کو روک دیا۔ حالانکہ بزرگوں نے یہ رسم ڈالی ہوئی ہے۔۔۔ کیا بزرگوں نے ناچ گانے کی رسم ڈالی تھی؟ اس کا منشاء تبلیغ و موعظت اور دین حق پھیلانا تھا۔ وہ تو رہا نہیں' ناچ گانا رہ گیا۔ بہر حال بہت سی چیزیں جہالت سے پیدا ہوئی ہیں۔ جب شریعت کا علم ہی نہ ہو تو خرافات ہی ہوں گی۔

## اسلام کے نام پر رائج رسوم

اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان بزرگوں کی دیانت و تقویٰ اور پاکیزہ اعمال کو دیکھ کر قومیں متوجہ ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں لیکن تعلیم کا بندوبست نہیں ہوا۔۔۔ تو جن لوگوں کے گھروں میں ہندوانہ رسمیں تھیں۔ انہیں صورت بدل کر اسلامی رسوم قرار دیدیا۔ وہ گوگال کا جھنڈا نکالتے تھے۔ انہوں نے شیخ سدو کا جھنڈا نکال دیا' وہ ستیوں پر پرشاد چڑھاتے تھے' انہوں نے قبروں پر چڑھانا شروع کر دیا۔۔۔ ساری ہی اس میں ہندوانہ رسمیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اسلام کے نام سے رائج ہیں۔۔۔ یہ عرسوں پہ ہونے والی چیزیں در حقیقت کچھ ہنود سے آئی ہوئی چیزیں

ہیں۔ کچھ ادھر کی کچھ ادھر کی۔ وہ پھیل گئیں۔ اب انہیں کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوں کی تعظیم نہیں کرتے۔ بزرگوں نے یہ چیزیں تھوڑا ہی پھیلائی تھیں۔ وہ مقدس لوگ تھے۔

**ذکر میلاد یا جشن میلاد**

اسی طرح مثلاً میلاد شریف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ذکر ولادت تو طاعت و عبادت ہے اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ذکر میلاد کے معنی جشن میلاد کے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیں گے جگہ جگہ سبز مینار سے بنے ہوئے ہیں روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ سیرت پھیل رہی ہے۔ سیرت تو ان تکلفات کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔ نہ ان کو رواج دینے اور مظاہرے کرنے کے لئے آئی تھی' دل میں تو سیرت کا نشان نہیں' مگر بازاروں میں جھنڈوں کے اوپر' میناروں اور برجوں کے اوپر گھوم رہی ہے' سیرت آدمیوں کے لئے آئی تھی' یا جھنڈوں اور قمقموں کے لئے آئی تھی۔۔۔؟ اس میں لگے ہوئے ہیں اور مظاہروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سے روکو تو کہتے ہیں کہ انہیں حضور ﷺ کی محبت ہی نہیں اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ یہ خرافات کرو تب تو محبت ہے۔ نہ کرو تو محبت نہیں ہے۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ حدود قائم نہیں ہیں رہیں۔

اب اس میں علمائے کرام اگر ان خرافات سے ٹوکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نیا اسلام کہاں سے لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی نزدیک تو ان کے گھروں سے جو اسلام آیا ہے۔ وہ یہ رسوم ہیں۔ اور جو لوگ رسوم سے روکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نئے لوگ کہاں سے رسوم کو روکنے کے لئے آ گئے ہیں۔ حالانکہ ان رسوم کو روکتے ہیں جو جاہلانہ طریق پر مروج ہیں۔ اصل شئے کو نہیں روکتے۔ اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تجربہ لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں پر طواف اور سجدے کرنے جاتے ہیں انہیں حج کی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے کہ جو جذبہ ادھر خرچ کرنا تھا وہ ادھر خرچ ہو گیا۔

جو لوگ گانے بجانے میں رہتے ہیں انہیں تلاوت قرآن کریم کی کم توفیق ہوتی ہے اس لئے کہ وہ جذبہ ادھر لگ گیا۔ اور اسلام اس لئے آیا تھا کہ یہ جذبات دین کے بارے میں صرف ہوں۔۔۔ قرآن وحدیث کے بارے میں صرف ہوں تو نہ تو تعلیم ہے کہ مسائل معلوم کریں جس سے سیرت کی حقیقت معلوم ہو اس پر عملدرآمد کریں۔ نہ تمرین وٹریننگ ہے۔ بس جو رسمیں چل پڑیں جس نے بھی ایجاد کر دیں۔ بس سبحان اللہ بہت عمدہ چیز ہے۔ چند دن کے بعد وہی دین بن گیا۔ تو ان چیزوں کو روکتے ہیں نہ کہ اصل دین سے روکتے ہیں۔

## دیو بندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں

اس لئے میری سمجھ میں اب تک بھی نہیں آیا کہ وہ اختلاف و نزاع ہے کیا چیز جس کو بریلویت اور دیو بندیت کے نام سے کھولا جارہا ہے۔ دیو بندیت کوئی فرقہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو اہلسنت والجماعت ہیں۔ دیو بندیت کی جو نسبت ہے وہ تعلیمی نسبت ہے کہ دیو بند میں تعلیم پائی، دیو بندی مشہور ہو گئے، جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم وہ علیگ کے نام سے مشہور ہو گئے۔۔۔ ندوہ میں تعلیم پائی وہ ندوی کے نام سے مشہور ہو گئے، باقیات صالحات مدارس میں تعلیم پائی تو وہ باقوی کے نام سے مشہور ہو گئے۔۔۔ اب یہ فرقہ تھوڑا ہی ہیں کہ ندوی ایک فرقہ، باقوی ایک فرقہ اور دیو بندی ایک فرقہ یہ تو تعلیمی نسبت ہے مگر فرقہ بنادیا۔

## انگریز کا انتقام

بنیاد اصل میں ساری یہ ہے کہ دیو بندی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ تلوار لیکر جہاد کیا۔ تو انگریزوں کے دل میں اس جماعت سے عداوت تھی مگر یہ قوم بہت دانش مند ہے۔۔۔ کھلے بندوں مقابلہ نہیں کرتی۔ تدبیر ایسی کرتی ہے کہ وہ آپس میں الجھ جائیں، اور باہمی نفرتیں پیدا ہو جائیں۔۔۔ اس نے لوگوں کو ہموار کیا کہ ان کو بدنام کرو، چنانچہ جو لوگ رد بدعات کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں جو بدعات میں مبتلا تھے۔ ان کو موقع ملا کہ تم ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ، وہ کھڑے ہو گئے۔۔۔ اب یہ بدعات کا رد کرتے ہیں۔ وہ لوگ مقابلہ پر آگئے بس پھر فرقہ بندی کی ٹھن گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بدعات رد کرنے کی ہی چیز ہے۔

## رد بدعات اور اتباع سنت

مسلمان تو اتباع سنت کے لئے آیا ہے کہ جو حضور ﷺ نے کہا اس نمونے پر میں عمل کروں۔ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھ لیا کرو، یہ فرمایا۔

صلوا کما رایتمونی اصلی.

"نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو"۔

اس طریق پر نماز ہو گی، مقبول ہے، نہیں ہو گی نامقبول ہے۔

حج کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھو۔ خود ساختہ طریق پر کرو گے وہ حج نہیں ہو گا غرض ہم تو پیروی سنت کے لئے آئے ہیں۔ قرآن سے علم لیا، حدیث سے عمل لیا، فقہ سے اس کی تشریح لی۔ بس اس پر عمل کرو۔ اس کے جو خلاف ہے ظاہر بات ہے کہ وہ عمل کے قابل نہیں۔ جو ان کے خلاف کہے گا وہ اسے بدنام کریں گے اس لئے کہ وہ ان کی رسوم کے خلاف پڑتا ہے۔ اور لوگ رسموں کے عادی ہو گئے۔ دین کی حقیقت قلوب میں نہیں۔ یہ ساری بنیاد ہے۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نزاع کیا ہے۔ اللہ و رسول ﷺ کے ماننے والے تم بھی۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ

تمہارے ہاں بھی، طریقت تمہارے ہاں بھی۔ یہ ساری چیزیں مشترک ہیں۔ آخر نزاع کیا ہے۔؟۔ عرس و میلا، یہ نزاعی مسئلے ہیں؟ فروعی چیزیں ہیں۔ ان میں جو خرافات آئی ہیں وہ جاہلوں کے راستے سے آئی ہیں۔ جو واقعی چیزیں ہیں اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کرو۔

**اتباع آباء**

اب مثلاً جنازے کی نماز ہے۔ تو اس میں سنت طریق یہ ہے کہ نماز پڑھ لی۔ اور میت کو لے جا کر دفن کرو۔۔۔ اب اس کے بعد مستقل ایک دعاء مانگی جاتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی تو دعاء ہے اس نماز میں یہ تو نہیں ہے کہ اس میں رکوع و سجدہ ہو وہ تو شفاعت و سفارش اور دعاء ہے۔ اب اس کے بعد پھر دعاء اور بعض نے قبروں پر اذانیں دینی شروع کر دیں۔۔۔ سنت سے کہیں اس کا ثبوت نہیں۔

اب اگر کہو تو کہتے ہیں یہ دین تو ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ تو کفار مکہ جو کہا کرتے تھے

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا

باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا ہے۔۔۔ تو قرآن کریم نے جواب دیا۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآءُ هُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُوْنَ.

"کہ تمہارے باپ دادا چاہے نہ علم رکھتے ہوں اور نہ راستے پر ہوں۔ پھر بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ یہ تو تعصب ہے"۔

حق پسندی تو یہ ہے کہ حکم رسول بھی آجائے تو اسے مانو۔ اور اتباع سنت کو غالب رکھو۔

**غلبۂ آداب شریعت**

ہم نے ان دیوبندی بزرگوں میں یہ دیکھا جو صاحب حال بھی تھے، دلوں میں سوز بھی تھا، مگر شریعت کا ادب غالب ہے۔ اس سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ کوئی سنت ترک ہو جائے۔ خواہ جان پہ بن جائے۔ مگر سنت ترک نہ ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو انگریز کے خلاف ہونے والے جہاد میں امیر جہاد تھے۔ گورنمنٹ عدل و انصاف کی تھی نہیں۔ ذرا ذرا سے حیلوں پر علماء کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ اور حضرت کھلے بندوں پھرتے، چھتے کی مسجد میں گئے، مخبر نے خبر دی کہ اس وقت چھتے کی مسجد میں موجود ہیں تو پولیس نے آکر مسجد کو گھیر لیا۔ ایک سارجنٹ اندر آیا۔ آکر حضرتؒ سے پوچھتا ہے کہ مولوی محمد قاسمؒ کہاں ہوں گے۔؟

دو قدم پیچھے ہٹ کر حضرت نے فرمایا۔

"ابھی تو یہیں تھے۔ دیکھ لیجئے یہیں ہوں گے"۔

وہ دیکھتے رہے اور آپ شاہ رکن الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں پولیس نے گھیر اڈالا تو وہاں سے نکل کر شاہ ولایت کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بس یوں ہی چکر دیتے رہے۔۔۔ ان کے سالے شیخ نہال

احمد صاحب مرحوم جو گاؤں گیاؤں کے مالک تھے۔ دیوبند سے کوئی آٹھ دس میل پہ جو چکوالی گاؤں ہے وہ ان کا تھا۔ انہوں نے منت خوشامد کی۔ کہ ٹھیک ہے تم یہاں تور کتے نہیں۔ میں تمہیں لے جا کے گاؤں میں رکھوں گا ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔

چنانچہ مخبر نے پھر خبر دی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ چکوالی میں ہیں۔ تو پولیس نے آ کر سارے گاؤں کا گھیر اڈال لیا۔

اب وہ یورپین افسر تھا۔ وہ اندر آیا

حضرت نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ فرمایا۔

آیئے' تشریف لایئے۔ فرمایا' چائے بنواؤ۔

چنانچہ ان کے لئے چائے بنی۔۔۔ اس نے کہا آپ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے واقف ہیں۔۔۔ حضرت نے فرمایا۔

جی ہاں خوب واقف ہوں۔

اس نے کہا کیسے آدمی ہیں۔۔۔ فرمایا

نیک آدمی ہیں پڑھے لکھے ہیں۔

اس نے کہا میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔۔۔ فرمایا

شوق سے لیجئے۔۔۔۔۔

تو جس کی تلاش تھی وہی تو تلاشی دلا رہے تھے۔

ایک ایک کمرہ دیکھا' پتہ نہیں چلا۔۔۔ خیر وہ شکریہ ادا کر کے واپس ہوا۔ باہر جا کے اس نے کارڈ نکال کر حلیہ دیکھا تو اس نے کہا کہیں یہی تو نہیں تھے؟ واپس ہوا تو حضرتؒ نانوتہ جا چکے تھے' وہ نانوتہ گیا۔ تو حضرت دیوبند آ چکے تھے' آخر کار عزیزوں نے مل کر مجبور کیا کہ چند روپوش ہو کر گھر میں رہیں۔۔۔ تو حضرتؒ کی سسرال دیوبند میں تھی' دیوان کا محلہ ہے۔ بہت بڑا محل ہے۔ وہ بڑے رئیس لوگ تھے انہوں نے مجبور کر کے ٹھہرا لیا۔

تین دن بعد پھر گھر سے نکل آئے۔

لوگوں نے کہا کہ حالات مخدوش ہیں۔

فرمایا تین دن سے زیادہ چھپنا خلاف سنت ہے۔ حضور ﷺ جو ہجرت کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو تین دن غار ثور میں چھپے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کا اتباع بھی نصیب ہو گیا تو انہیں جان کی پرواہ نہیں تھی' اتباع سنت غالب تھا۔ میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ سبق پڑھا رہے تھے' جتنی دیر طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے' اتنی دیر ذکر کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کون ذکر کر رہا ہے۔۔۔ وہ

خود حضرتؒ ذکر کرتے تھے۔ جب وہ عبارت پڑھ چکا۔ تقریر کی، مطلب بیان کیا، اس نے اگلا صفحہ پڑھا، پھر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

اور اس میں کیفیت یہ تھی کہ رقت قلب سے آنسو آئے تو اس کو اس طرح پیتے تھے کہ دوسروں پر نہ کھلے کہ آنسو آئے ہیں۔ بالکل ضبط کرتے تھے۔ آداب شریعت اتنا غالب تھا کہ وہ اپنے حال و قال کو آگے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ شریعت کو امام رکھتے تھے۔ یہی طریقہ ہم لوگوں کا ہے کہ حال بھی پیدا کرو، سوز و گداز بھی پیدا کرو۔ ذکر اللہ بھی پیدا کرو، قلب میں رقت بھی ہو، مگر ادب شریعت کا غالب رہے۔

اب کوئی اگر بالکل ہی مغلوب الحال ہو جائے تو مستثنیٰ ہے۔ وہ معذور ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں۔۔۔ لیکن جہاں تک ارادے اور حواس کا تعلق ہے تو حال کو مغلوب کرو، اور شریعت کو اس پر غالب کرو۔

## ابوالحال اور ابن الحال

اس لئے ان حضرات کے ہاں دو لقب ہیں۔ ایک ابوالحال اور ایک ابن الحال، ابوالحال تو وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور سنت کو غالب کر رکھے، یہی ان کا طریقہ تھا، اور ابن الحال وہ ہے جو حالات سے مغلوب ہو جائے غرض ان کے ہاں بیعت و ارشاد بھی تھی، حال و قال بھی تھے ساری چیزیں تھیں مگر اتباع سنت کا غلبہ تھا۔ دین کی عظمت، دین کا ادب یہ ہر چیز سے مقدم تھا۔

اور ہم تو مختصر لفظوں میں یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ایک ہے قانون عام جو سب کے لئے عام ہے، وہ قانون شریعت ہے ہر کس و ناکس کے لئے پیغام ہے۔ اور ایک طریقت ہے، وہ شخصی احوال کا نام ہے۔ اور ایک شخص کا حال دوسرے پر حجت نہیں ہوتا، اس واسطے وہ نظیر میں نہیں پیش کیا جائے گا کہ فلاں ایسے ہے تم بھی ایسے کرو، ہر ایک کا حال الگ الگ ہے جو سب کے لئے یکساں ہے وہ قانون شرعی ہے۔۔۔ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ کوئی بہت بلند پہنچ گیا، کوئی نیچے رہ گیا، نیچے والا یہ چاہے کہ میں کود پھلانگ کر اس تک پہنچ جاؤں، فطرت کے خلاف ہے۔ کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ پہنچا دے، پہنچ جائے۔

بس یہ فرق ہے ورنہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا اختلاف ہے؟ ایک طوفان برپا ہے اور تکفیر جاری ہے، فلاں کافر، فلاں کافر، لوگوں نے اپنی خصوصیات کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ حالانکہ اسلام بہت بلند و بالا چیز ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# خطبات حکیم الاسلام

جلد ہشتم

افادات

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نوراللہ مرقدہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند


ناشر نعمان پبلشنگ کمپنی

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 7241703 فیکس:

نام کتاب	خطبات حکیم الاسلام جلد ہشتم

ازافادات	قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ	دارالنشر یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون :7356963

کمپوزر	دلدار حسین ۔ طاہر انور

ڈیزائینگ	حافظ محمد احمد چوہدری

ترتیب جدید	نعمان پبلشنگ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر 7241703 فیکس نمبر

قیمت	..........

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ حنفیہ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:7241703

☆ مکتبہ حنفیہ عقب فائر بیگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ فون پی پی :215507

☆ مکتبہ صدیقیہ نور محل روڈ بہاولپور فون :0621-875998

☆ مکتبہ مدنیہ ۷ اردو بازار لاہور فون :

☆ مکتبہ العارفی متصل جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد فون پی پی :717811

☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

☆ مکتبہ مکیہ 22 علامہ اقبال روڈ لاہور فون :6374594

☆ مکی دارالکتب یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رحیمیہ چونگی نمبر 2 اڈہ بازار اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد

☆ عزیز کتاب گھر بیراج روڈ سکھر

☆ کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ا

سٹاکسٹ ایجنسی شمالی علاقہ جات

☆ مکتبہ المیزان القرآن رزمک اڈہ میرانشاہ صوبہ سرحد

# فہرست مضامین خطبات حکیم الاسلام جلد ہشتم

# مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلامؒ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لیے حجاز پہنچے، روضہ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینہ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔

ادارہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ

## نعمت کبریٰ

یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذبات تشکر و امتنان سے معمور ہے۔ کیونکہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرف حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت و شادمانی دوبالا ہو گئی ہے۔ کیونکہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قابل قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی مچھلی پانی سے نکل کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور و نشاط ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کار فرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاط روحانی محسوس کر رہا ہوں جو فی الحقیقت ایک نعمت کبریٰ ہے جس کے لئے میں بارگاہ خداوندی میں

شکر بجالاتا ہوں۔

**مبارک احساس**

میں براعظم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

۱۲۳۸ھ میں جبکہ انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا اور مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت میں پھیلنے لگا تو اس وقت علماء امت نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں امت مسلمہ کو گھیر چکا تھا چنانچہ انہوں نے مسلمانان ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا جو اپنی مخصوص تعلیم وتربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدا رسیدہ بزرگ اور عالم فاضل شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ متمکن ہوئے جو حضرت نانوتویؒ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دارالعلوم میں درس حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علوم ربانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطاء فرمایا اور کتاب وسنت کی تعلیم سے اس کے در و دیوار کو منور کیا۔

**دارالعلوم کا امتیاز**

اس دارالعلوم کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ واساتذۂ مدرسین وطلبہ کتاب وسنت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب وسنت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں وہ ایسے احکام وامور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالف کتاب وسنت ہوں۔ اسی بناء پر اہل بدعت ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے لیکن ان کی اس مخاصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ وعلماء نے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے علوم کی ترویج واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب وسنت کی اشاعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شعار اور وظیفۂ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا براعظم ایشیا شاہد ہے۔

**دارالعلوم کا تعارف**

اس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا، برما جنوبی افریقہ، روس،

ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں زیر تعلیم ہیں۔

اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، ساٹھ مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دار العلوم کا انتظام وانصرام ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم تعلیم محاسبی اوقاف، مطبخ، صفائی، بجلی، تعمیرات، نشر واشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دار العلوم میں فضلاء قدیم کا بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت و راہنمائی کرتا ہے۔

دار العلوم اپنے حسن کارکردگی اور عظیم الشان علمی و دینی خدمات کی بدولت ایشیاء میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے حتی کہ اسے ازہر الہند کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دار العلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہو چکے ہیں جن میں مفسر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی مفتی وفقیہ بھی ہوئے اور واعظ و مرشد بھی جنہوں نے ہند و بیرون ہند میں ہر جگہ کتاب وسنت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعہ اپنی رشد وہدایت کا سامان فراہم کیا۔

## حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ

میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہو کر سرور وانبساط کی ایسی کیفیت محسوس کر رہا ہوں جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے کیونکہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پر شوکت کیوں نہ ہوں وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینہ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام عالمی حلقوں بالخصوص حلقہ دار العلوم میں انتہائی فرحت و مسرت کے ساتھ سنی گئی کیونکہ اس مبارک سر زمین میں صدیوں کے بعد ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجاج کی راحت و آرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا اسی کے ساتھ تاسیس جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابل قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقۃً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور یہی خطہ ارض وراثت نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہیں سے علوم نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اس سر زمین سے خلافت راشدہ کی شعاعیں نکلیں

اسی لئے مسلمانان عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پر کشش رہا اور اسی کے خزانہائے علوم شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے۔ جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداء ابراہیمی کی گونج چہار دانگ عالم میں پھیلی تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء کو لبیک کہتے ہوئے سر زمین پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آئیں گے۔ اسی طرح جب مدینہ منورہ کی وادیوں سے علوم نبوت اور تعلیمات الٰہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم کو لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلی خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزندان علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزندان علم کا جامعہ سر چشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا ان کے لئے مرتبہ سعادت وخوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

### مستحکم رابطہ

حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارس دینیہ بالخصوص دار العلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیونکہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہو سکتا تو وہ صرف علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دار العلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اخیر میں میں آپ حضرات کے جذبۂ اخوت اور اخلاق کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطاء فرمائے۔

السلام علیکم و رحمتہ اللہ

محمد طیب
مہتمم دار العلوم دیوبند

# مؤتمر اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام کا بصیرت...

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم السلام رحمتہ اللہ علیہ نے مؤتمر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔ اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کررہے ہیں۔ اس مقالہ میں حضرت حکیم السلامؒ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے جن پر علماء اسلام کو متحدہ غور و فکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقابلہ ہندوپاکستان کے علماء اسلام کو بھی زمانۂ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانۂ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کرسکیں گے۔

(ادارہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. ونعوذُ باللہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَ شریکَ لہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرسلہ اللہُ الی کَآفَّۃٍ لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَیْہِ. بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا اَمَّابَعْدُ

## جامعہ ازہر کی خوش نصیبی

بزرگان محترم!

الحمدللہ کہ آج ہم علماء کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کررہے ہیں جو صدر جمہوریہ عربیہ السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارۂ بحوث اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے بعض اہم عصری مسائل پر غور و خوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کررہا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دشمنان اسلام ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کررہے ہیں جامعہ ازہر کی خوش نصیبی اور عظیم کامیابی ہے۔ جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے اس لئے ہم بارگاہ خداوندی میں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنان اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بنا کہ ہم خادمان دین کو جسمانی وروحانی یکتائی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش

کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زریں موقع عنایت فرمایا۔

## مصر اسلام کا نشان قوت

بزرگان محترم! سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہو رہا ہے محض سیاسی اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے جس کے باعث مسلمانان عالم کا ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیث نبوی سے بھی کیا جاسکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ :

"اسلام نے حجاز مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشان عظمت اور ملک مصر کو اسلام کا نشان قوت قرار دیا"۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان و شوکت کا مظہر اور مصر کو افواج اسلامیہ کا مستقر اور حلقہ بگوشان اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز مقدس مرکز عبادت چونکہ حرم مکہ مرکز عبادت تھا اس لئے اسے بلد مامون بنایا گیا تاکہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون واطمینان کے ساتھ مصروف عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع و فساد قتل و قتال اسکی فضاء عبادت کو مکدر نہ بنائے اس لئے اس بلد مامون میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ :

> "بے شک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستور سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے"۔ (او کما قال ﷺ)

## شام۔۔۔ عظمت اسلامی کا مظہر

اور شام چونکہ عظمت اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا :

> "اے شام تو میری شمشیر غضب اور میرا ادارۂ عذاب ہے تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا ہے"۔ (کنز العمال)

اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے :

> "میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواح دمشق اور بیت المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی اسے کسی کی رسوا کن کوشش رسوا نہ کرسکے گی"۔

دوسری روایت میں ہے:

"کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی وہ دشمنان خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی، ایک لڑائی ختم تو دوسری شروع ہو جائے گی"۔

معلوم ہوا کہ ملک شام کفار کے لئے عذاب کا کوڑا اور عتاب کی تلوار بنا رہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

## استحکام مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے

اور مصر چونکہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

"جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیونکہ یہ فوج روئے زمین کی افواج سے بہتر ہو گی، حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا، یار سول اللہ یہ کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے کہ وہ اور ان کی ازواج قیامت تک حفظ وامان میں رہیں گے"۔ (کنزل العمال)

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت وشوکت قائم نہ ہو اور یہ عظمت وشوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطۂ عرب کا امن وامان مصر کے استحکام اور اس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز و شام کا دفاع کر سکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانان عالم کی طاقت و قوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر. متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر جو مخلصانہ سعی کر رہے ہیں وہ یقیناً لائق استحسان اور قابل ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائق آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماء اسلام کو ایک نقطہ پر جمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائل دیحیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً باعث مسرت اور لائق امتنان ہے۔

## جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ

بزرگان محترم! مؤتمر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے مسئلہ اجتہاد اور مسئلہ تلفیق اور بعض علمی و عملی ہیں جن پر ان کے اصحاب نگارش یقیناً قابل مبارکباد ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل و مباحث جو

زمانہ ماضی میں تنقیح و تحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو روز بروز دنیا کی مادی ضرورت کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء و مفکرین امت نے اپنے عمومی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقاء امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امت مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلاشبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پر غور وخوص کیا جائے جن کے ذریعے کتاب وسنت کی روشنی میں امت مسلمہ کو پیش آمد نئے مسائل کا حل کرنا آسان ہو اور اصول و قواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن وحدیث سے مستفاد ہوں تا کہ امت مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہو جائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی یہ حجت "قرآن کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے" بندوں کے لئے پوری ہو جائے۔

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کئے گئے ہیں"۔

نیز بارگاہ خداوندی میں مقبول بندوں کے اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

"آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا"۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کا اتباع لازم قرار دیا۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل کا حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چونکہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتب کردہ اصول و قواعد کی بنیاد یہی تین ماخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کے پابند ہو گا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہاد کلی اور اجتہاد جزئی کی بحث بھی بند ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل و مشکلات حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کے سعی کی جانی چاہئے۔

## اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت

بزرگان محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے انہوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن ادب، معاشرت اور زبان وعلم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسروں کو مغلوب بنایا اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر

کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کر ڈالا جو روح اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھینٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدہ کا استیصال کر کے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے لڑکی کی بھینٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہؓ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا تو انہوں نے فوراً اٹھالیا اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں یہ بات معیوب ہے اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیب کی سنت ان احمقوں کی خاطر ترک کر دوں؟ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوت علم سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت و تہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید و اتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پر عمل کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب و ثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالف اسلام نہ ہو نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے دوش بدوش اور انہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

**مقصد اجتہاد**

اور اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد و اصول دین کو منطبق کرنے علاوہ اور کچھ نہ ہو اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمت دین ہو نہ کہ دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگان محترم! اس میں شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکلیہ بے تعلق بنانے والی رہبانیت ہے لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضی ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب و اصول اور تعلیمات کی جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے عہد نبوت میں بعض مشرکین نے کہا:

"کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتی کہ قضائے حاجت کی بھی؟"۔

اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کر دیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن وقبح کو دیکھ جا سکتا ہے۔

ادارہ بحوث اسلامیہ نے حقیقۃً علماء اسلام کو عصری مسائل پر خور وخوض کر نیک یہ دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی وعلمی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکر گزار ہیں۔

اس سلسلہ میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

### تجاویز

۱۔ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرتب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جز بن چکے ہیں اور جن کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے جیسے بینکوں کا سود انشورنس اور بیمہ کے مسائل مال کی درآمدگی وبرآمدی وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل ورنگ میں مرتب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲۔اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء کو تقسیم کئے جانے چاہئیں تاکہ وہاں پر کتاب وسنت کی روشنی میں غور وخوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث الاسلامیہ ان علماء کے دستخطوں سے تمام ممالک میں امت مسلمہ کے افادہ کے لئے ان جوابات ومقالات کو شائع کرے۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابل قبول حل سامنے آسکے گا۔

۳۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مادی وسائل حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدت نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلاامتیاز رنگ ونسل زمان ومکان کی حدود سے بالا ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا ہے۔ وہ جس طرح جمود وتقشف سے دور ہے ایسے ہی تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

## اسلام کے تین مرکزی نقاط

حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ اول قرآن کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوسرا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور تیسرا خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور امت مسلمہ کا ذریعہ وحدت نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۔

"سب جہانوں کے لئے ذریعہ نصیحت"۔

اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت"

نَذِيْرًا لِّلْعٰلَمِيْنَ "سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا"

اور خانہ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ

"سب جہانوں کے لئے ذریعۂ ہدایت"

اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین امت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کیبعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی"۔

پس جبکہ اس امت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی او رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند و بالا ہے تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت کا تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع البحوث الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کریگا اور اس کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مغربیوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔

توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم و رواج مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے

ارشاد خداوندی ہے:

"تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں بہترین نمونۂ زندگی ہے"

## اسلام کا اجتماعی دفاع

حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور مستشرقین اور دشمنان اسلام کے اعتراضات و جوابات کے لئے سرگرم عمل ہو۔ نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کے جائیں تاکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جوابات تحریر کر کے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہو گا۔

مناسب ہو گا اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی مکلف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

## ادائے فرض

بہرحال ہمیں توقع ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہو گا اور انشاء اللہ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ داران ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبد الناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیس اجتماعات مؤتمر اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان...

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز و تحریر حضرت حکیم الاسلامؒ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلہ میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانان ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدت اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں' اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تحریر وحدت اور اخوت اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگان محترم!

مسلمانان عالم بالخصوص ممالک اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی المناک تھا جب کہ حکومت برطانیہ نے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صداء احتجاج بلند کی۔ حتیٰ کہ ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیر تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگواریوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے نہ دینی حیثیت سے نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملت ہیں جس کی وحدت کو وطن اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کر سکتا اس لئے بجا

طور پر کہا جاتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا وہ درحقیقت دشمنان اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور "کفر ملت واحدہ ہے" کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نو آبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستے صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی لیکن خداوندی نصرت و تائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال عظیم الشان کامیابی عطاء فرمائی اور دشمنان اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے امت مسلمہ عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے بخوبی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحدہ و متفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار ہم تینوں مسلمانان ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدوجہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب
عمید دارالعلوم دیوبند
(نزیل فلسطین غزہ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں' یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول وعدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰہُ اِلٰی كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ......... اَمَّابَعْدُ .......

## احوال واقعی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند ۶ مارچ ۱۹۶۴ء کو سفر مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجاز مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء کو ورود فرمائے دیوبند ہوئے۔ اسٹیشن دیوبند پر بسلسلہ استقبال طلبہ، اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہل شہر کا ہجوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کررہے تھے۔ ملاقات، مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دار العلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں جو دار الحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کرلیا۔ جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دار العلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہل شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں جن میں شاعر انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دواڑھائی گھنٹہ جاری رہی آپ

نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفر مصر و حجاز کے تاثرات اور عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ اور اجتماع مدینہ یونیورسٹی کے احوال و کوائف پر روشنی ڈالی۔

**مؤتمر کے اغراض و مقاصد** آپ نے فرمایا کہ قاہرہ کی اس عالمی مؤتمر کے اغراض و مقاصد کی کوئی تفصیل اس دعوت نامہ میں نہ تھی اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تنقیح و تحقیق اور اس سلسلہ سے علماء عالم اسلامی کا ربط باہمی ظاہر کیا گیا جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر، البتہ مؤتمر کے اجلاس اور رفتار عمل سے جو اغراض و مقاصد ہمارا ذہن اخذ کر سکا ان کا خلاصہ یہ تھا:

۱- نئے تمدن اور جدید اکتشافات سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعہ ازہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کے فکر سے اس میں استفادہ۔

۲- بلاد مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ مؤتمر سے ان کی علمی وابستگی ہو تاکہ وہ پورے عالم اسلام کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

۳- جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت و عظمت کا تعارف

۴- حکومت مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان و تبشیر۔

۵- فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمت اور مضوبہ فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

٦- مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعور بیداری کا مطالعہ۔

ان مقاصد کے ساتھ مؤتمر کا اجلاس مبنی محافظۃ القاہرہ کے فلک بوس قصر میں شروع ہوا جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی، مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی مجموعی طور پر سوا سو علمی نمائندے شریک جلسہ ہوئے۔ ہندو پاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیوبند تھے اجلاس کی کارروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوشنما کتابچہ برنامج (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا جس میں پہلے ہی دن سے لے کر آخری دن کا نظام عمل بقید گھنٹہ و منٹ پیش کر دیا گیا تھا اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کارروائی اور خواندہ مقالات و مباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

**مؤتمر کے زیر بحث مسائل** پہلے نمبر کے تحت مؤتمر میں جن مسائل بذیل برنامج اہمیت دی گئی اور ان پر خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

۱- اسلام میں مالیات کا نظام تقسیم۔
۲- عرب اور اسلام کے عالم گیر نفوذ کے طبعی اسباب۔
۳- اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔
۴- اغنیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔
۵- اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام
۶- اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔
۷- اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

**مسئلہ اجتہاد**

لیکن نئے حوادث و مسائل و غور فکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلہ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے پہلے ہی دن کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دو تہائی حصہ صرف ہوا۔

فکر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے کیونکہ آج کی صورت حال جدید انکشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقش قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطور تحریک الاستاذ علی عبدالرحمٰن ازہری وزیر سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتداء کی اور اسکے بعد اجتہاد و تقلید و تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ ناظم جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم و رئیس وفد پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ دسویں دن (۱۲ مارچ ۶۴ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مؤتمر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریق پر بطور نمائندہ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات خطاب رئیس الوفد الہندی کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا مگر میں اس میں پیش شدہ امور کو آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں گو اختلاف لغت و الفاظ سے عنوان اور اسلوب بیان کچھ مختلف ہو جائیگا اور اجمال و تفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن

ہے لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

## مجتہد فیہ مسائل کا حل قوت فکر و عمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے

آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد و تقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہویا کھلا ہوا ہو۔ اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوح اجتہاد مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا ضرورت اس کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو در پیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے اسے عملاً پیش کرے تا کہ ارباب فکر و نظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیونکہ اجتہاد مطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب ہر ایک کی شرائط کتب فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت و سقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آجائے گا جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول وتفقہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف و تسلیم پر مجبور کیا جاسکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے لیکن اس کیلئے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے تنقیحی سوالات واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیئے جاتے ہیں یا اب بھیج دیئے جائیں اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تاکہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علیٰ وجہ البصیرت بحث و تنقیح میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلہ تک پہنچ جائے۔

## ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور حل پیش کیا جاتا رہا

حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات و افکار نئے واقعات واحوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں مفکر علماء

اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصول فقہ اور منضبط مسالک فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امت انہیں قبول کرتی رہی ہے چنانچہ ہر دور کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے، آج بھی نئے حوادث و مسائل کی تنقیح و افتاء میں علماء امت نے کوتاہی نہیں کی حوادث الفتاویٰ اور آلات جدیدہ کے شرعی احکام کے نام سے مستقبل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں نیز جزئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کئے جو امت کے زیر عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

## فکر و عمل کی یکسانی وحدت امت کا موجب ہے

البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز میں سامنے لائی جائے کیونکہ وسائل نقل و حمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند ہو گئی ہے۔ اس لئے آج ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جا رہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعت نہیں بنتی اس لئے موزوں ہو گا کہ ان جدید فتاویٰ کا مؤقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں پورے عالم اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر و نظر سے یہ احکام عالمی انداز سے امت سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کا مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔ وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کر کے بذریعہ تراجم اعضاء مؤتمر کے سامنے رکھ سکتی ہے تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر امت کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت امت کے لئے ایک مؤثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہو گا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

## انسانیت کو عالمی دین کی تلاش

آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفس اسلامی سے دنیا کو روشناس کرانا ہے جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائل نقل و حمل کی وسعت و سہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہو گئی ہے جس کے تمام تمدنی امور میں یکسانی آتی جا رہی ہے۔ ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جا رہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہو رہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جا رہا ہے اور جذبات کی رو ادھر آ رہی ہے کہ تمدن و

تہذیب سب کا ایک ہو' معاشرت ایک انداز کی ہو حتی کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم چلے اور آگے بڑھے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جا رہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس اشتراک فکر کی وجہ سے طبعًا دنیا کہ جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو' دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں نہ قومی' نسلی اور وطنی تحدیدیں ہوں نہ لونی تخصیصات' بلکہ وہ نفس انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس نے یہی عالمگیر نعرہ اخوت و مساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کر دیا ہے اس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہے اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع البحوث کے پاس موجود ہیں اور غیر موجود کو با آسانی فراہم بھی کر سکتی ہے جس کے لئے سارا عالم اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا اپنا فرض منصبی سمجھے گا۔

**اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات**　آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا باخبر معاندین خواہ وہ مستشرقین یورپ ہوں یا مستغربین ایشیا جو شکوک و شبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش و تذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہا رہے ہیں۔ بلا شبہ علماء ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور وقیع خدمات انجام دی ہیں لیکن وہ لسان اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جن میں پورے عالم اسلامی کے علماء کے فکریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی مبشرین ان شکوک کو عالمگیری انداز میں پھیلا رہے ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیری ہی انداز میں سامنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی کے ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ مؤثر اور کار آمد ثابت ہوگا اس لئے مجمع البحوث کے برنامج میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر و اجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات و جزئیات مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے بلکہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع واشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

**دائرۂ اجتہاد میں اتباعِ اسلاف** حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ ہم میں اجتہاد کی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینے اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کر لیں اور پھر قرآن و حدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدودِ جواز میں لانے کی فکر کریں جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت کا اتباع نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔ ہمارے لئے اس فکر و نظریا طریق استنباط میں جہاں اصول و قواعد فن کی پابندی ضرری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا ہی ذوق تھامے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطور توریث ہم تک پہنچایا ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو وَیُزَکِّیْھِمْ کے تحت نبی کریم ﷺ نے ہمیں بخشا۔ اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباعِ سلف کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے تا آنکہ ایک ایک سنت اور ایک ایک اسوۂ سلف ہمارے جدو اجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہئے۔

اس پر حضرت ممدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

**عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت** تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا' بلاد مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط و اتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئند تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔ آپ نے اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ تر عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصر اور شام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے شرعی ارشادات سے مصر و شام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔ شریعت نے حجاز کو مرکز عبادت بتایا ہے' شام کو مرکز شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکز عسکریت فرمایا ہے۔ حجاز مرکز امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہو سکتی' شام کو مرکز جنگ و دفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت و ہجوم کے قائم نہیں ہو سکتی اور مصر کو مرکز عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہو سکتی اس لئے یہ تین ملک تین اقسام کی مخصوص مرکزیتوں کے

حامل ثابت ہوئے۔اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورت حال خود بخود کھل جاتی اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلاد شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام و حجاز سے اِن کا اتحاد نہ ہو نہ شام و حجاز کا تحفظ ہو سکتا نہ خود مصر کا اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاط بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی ہیں اس لئے ہم مصر و شام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔اندریں صورت اگر عالم اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصر و شام اور حجاز کا اتحاد ہے آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پرواز ڈالا تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلاشبہ ایک مبارک قدم ہے۔

## مصر کی صنعتی ترقی

آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مؤتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی میں دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفر کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز سے۔

سب سے پہلا سفر المحلۃ الکبریٰ کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے جس میں پارچہ بانی اور قالین بافی وغیرہ کے مل اور فیکٹریاں ہیں۔دوسرا سفر طنطا کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، تیسرا سفر نہر سوئیز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئیز کے کنارے ایک پر فضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئیز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔نہر سوئیز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ و ایشیا اور افریقہ و امریکہ کے جہاز گزرتے رہتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئیز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام، انکے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔اس کے بعد غزہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔یہی شہر امام شافعی رحمتہ اللہ کا مولد و منشاء بھی ہے۔چنانچہ ہمیں وہ بلڈنگ دکھلائی گئی جو آج حضرت الامام کے مکان ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزہ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔شب میں ہم پہنچے تو غزہ کے ایک

پر تکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالی جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جس میں فلسطین کے تباہ حال عرب عسرت و تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ان عالمی علماء کو مرحبا کہا گیا، خیر مقدمی نعرے لگائے گئے تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی تجویز پاس ہوئی۔

واپسی پر مؤتمر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جارہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جارہی ہے، جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا پندرہ بیس میل کی حدود میں لوہے اور سیمنٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس سفر سے واپسی کے بعد مدیریۃ التحریر کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستہ نے مہمانوں کو خیر مقدمی سلامی دی۔ بچوں نے فوجی کرتب دکھلائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا۔ مہمانوں کو عطر کی شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور مؤتمر کے اجلاس جاری رہے۔

**دار القرآن کا سنگ بنیاد** اعضاء مؤتمر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کئے گئے، ایک دار القرآن کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے تاکہ قرآن کریم کی تعلیم ذیلی ضمنی نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت سے سامنے آئے اس کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت و تقریرات اور تاسیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطور ہدیہ پیش کئے گئے۔

**مدینۃ الازہر** دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے مدینۃ النصر میں منعقد ہوا جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پر شوکت بنایا گیا تھا اس میں تقریباً بیس پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں اسٹیج کے نیچے ایک طرف زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراء دول کی نشستیں تھیں صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ السید جمال عبد الناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے انکی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھا، یہ ایک پورا شہر مدینۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جارہا ہے جس میں جامع ازہر کے تمام کالج مدارس، دار الاقامے اور دفاتر یکجا ہوں گے

جواب منتشر ہیں، جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

### ہزار سالہ علمی عظمت

اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمہ علوم و فنون پیدا کئے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء فارغین میں جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے ائمہ علم و ہدایت ہوں تو اس کی زرین خدمات سے کون انکار کر سکتا تھا۔

### صدر ناصر۔۔۔خدمات اور کردار

اسی دوران میں ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا، نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبدالناصر صدر مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدر منتخب (السید جمال عبدالناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی جس میں مصر کے جدید دور کی جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ چیرز اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔ مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔

اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحاد ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا ہے اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور اس سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ و جلال کی رسمی نمائش سے الگ رہے بلکہ ابھی تک بھی وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں جو شہر میں اور مکانوں کے ساتھ ایک عام مکان کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدر مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخص ہوتی ہے نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے، جہاں جگہ ملتی ہے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں پنج وقتہ نمازوں کی بھی

پابندی کرتے ہیں۔

### مصر کی عمومی مذہبی حالت

اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عامۃً نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں قاہرہ ' طنطا ' اسکندریہ ' غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی ' مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ و موذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں۔ ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مسجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹے وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں ملنساری اور محبت کا مضمون کافی ہے جب تک زبان کی اجنبیت رہتی ہے بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

### اکرام ضیف

اکرام ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خو طبیعت ثانیہ ہے اعضاء مؤتمر کی مدارات وضیافت میں بھی مصر نے کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ وزراء امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا۔ ہر پہلے ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا لیکن اگلے دن دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلا کو گرد بنا دیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء و فضلاء کے لئے دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور اداء فرائض میں چستی نمایاں نظر آتی تھی۔ قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

### مصر کا سرکاری مذہب

یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کرلی گئی ہے اور وہ یہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کی بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے کمیونزم میں نہیں سمائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی

بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لے گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کے ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کر دیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصہ جسے مصر جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے وہ کم و بیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشلائز کر دیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہر حال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو ختم کر کے حدود اعتدال میں لے آنا قابل ملامت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابل ستائش کہا جا سکتا ہے بہر حال مؤتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

## مصری قوم کی قرآن کریم سے والہانہ محبت

یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآن کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوت قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جا چکا تھا قاری محمد خسری نے (جو مصر کے مشہور مجود ہیں) یہ تلاوت شروع بھی کر دی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مجود جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے، وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل، جامعہ شافعی میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینت میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماع قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآن کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مدرس کے انتخاب میں حافظ قرآن ہونے کی شرط رکھی ہے۔ دار القرآن کا سنگ بنیاد ہی مستقلاً حفظ کیلئے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی

ہے دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

## حفاظت قرآن کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ

پھر نہ صرف تلاوت قرآن بلکہ حفاظت قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے، یہود بے بہبود نے اپنی روایتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلادیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں کتنی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بٹھادیئے تاکہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالف اسلام عقائد واعمال کے حامل داعی ہوں تاکہ اسلام کی تعلیمات کو سن کر قومیں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآن کریم چھپوایا اور اس کے سرورق پر یہود کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریا برد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچادیا جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہوگئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآن شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود تھمی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے، حکومت کی زبان لسان قرآن ہے، حکومت کا نصب العین اشاعت قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظت قرآن ہے جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہوگئیں۔

## مغربیت سے مرعوبیت

مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مسرتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہان روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے جب تک ان کے ضمائر اور مافی الضمیر کا اندازہ نہ ہو ظاہر طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔

جہاں مساجد نمازوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آداب شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔ اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے، عورت مرد کا اختلاط عام ہے، جلسوں بازاروں اور دفتروں حتیٰ کی مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا حلقہ مستقل تھا جس میں وہ کھلے منہ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے، اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یہ یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا ہے تو سعادت میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہے جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے، حالانکہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت سے مرعوبیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔

**ممکن الزوال خرابیاں** اب فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ توسعات در حقیقت فکر کی آزادی سے چلتے ہیں۔

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد
زنند لشکر یا نش ہزار مرغ بہ سیخ

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائز سازی کی کثرت سے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ' ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ... یہ خرابیاں یور... ر یورپیوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہ و اصلاح کی

کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع، ہم لوگوں نے اپنے مقالات وخطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی جس پر کسی بیزاری نے بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے یقیناً گنجائشیں ہیں مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہل دل خواص ان کے پیچھے نہ لگ لیں اور استدلال ونظر کے ساتھ اپنے عمل و تقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے نہ رکھتے رہیں اصلاح وتعدیل مشکل ہے۔

بہر حال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال بشرطیکہ مؤتمر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔

## بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت

حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بہر حال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے، پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر و مغلوب ہو چکا ہے، کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو ہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کیساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدر آب وہوا کا نتیجہ ہے دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ کے مصداق ہو کر اَحَقُّ بِالْمُلْكِ کے حقدار بن گئے ہیں اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر ورسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈایسٹ کے ممالک کو ان کی اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلاشبہ ان کے حسن تدبر کی قابل ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال ومشاہدات پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہد مصر وحجاز سے آئے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس لئے مشاہدات سے بجائے اس تحریر میں تاثرات اور مقالات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا

ہے جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرما دی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تا کہ اس متن کے ساتھ زبانی بیان کردہ حالات و مشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دارالعلوم کے صف عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی روح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے (مقالہ رسالہ دارالعلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)۔

اس سلسلہ میں فلسطین اور غزہ کے سفر میں آپ نے تقسیم فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیل تحریر منضبط فرمائی تھی لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے اس لئے مقالہ میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویہ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے (جسے خطبات کے صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔

سفر حجاز یکم اپریل ۶۴ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصد حج بیت اللہ حجاز روانہ ہوئے اور اس تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کر کے ۱۶ اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱ اپریل کو ادائیگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعت اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ الشیخ عبود بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغایت کرم وعنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیورسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور پر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں۔ حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اس دعوت کو بصد شکریہ قبول فرمالیا۔

مقررہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاء سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبۂ بہار، صاحبزادۂ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیو بند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔

یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس الشیخ بن باز کے دفتر میں پہنچے جو ایک تبحر عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت وعنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیو بند کا تذکرہ چھڑا حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد وقیمتی کتابوں کے ہدایا حضرت ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیورسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور الشیخ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسک حج پر روشنی ڈالوں لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیو بند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع ورغبت ان کے افکار وخیالات سننے کے آرزومند ہیں۔

اس تقریر کے بعد جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کیلئے ایماء کیا۔

## مدینہ یونیورسٹی میں خطاب

حضرت ممدوح نے اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں شکریہ ارباب جامعہ دارالعلوم دیو بند حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کی شایان شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفاصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف ماشاءاللہ اور الحمدللہ کلمات بلند ہوتے رہے۔

یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جارہا ہے (جسے صفحہ خطبات صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

## بے اصل بات

اس مقالہ کے اختتام پر صدر جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلمات خطای کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بچھی ہوئی تھی اور جھک کر اور اپنی ایک کچی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا،

"کیا یہ واقعہ ہے کہ دار العلوم دیوبند میں اہل حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کر دیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبۂ اہل حدیث دار العلوم سے خارج کر دیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے کیا اس کی کوئی اصلیت ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب دار العلوم نے فرمایا:

"یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے مسلک کے اختلاف کی بناء پر نہ کبھی اہل حدیث طلبہ کا داخلہ دار العلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرمارہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہل حدیث اور حنفی طلبہ میں مسلکی تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دار العلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کرے تو نظم برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بناء پر خارج کیا گیا جن میں اہل حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بناء پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور۔ اگر مسلک اختلاف کی بناء پر اہل حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہل حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے انہیں بدستور دار العلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سر تا پا غلط ہے کہ ان طلبۂ کے اخراج کی وجہ تفاوت مسلک ہے"۔

اس سے صدر جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اولاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے پھر دار العلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ:

"دار العلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہل حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بناپر خارج کئے جاتے ہیں غلط ہے، ہم نے اسی وقت رئیس دار العلوم سے اس کی تحقیق کی تو شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ ایسی افواہوں کا پھیلانا نامناسب ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص حجاز مقدس

پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈہ سے احتراز نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ دار دار العلوم کی زبانی ذمہ داران مدینہ یونیورسٹی کے مواجہ میں خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔

حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا وہ بھی اس شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

## الرابطۃ الاسلامیہ کے اجلاس میں شرکت

پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطۃ الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ الرابطہ کے سیکرٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارتخانہ ہند کی طرف سے دی گئی تھی ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے الرابطہ کے اغراض و مقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریشمی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

## دار العلوم کا بین الاقوامی تعارف

بہرحال مجموعی حیثیت سے حضرت ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جو اہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دار العلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا جو مڈایسٹ اور یورپین ممالک کے سربر آوردہ زعماء اور علماء کو کرا لیا گیا۔ آپ کے ساتھ دار العلوم کی عمارتوں کے البم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس البم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دار العلوم جانا پہچانا ہو گیا۔

دار الحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلبہ اور شہر کے لوگوں نے حضرت ممدوح کے ان اقدامات پر نظم و نثر میں مبارکباد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حج اکبر کی مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دار العلوم کے لئے ہموار ہوئے۔

جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

# مذہب اور سیاست

قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی) تھے جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا' اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے' عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد' امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

## بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## پیش لفظ

پیش نظر خطبۂ صدارت حضرت فخر الامت' امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا۔۔۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے ان کے علاوہ مجلس احرار' مسلم لیگ اور جماعت خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔

عام شرکاء میں ہر طبقہ خیال کے افراد حاضر تھے۔ مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی عرفانی اصلاحی سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا:

"میں خطبہ صدارت سننے ہی کے لئے شریک اجلاس ہوا تھا اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچادیا"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ. بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا اَمَّا بَعْدُ

فاعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم، بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

## مخلصانہ شکریہ

بزرگان محترم!

اللہ کی حمد و سپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود و سلام اور آپ سب حضرات کے کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں نالائق کو بخشا گیا ہے۔ مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطور یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اکابر قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور و فکر میں مدد دے سکوں۔

## زمانۂ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں

حضرات محترم!

آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں الجھ رہی ہے، دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں۔ معمورۂ ارضی کے دو حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراج تحسین وصول کیا تھا، آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ انسانیت اپنے نشان مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے تھرا رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوس بندگی بنایا تھا، مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگ غلامی کا جہنم بنادیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنم تیار کیا تھا آج کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کراہ رہے ہیں اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جارہی ہے۔ جو مذہبی رہنماؤں کی روح کو تڑپا رہی ہے۔

**مذہب اور سیاست** وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی، آج خدا سے آب حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوند عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے، زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آرہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی، مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبر مطلق۔

**جنگ کا آخری فیصلہ** جنگ ہو رہی ہے، یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتی کہ چرچل روزویلٹ اور ہٹلر وہ خود بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی، جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدان جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبر اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ:

"اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائے گا۔"

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیہ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی جاری رہے گی۔ گو 'ڈیلی میل' نے اپنے مقالہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء میں لکھا ہے کہ:

"جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے"۔

اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے کیونکہ دنیا کے دوا رب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے دنیا کے مدبرین ان کو بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔

**آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت** دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہو سکے۔۔۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔۔۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار پر کسی ایک ملک کی بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔۔۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیت کی

بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین الملی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر متحارب قومیں ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہو گئی تو یہ خاتمہ اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدمہ ہو گا۔۔۔

۔۔۔ہاں! مگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں، خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

## ہندوستان کی صورت حال

ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کا شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبر کو غلامی کی قوتوں کیسامنے مفلوج بنادیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفان مصائبات ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرکب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تاکہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی پتھروں سے نکال کرلے جائیں ؎

گہے باشد کہ کار ناخدائی می کند طوفان
کہ از طغیان موجے کشتیم برساحل افتاد است

## ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟

میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گھن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پیوند خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔

۱۔ جہل ۲۔ ظلم ۳۔ اور غلامی۔

## جہل

جہل سے حدود واشیا نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی کوئی قانون زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے قائم فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اسکی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔

## ظلم

ظلم، عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلم اخلاق یعنی اخلاق کا عدل واعتدال پر قائم نہ

ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے۔ جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے، قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخر ان بداخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جا سکے۔

**غلامی**

غلامی کی تباہ کاریاں فوضویت سے شروع ہوتی ہیں۔۔۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو، مرکزیت نہ ہو، اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے، قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے، طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت ور اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے اور پھر اس غلامی میں بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ کلچر، تہذیب، تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو یہ طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقش پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

**قرآن حکیم کا فیصلہ**

قرآن حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشاد ربانی ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔

”جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے ان کہ لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل جاتے تھے“۔

ذلت و مسکنت کا فرد کامل یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں

کے غلام۔ کبھی بخت نصر کے غلام۔ کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باجگزار۔ کبھی مسلمانوں کے زیر حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکنوں کی لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلاوطن کیا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے ایک ایک کا مال واسباب ضبط شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے موقع پر بورڈ چسپاں کیئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہوئے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضرور دی گئی مگر ان کی کسی ادنیٰ توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیونکہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل ورسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کے ساتھ ہو مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کیساتھ۔ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کردی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآن حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عمل سیہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہویا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جائے اور یہی وہ جہل ہے جس سے خیر وشر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہود کی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بداعمالیوں سے اور بداعمالیوں کا منشاء اخلاق اور جہل نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآن حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔۔۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الٰہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔

ارشاد ربانی ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً۔

"ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سو انہوں نے اس کی

ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔
بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا"۔

یعنی اس میں قوت علیمہ اور قوت عملیہ (اخلاقی حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاقی کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔
ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔

ارشاد ربانی ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَايُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ.

"یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے"۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد ضد صلاح ہے اور صلاح و رشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی، ہو خواہ اخلاقی، پس آثار جہل و ظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی۔

ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جا سکتی ہے تو وہی اس کا جہل و ظلم ہے، گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیردستی پیدا کر سکتی ہے تو یہی ظلم و جہل۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کر کے اس کی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ.

"اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے ان میں خون ریزیاں کریں گے"۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے، جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں

غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو در حقیقت اسی ظلم و جہل کا ثمرہ ہے۔
بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

(القرآن الحکیم پارہ ۹)

"اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے"۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب بتلادیا ہے۔۔۔ بہرحال ان آیات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم و جہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تینوں مہلکوں سے بچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے اتنا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں شمار کئے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی توبر تو جہالت نے تو ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھادی، اچھے برے کا فرق مٹادیا۔ حدود اشیاء ان کے قلوب پر مخفی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے۔۔۔ مخلوقاتی صفات خدا میں خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع و اقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کئے جاتے تھے۔ انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سر عبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور امتی کا فرق مٹا چکے تھے رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دیدم تھا اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیر دین کی تمیز اٹھ چکی تھی۔۔۔ دین کو غیر دین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیر دین کو دین جان کو بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلم اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاق فاضلہ کا ان میں کوئی شمہ باقی نہ رہا تھا۔ اخلاق بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت نہ ہمدردی تھی نہ مروت نہ ایثار نہ تواضع نہ بے نفسی نہ للّٰہیت نہ صبر و شکر نہ اعتماد نہ توکل ہاں رات دن کا شیوہ تھا، تفاخر و اتراہٹ، بے رحمی و قساوۃ شیخی در عونت، کبر و نخوت، سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی،

ہوسناکی و خود ستائی اور ان بد اخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا' وہ لوٹ کھسوٹ' قتل وغارت 'زناو شراب' جوا اور قمار' قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی و دینوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہ' نہ قومی نظام تھا' نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ' پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت' طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچادیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام' کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں آثار نبوت مٹادئے تھے اور فوضویت وغلامی نے ان میں آثار سلطنت محو کردیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی' نہ سیاست' جس کا خون انہی امراض ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

## رحمت الٰہی کا ظہور علم نبوت مکارم اخلاق' اسوۂ حسنہ

آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل' تاریک پیکر' اور تاریک روش پر قوم پر ختم نبوت کا آفتاب جہاں تاب چمکا کہ نبی کریم ﷺ نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو۔ اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے چنانچہ اپنی یہی تین شاخیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

انما بعثت معلما.

"میں بلاشبہ معلم بناکر بھیجا گیا ہوں"۔

ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق.

"میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کردوں"۔

ایک جگہ آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد الٰہی ہوا:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ.

"البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم واخلاق و عمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں"۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے علم کی حدود وا شگاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا ناروا کا امتیاز ہوا۔۔۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے ٹھیلنے یا اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمت حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس عمل کا اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت واستقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیت کے ساتھ اس علم واخلاق کی نشر واشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت مادی و روحانی طاقت اور غلبہ و تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کر دے۔

بہر حال قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جما دیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

## مسلمان بحیثیت فاتح عالم

چنانچہ نبی کریم ﷺ کی وفات سے پہلے ہی مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپؐ نے خراج لیا اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم۔ مقوقس، بادشاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک کھلا تو لسان نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دور صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے دست حق پرست پر بہت سے بلاد فارس، ابو عبیدہؓ کے ہاتھ پر متعدد بلاد شام، عمرو بن عاصؓ کے ہاتھ پر کتنے ہی بلاد مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقیؓ آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیار مصر، تمام اقلیم فارس اور روم و قسطنطیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے دولت عثمانیؓ کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت

اختیار کرلی زمین کے مشارق و مغارب تک یہ روجا پہنچی۔

بلاد مغرب سے اقصاء اندلس، قبرص، قیروان، بلاد سبتہ اور بحر محیط تک۔ ادہر ناحیہ مشرق سے اقصائے بلاد چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق وخراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم علیہ ﷺ نے بطور پیشنگوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

ان اللّٰہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا و مغاربھا و سیبلغ ملک امتی مازوی لی منھا. (ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۱۴۰)

”اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں“۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا بہت سے وہ ناحیئے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی، اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا، چنانچہ ہندوستان، افغانستان، جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم ان کی ذہنیوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت و بر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۔

(س: فتح پارہ ۲۶)

”وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت کی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے (باعتبار حجت و دلیل بھی اور بلحاظ شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرن اول میں ہوا کیفاً۔ اور قرن آخر میں ہوگا کماً)“۔

بہر حال یہ سب مادی وروحانی برکات اسی مقدس قوم کے دست حق پرست پر ظاہر ہوئیں، جنہوں نے برکات نبوت سے متبرک ہو کر ہو اپنے ظلم کو عدل واخلاق سے، جہل کو علم نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال سے متعیز کیا۔

**زمانۂ جاہلیت**

آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہیں جس کا قبل از بعثت نبوی علیہ ﷺ تھی۔

**وفورِ جہل**

وفورِ جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے اسباب علم بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے امت میں جہل ترقی کرتا جارہا ہے آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنادیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک و شبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود میں کلام ہے، کسی کو اسکی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں، کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیتؓ کے عدل و ثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے، ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کسمپرسی اور بیکسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹ علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر کو اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟

اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ ع

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو

اختلاف خیالات سے مسالک بھی مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی واجتماعی طاقت میں روز بروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جارہا ہے۔

**فقدان اخلاق** ادھر اخلاقی بے مائگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسمی گدیاں اور تحصیل وصول کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائر دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب وسنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت وعبادت کی بدعات ومحدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال وکیفیات اور نہ مقامات واقوال جبلی۔ پھر بداخلاقیاں حسد وریا کبر وحصر، اسراف وبخل، جبن ودوں ہمتی، جاہ پرستی وجاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہے۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل وتتمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کی بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول اور نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا رہتا ہے آج امت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامۃ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع وجدل ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافق کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دلداری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کیلئے شفقت وایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

**ثمرات غلامی** ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال وخودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت ہے نہ معیشت نہ تنظیم ہے نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق وتحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقۂ عمل کا بھی اختلاف آجاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع وجدال بنے بغیر

نہیں رہتا پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء و قیاسیات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعۂ نزاع و جدال بھی بن جاتا ہے۔

## دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد

بہر حال قوم کا نظام علم واخلاق جو مجموعہ دیانت ہے ایک طرف مختل ہے اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے دوسری طرف مضمحل ہے۔ اس لئے آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بد نمایاں ہونے چاہیے تھے وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، امن و سکون گھروں، شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔ بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت و خواری اور پستی میں آچکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت وعیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسمانی بم زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار فولادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت البحریاں اسے اور زیادہ تہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات، نباتات، حیوانات سب سے اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض و مصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اسے نجات نہیں ملتی، غرض انسان کے لئے نہ آج انسان کارآمد ہے نہ غیر انسان حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ.

”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ

ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ باز آجائیں“۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا اَصَابُکُمْ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ.

”اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے“۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ.

”اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں“۔(پارہ ۲۸ ع ۶)

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک و مفاسد کی جڑ بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانۂ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل، ظلم اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بدیانتی اور بد سیاستی، اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا، وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ:

لا یصلح اخر ھٰذہ الامة الا بما صلح به اولها.

”اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی“۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ جہل، ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام، عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں یہ تین اجزا نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین اجزا کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ.

(پارہ ۲۸ ع ۱۱)

”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور

دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔

## تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال

آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے امت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر امت کے عمل و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لا کر جن پر قلب کی استقامت موقوف ہے، درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلہ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع کی مجموعی زندگی کا اسوۂ حسنہ امت کے سامنے لے آنے کے ہیں، جس کے مجموعہ پر امت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام پس، قرآن کریم کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔

۱۔ تعلیم احکام　۲۔ تہذیب اخلاق　۳۔ تنظیم اعمال

عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے، دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت کیسے ممکن ہو؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت راستے بھی کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی، منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے، طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ:

## طریقت

طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مبانی و اصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخلی و خلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔۔۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح و فلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو نہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے، بہر حال خلوت پسندی سے اسے کوئی

طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اداء حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا' ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے' شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے وہاں فرار عن الخلق ہے اور یہاں ذھاب الی الخلق۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر' اپنے قبیلہ کا' پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست ادھر سیاست کے دائرے میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید ومدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عباد تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عباد سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحراء و جبال' زمینوں اور ان کی پیداوار' دریاؤں اور ان کے بہاؤ' حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور انکی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود قصاص الگ ہے اور جہاد و جانبازی الگ' احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک جھنڈا بلند کرنا مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سر بلند کرنا۔ مبطلوں کا زور توڑنا اور محقوں کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی و روحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلاب کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاد' انسانوں سے گزر کر حیوانات' حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپہ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں' جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں بس کوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوت محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوت کا مخزن "طریقت" ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع "سیاست" ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے خلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت وسیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور نجابت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت وسیاست نہ ہو تو وہ شدت وجمود محض ہے۔ مگر سیاست کے ساتھ شریعت وطریقت نہ ہو تو وہ نخوت وتجبر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے شان سب میں کمال ہونے کی ان جامعیت ہی سے پیدا ہوسکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے، پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت وسیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر وقہر فنا ہو جاتا ہے۔

پھر شریعت وطریقت کی کسمپرسی وبے بسی کا بدرقہ ہے سیاست جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایۂ عظمت وحفاظت بنتی ہے۔

پس جب طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہوگئی۔ شریعت کے ذریعہ عالم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہوگیا اور سیاست وقوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذ کی قدرت پیدا ہوگئی تو اب سیاست میں تو نخوت وتجبر نکل کر وقار وخودداری اور شہامت آجائے گی۔

طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی وجمود، تنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر، جامعیت ہمہ گیر، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا۔

جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔ جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جارہی ہیں اور ان کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جارہے ہیں اور اس طرح شریعت وطریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ مل کر ایسی طاقتوں کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی

طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم امیختہ نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص، صوفی، صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

## اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں

وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جز علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم واجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اور جور واستبداد کا ملک ہو گا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس، بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن وچین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالمی بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پرامن ہوتا۔ کیونکہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کیلئے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسناکی قانون کے دائرہ میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم وستم خوب سیکھتے جا رہے ہیں اور یورپ کی ساری دنیا قتل وغارت اور ہوا وہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ وہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونہ عمل۔۔۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت وخواری فقدان سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اسکے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں اگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور

علم واخلاق بلا شوکت بے بس، بے کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساق و فجار طبعیتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں۔ ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سنت سیئہ کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقویٰ و تقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا، وہ بھی فجور کا غلبہ و استیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس، بے بس رہ جاتا ہے جن میں ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آکر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت دراست بازی کی کمی نہیں بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیر تشنیع و ملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اینٹی ملازم تکفیر اہل حق ازالہ اثرات علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک، بدعات، محدثات، منکرات و فواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترعیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھول دے اور جب چاہے بند کر دے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے اور اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت، ہلاکت، طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات، الحاد، دہریت بے دینی، شرک و بدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن و چین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نیدین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنچایا جس سے دیانت و سیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہو گئی اور سیاست کا جور و استبداد دیانت سے پامال ہو گیا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

الملك والدين توامان.

"ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے"۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

بعثت مرحمة وملحمة۔ (حدیث نبویؐ)

"میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ جو بنا کر بھی"۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

انا الضحوك القتال

"میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی"۔

ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا:

لایزال من امتی امة قائمة بامر الله (ای الدین) حتی یاتی امر الله. (ای القیامة) الجهاد ماضی الی یوم القیمة

"میری امت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔"

قرآن نے نبوت کی بھی مدح سرائی کی جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سر منشا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاۤءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (القرآن)

"اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں"۔

## دین ' سیاسی نظام کی حیثیت میں

اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمۂ توحید' صلوٰۃ' زکوٰۃ' صیام' حج' پر رکھی ہے ایسی ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے' جماعت' سمع' طاعت' ہجرت' جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسان نفوس' انسانی ذات البین اور قلوب رواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات و عبادات' اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کیا بواب قائم کئے وہاں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملی احوال درست ہوں' فتن کا استیصال اور قانون الٰہی کے رواج پزیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص' تعزیرات و کفارات' جہاد اور سد ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا مقتدر نگراں اور امام بنادیا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری' دیوانی' نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوۃ' امامت جنائز' ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاذ کے بھی ہوگا تاکہ ان کی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ' خوف الٰہی' طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کردیا ہے تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا و آخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

## دین اور سیاست کی علیحدگی

بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے' ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات' تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھر بار' اولاد بنیاد عزیز واقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت' ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداء حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیرووں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اس رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہے اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذاہب کی بنیادوں کو کمزور کردیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق' تمدنی

ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو۔ اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی مدد و معاون خادم ہے، ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست ے معنی سیاست عصریہ کے نہیں بلکہ سیاست شرعیہ کے ہیں جس کی بنیاد علم واخلاق، تقویٰ وطہارات اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جاسکتی، ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کی بقاء واستحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیا علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئی، جیسے نبی اسرائیل وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ، شاذ و نادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودی دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم ﷺ میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (القرآن)

”یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور نیک کام کرنے کا آرڈر دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے“۔

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض وغایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض وسماء کے

کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔ اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سدراہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنہ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام کا نا شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنہ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے۔ تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنہ شہوات جبکہ علم صالح میں مخل ہے تو وہ از قسم ظلم ہوگا اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعۂ علم و اخلاق۔ انبیاء کا مقصد چونکہ امانت پھیلانا ہے۔ جس کی راہ میں یہ فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم و جہل جبکہ انسان میں جبلی تھا تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات و شہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی پس طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا تا کہ خلق خدا امن و سکون کے ساتھ اس علم و خلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت و عبادت الٰہی فرائض انجام دیتی رہے۔

## اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج اس کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چونکہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اسے ملنا چاہئے یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام۔ قومی یا نسلی یا وطنی حقوق ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہئے ورنہ پھر جنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے، جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ثلث آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

**اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ** اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار پر کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے زمین کے بارے

میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَاءُ.

"بلا شبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے"۔

یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وارث حصہ پا سکتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً.

"میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں"۔

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی یعنی مالک الملک خدا۔ ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے، اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے، ذاتی طور پر نہیں۔

مال کے بارے میں فرمایا

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتَاکُمْ.

"اور لوگوں کو اللہ کے اس مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے"۔

یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے، جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ۔ (القرآن)

"اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا"۔

یہاں رازقیت اللہ کیلئے ثابت کی گئی ہے جو اس کے مالک ہونے کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کے دلیل ہے۔

حکومت الٰہی اس طرح حکومت واقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ.

"حکم منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں"۔

اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔

ایک جگہ فرمایا۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا.

"اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا

رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ انکو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانیگا وہ صریح گمراہی میں پڑا"۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامر الٰہی کے بعد بندہ کے چون وچرا اور لم و کیف کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت' آمریت' اور اقتدار' حکومت صرف خدا اکیلئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

### الحکومت والجہاد

چنانچہ قرانِ اول کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کر لو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت وسیاست اور چشمۂ علم و اخلاق ہے یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کر لو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آجاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب وسلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کر لو اور اپنے ملک میں آباد رہو ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

### اسلامی جہاد کی غرض وغایت

پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض وغایت زمین وسرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا خود مسلمان کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہو سکتا بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

"لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا"۔

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد۔ اشاعت دین الٰہی' اقامت حکومت الٰہی'

حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کونسی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے اسمیں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے۔ گریز اگر ہو سکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان' انسان اور اقوام' اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کر کے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی بلکہ صرف اسلئے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو' اسے ملک گیری اور طمع جاہ و جلال سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ ہزار ملک فتح کر کے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے' اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع و فساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔

## ایک لمحہ غور و فکر

اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت' قومی اقتدار یا کسی خاص خطہ زمین پر مخصوص انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی نہ ہوں تو وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پر سکون ہو جاتا ہے اور خود مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں'

تعلیم احکام' تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعوے میں معنی بھی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

## خلافت راشدہ کے بعد

میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر

میں جس قدر بھی قومی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں' انکا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔ یعنی ناکامی یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد (جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں' پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زیردستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی یا رہی تو راہ مقصود نا معلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت' اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

## ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال

تفصیلات کا موقع نہیں لیکن اصولی طور پر اب اس کے مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی باگ دوڑ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جہالت ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

## حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

## حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ

۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند'

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی نا تجربہ کاری اور نا تیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

**عصر شیخ الہندؒ** ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا شیخ الہند کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردہ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلاب کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

**تحریص عمل** اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے۔ رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی:

تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ۔

جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت دین الٰہی اقامت حکومت الٰہی، تنظیم حیات انسانی۔

**اشاعت دین الٰہی تعلیم:**

اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔ جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، جس کا متکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔ کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔ اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب و سنت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی

مدافعت کر سکیں۔

**قاسمی علوم اور فلسفہ**

میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظر انداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا میں اتر سکیں۔

**مرکز علوم دار العلوم دیوبند**

ہم اپنے تجربہ اور سالہاسال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانئ دار العلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہی کی حکمتوں کا نچوڑ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے تو یہ اس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔۔۔ اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دار العلوم دیوبند ہے، ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجۃ اللہ البالغہ اور تقریر دلپذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

**مستقبل کا تعلیمی پروگرام**

اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکومت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست، مبادیات سائنس، سیاست حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کر سکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔ قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

**مسجدی تعلیم**

مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔ اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے، ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں میں ہوں بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری

ہیں۔ مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کردیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کردیئے جائیں جو ضروریات دین، عقائد فرائض، اخلاقیات، معاملات و معاشرت اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

## درس قرآن

بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بہ ذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

## تبلیغ

لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب و مساجد کی بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیا علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

## تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں

تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت و اکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔ مکہ میں کلیت کفار کی تھی، تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔ مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ ابتداء جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی، پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت و اکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کی حل کردیا۔

ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہو گئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر و اشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم و غیر مسلم کشاکشی سے نجات پا گئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کرلی گئیں جو تبلیغ سے ممکن تھیں وہیں یہ کشمکش قائم ہے۔

**مسلم سلاطین کا قصور**

اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت و اکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

**نقطہ اتحاد**

بہر حال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کی متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہر حال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈالدے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزءِ اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ:

وَمَا اسئلکم عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

”اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے“۔

اس کیلئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اس اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے، تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہو گی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

**طریق تبلیغ**

تبلیغ میں اسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت ﷺ نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی --- تبلیغ

الاقرب فالاقرب کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے، پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قربت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اسی طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار قائم ہو کر تبلیغ کو ہم گیر بنادے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔ تذکیر اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض یہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاددہانی کریں۔ موعظت ونصیحت کا بازار گرم ہو کہ

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (القرآن)

"باربار یاددہانی کرو۔ کیونکہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے"۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی، بہر صورت اس میں ایک جزء اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شاندار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا، جس کا مرکز ومحور سیرت مقدسہ نبوی ﷺ ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہؓ کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل ودماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر جائے گا، بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزء جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم وتبلیغ اور درس وتذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ:

"دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا"۔۔۔ اور "دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں؟"

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آسکے گا۔

### عسکریت

ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس ومکاتب وغیرہ میں ایک اہم الاہم جزء کی اشاعت وترویج بلکہ عملی مشق وریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزاء تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور مضمحل بنادیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش سپہ گری لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ سکھلائے جانے کی ضرورت ہے وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کماحقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے، کیونکہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح و جنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت ہے وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین مبلغین مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

## تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم

اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کار آمد ہوسکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشقت کی حاجت ہے جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لاسکتے ہیں جبکہ ان کے اپنے قلوب مزکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق و عفاف، للّٰہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

## صورت کا اثر سیرت پر

مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہؓ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے

اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہو جائے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ.

"خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے"۔

**خانقاہیں**

پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ و ریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند عامۃً دوکانداری کے اصول پر قائم ہو گئی ہیں رسمی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول کے سوا کسی تربیت کا کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہرحال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہؓ کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے، ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بد نے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔

اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اسلامی فریضہ ہے، لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کر کے جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلاف شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزء اصلاح اخلاق ہے ورنہ اس

کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں نے سیاست کی بحثیں کیں اور عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ انہوں نے طریق اصلاح میں الہام کی بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مسائی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

### خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم

بہر حال یہ ضروری شعبے اشاعت دین الٰہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔ قرآن نے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ سے تعلیم کی ضرورت، بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ سے تبلیغ کی ضرورت، وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ سے تذکیر کی ضرورت اور وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّااسْتَطَعْتُمْ سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ اور يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَايَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ سے تعلیم صنعت و حرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ وَيُزَكِّيْهِمْ سے تصفیۂ باطن کی ضرورت وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت ہے اور حدیث الدین النصح لکل مسلم سے جزئی روک ٹوک اور نصیحت کی ضرورت الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنابنایا موجود ہے، ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عمل دنیا میں آسکیں۔

### اقامت حکومت الٰہی

سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کر سکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلاف در حقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کر لے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔

ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیونکہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات، اسی کے واحد کلام، اسی کے واحد کعبہ، اسی

کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا۔ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی "کتاب اللہ" کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے کیونکہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اس کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو، ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو، ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کر دے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو، آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہری کی پادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں، گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

## حکومت الٰہی اور قانون الٰہی

کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکمت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ اور نکاح و طلاق تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر بار، جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اس مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع و رغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔

پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعویدار کس منہ سے ہو سکتی ہے؟

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جا سکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

**حفاظت نظام زندگی** "آزادی" اس نصب العین (حکومت الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے، سو اس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیونکہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے جو نبی کریم علیہ السلام کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الٰہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادئ ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِا اللّٰہِ حَسِیْبًا.

لَایَخَافُوْنَ (فی اللّٰہ) لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔

"یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ یہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے، پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں)"۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ. (القرآن)

"کفار پر سخت اور آپس میں مہربان"۔

بہر حال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار مروت، ہمدردی و محبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیار بانیوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ و سلام، عبادت الٰہی، شفقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتامیٰ و مساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی ظالموں کی بیخ کنی، اداء حقوق، دفع مظالم، سادگی بے تکلفی، قناعت و زہد، حب آخرت، طلب حق، انصاف و حق پرستی، امت مرحومہ کے جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ، وہ ابواب ہیں جو اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوہ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہو جاتی ہے۔ آزادی مذہب، آزادی ضمیر اور آزادی علم و عمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ

حسنہ کو سامنے لا کر با آسانی کر سکتے ہیں کہ وہ اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں "اشاعت دین الٰہی" اور "اقامت حکومت الٰہی" کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

## دفاع ملی

دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی، آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا، جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

## جمعیت علماء ہند کے پچیس سال

اس دوران آج تک کونسی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہنچا دیا جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ چلایا جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی جس نے شدھی کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں، نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور ساردا ابل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہند ہی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی، اس کا نصب العین مستقل، اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارے سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اس کے کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جا رہی ہیں۔

بہر حال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔ اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔

لیکن اس کا قوام آج سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

### جمعیت علماہند تاریخ کے آئینے میں

جمعیت علماہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز، شاداب درخت کی مانند ہے جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو بعون اللہ حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالاکوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی، اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی۔ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے، کیونکہ ماضی وحال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔

### بزرگان دیوبند

حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کرسکتے جہاں خاندان ولی اللہی کی چشم وچراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہوسکتی ہیں جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانئی دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جاسکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہیؒ قید وبند سے دوچار رہے۔ نہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جاسکتی ہے جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

### ۱۹۱۴ء کے مجاہدین

۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم وعمل میں حضرت شیخ الہندؒ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔ آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ

اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند ؒ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلاع ہونے کی امید سے گزار رہے ہیں۔ انہوں نے حجاز افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔ روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند ؒ کی سیاسی فوج میں صرف اس کا ایک سپاہی کا ایک لمحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

## حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی ؒ

حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلہ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم ؒ بانی دار لعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر مکی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص وایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

## حضرت مفتی اعظم ؒ

اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایۂ فگن ہیں حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم وتدبر کا روشن مینار ہیں جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پا لیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقع ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہر حال جمعیت علماء کی رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے جس کی ابتداء حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہر حال جمعیت علماء اور اسکے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی

آزادی غلامی کی صورت میں تبدیلی ہوئی گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدو جہد عسکری رنگ کی بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے تاکہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور و فکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

## تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ

اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہر و دیہات میں اس کی ہمہ گیری، درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گیری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر و موعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ۔ فصل خصومات محکمۂ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب، عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بد نظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائے گا لیکن اس کو چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگرام کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر عمل و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسری انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب

برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی ؟ اور کی جاتی تو وہ نوع و رعیت سے چل کیسے سکتی تھی بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعہ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے ؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور دل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کریں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہر حال جماعت اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

### کانگریس اور لیگ

کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں نے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول لگے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوا نیزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لے جا کر غرق کر دیا۔

### کانگریس کی تاسیس

کانگریس کا قیام در حقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومت برطانیہ دولت عظمیٰ بنا چاہتی تھی اور اسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی جو ہندوستان کے انقلابی رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کر دے۔ نتیجہ صحیح بر آمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہو گئی اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

### کانگریس ۱۹۱۶ء میں

۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پر جوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہ دیا جانا بے جانہ ہو گا۔ مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس کے موجد کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گزارنے اور سو بار۔۔۔ پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا' مجھے اس سے بھی انکار نہیں لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں' مگر کماحقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

**ایک واقعاتی لطیفہ** یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریبان ہے یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہی ہیں جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجود بھی ناممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں' دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے، تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔۔۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آکر رکا ہوا ہے۔

**مسئلہ پاکستان** ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے' الہام نہیں ہے۔ دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جن کا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے' لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کر دیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ

لینے پر قناعت کریں بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کر دیں تا کہ جن مسلمانان ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

### مخالفین پاکستان

ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نا اتفاقی اور اختلاف ہے' جب تک تمام ہندوستان متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا انمول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کر سکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کر لینا چاہئے' فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں پر چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے نیچے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہو گی تو وہ خود ہی رہ جائے گا محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہو جائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہر حال یا اس کی توضیح و تشریح سامنے آئے تا کہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جا سکے اور یا اس کے ابہام و اجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کر کے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تا کہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کے سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہو جائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان ہی عائد ہو گی۔ کیونکہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ الاتحاد قبول کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع و ضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہو سکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کر دیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہیں پر ہے جو نہ اسے واضح کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کی صحت و سقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کر لے تو پھر بلا شبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جس کا الزام تنہا

مجوزین پر عائد نہیں ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور و فکر کر لیں مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہو جائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حاصل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے۔ بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول و عدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کر سکتا۔

### جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم

اس لئے ناگریز طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کر سکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے جس نے اس وقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی راہنمائی کی جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاں سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو سیاسی جہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب و سنت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور کتاب و سنت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مسفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں۔ کہ وہ اس کے کھرے کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کر دے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کر سکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت و مصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

### جمعیت علماء ہند کی قدر و قیمت

ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب و سنت کے اصول پر ہو اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للّٰہیت

وبے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام وکامل دولت ہند کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا خبر ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہو اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل وعقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقع دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔

ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے امت کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آرہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص وللّٰہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْيُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَافِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْيَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دار العلوم دیوبند

۱۵۔ اپریل ۱۹۴۴ء

☆☆☆☆☆☆☆☆

# مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کراس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو "اسلامی معاشرت" ہے، ہم اسے قائم کرکے رہیں گے ۰۰۰۰۰ سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل در آمد ہو اس کے اوپر ـــ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں۔ مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

از حضرت الاسلامؒ

## حسن مقام

بزرگان محترم!

آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن و خوبصورتی، فضا کی وسعت، آب و ہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا کہ اگر میں وزارت عظمی سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر ہے۔

### مرکز جہاد و شہادت

سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے ان کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی معلوم نہیں کتنے افراد کو انہوں نے جام شہادت پلایا ہو گا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ ان ہی شہداء کی اولاد آپ ہیں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

۰۰۰ ولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو

احساس نہ ہو "الولدسر لابیه" باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی ولولہ بھی رکھتی ہے۔

**اکرام ضیف**

اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جذبہ دکھلایا ہے وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفه.

"جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے"۔

اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ، نظم کی خوبی کے ساتھ مہمانوں کا قیام، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کررہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبہ سے حضرت مولانا ابوالسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کررہے ہیں یہ عالی ظرفی اور قدرشناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرمادے یعنی برس کر گرماتا ہے کہ وہ پھر آمادہ ہے برسنے پر اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ سخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کررہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کردیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمانداری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

**حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر**

لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں

محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلادیا کہ لامحدود شکریہ کس طرح ادا کردیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا:

اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا

"اے داؤد! میری نعمتوں کا شکر ادا کرو"۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الٰہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دیجاتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دی جاتی بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان کی ہی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکت سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکر ادا کرو۔ اس شکر ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکر ادا کرسکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے۔۔۔ تو یہ توفیق دینا' طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگی' پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت ہوگئی' پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اسکی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی' پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح کروں شکریہ کو ادا کس طرح سے کروں' ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکر ادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اے داؤد جب تم نے عجز کا اعتراف کرلیا اور تم شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کون ہے جو شکر کا حق ادا کرسکے۔

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود' طاقتیں ہماری محدود' ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کماحقہ ادا کرسکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کرلے کہ بھئی ہم شکر کو ادا نہیں کرسکتے تو یہی ادائیگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سا لازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو اعتراف کو لو عجز کا کہ بھائی! عاجز ہیں۔ نہیں ادا کرسکتے شکر کو' یہی شکر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

## طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

ایک طریقہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود' وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمائے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنادیں۔ جب حضور ﷺ نے اللہ کی حمد کی اور شکر ادا کیا کہ:

اللھم لک الحمد حمدا دائما مع دوامک

"اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے"

اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔

اور فرمایا کہ:

ولك الحمد حمداً خالداً مع خلودك. (الحدیث)

"اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے"

تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ:

ولك الحمد حمدا لامنتهی له دون مشيتك.

"اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے"۔

اور تیری مشیت کی کوئی انتہاء نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کر سکے تو اعتراف عجز کے بعد یہ بھی کہدے کہ یہ حمد دوامی ہے تو اللہ ان لفظوں کو دوامی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوامی بن جاتا ہے۔

### اظہار تشکر

اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس مہمانداری پر شکریہ ادا کریں، اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے ---یہ تو ہے داؤدی اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی نسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوامی شکر ہو گیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوامی شکریہ بھی ہے۔ پھر انشاء اللہ دوامی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

### پرسنل لاء کا مفہوم

بہر حال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر ظاہری اور باطنی خصوصیات ہیں جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہے؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوال شخصیہ کے بارے میں مذہبی ہدایات پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی افعال واحوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، ہبہ ہو، میراث ہو، یہ سب

چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ نکلے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

## دنیائے انسانیت کا قانون

لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون در حقیقت اسلام کا ہے مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔۔۔ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیائے انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے۔۔۔ ان لفظوں سے کہ "مسلمانوں کا قانون" ایک تعصب اور ایک حد بندی ٹپکتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمان کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا، وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چونکہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور وفکر کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

كان النبى يبعث الى قومه خاصةً وبعثت الى الناس كافةً

ہر پیغمبر اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرہ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے نبی اسرائیل کے انبیاء کہ وہ نبی اسرائیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرائیل سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں اور قوموں سے میری کیا غرض ہے، میں تو اسرائیلیوں کے اصلاح کے لئے آیا ہوں"۔

تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو كان النبى يبعث الى قومه خاصةً

ہر پیغمبر اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔۔۔ مگر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ:

وبعثت الى الناس كافةً

”میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں“۔

اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ عبادت عامہ عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا:

”یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ“۔

”اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو“۔

”یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعاً“

”اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں“۔

تو خاص نسل خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں

**مبنائے تعصب**

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصّبات ہیں اس کا مبنی یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا، میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں تو اب دنیا کے قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہو گی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

**قانون فطرت**

بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچالے جائیں نہیں ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو، اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں۔ یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک اور

اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

## ذات انسان پر نفاذ قانون

افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضغہ گوشت ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز، مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھادیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جوہر ہے۔

اشهد ان لا اله الله.

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"

اشهد ان محمدا رسول الله.

" محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں"۔

جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آگیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے، فرمایا کہ حی علی الصلوٰۃ سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس کے دل میں جمادیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے " حی علی الفلاح" عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

## ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت

اب رہا یہ کہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان اذان میں کہیں اور بائیں کان میں تکبیر یہ ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا وہ دیوار کیا سمجھے گی لیکن یہ چیز غلط ہے، بیشک اس بچہ کو عقل نہیں شعور نہیں لیکن اب بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد قبولیت کی ہے جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر، جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھپتی جارہی ہے۔ اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامد محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اس میں جم جائیگی۔ جب آپ اس کی کل اینٹھیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گیا گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے

اس کی تخلیق کی ہے تو وہ عقل خود کتنی بڑی ہو گی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشو ونما پائی ہوئی نہیں ہے لیکن جوہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

### دور تربیت

اس سے امام غزالیؒ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں میں بٹھا دو اب تربیت شروع ہوتی ہے۔ نہیں فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حق اور سچی ہوں۔

تو امام لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشو ونما پا کر ابھرے گا اور وہی کہے گا اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حقیقی اور سچی کریں، عمدہ کریں تا کہ اس کے دل میں وہی بات چھپ جائے اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کی مانند ہیں اس کے دل میں گو شعور واحساس نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ تو امام لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔ اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔ تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔ خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں۔۔۔ تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

### نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون

فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیونکہ اس کے بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا، بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے، اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اسکی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آ گیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے اذان کہہ دی، تکبیر کہہ دی، اب نماز باقی رہ گئی۔۔۔ علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس اذان اور تکبیر کی، آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔ تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔ گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام

سے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جا کر ہوئی تو ابتداء کرو اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کرو اس کی نماز کے اوپر تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آ جائے گی، عظمت خداوندی، توحید خداوندی توحید الٰہی، اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہوگا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔ نفس تو موجود ہے۔۔۔ تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا۔ افعال تو بعد کی چیزیں ہیں۔ تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہوگا۔ وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔ وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔

### تعلیم فطرت

ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الٰہی اور رسالت کی شہادت اس کے دل میں ڈال دو۔ حی علی الصلوٰۃ کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔ معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔ کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے نہ تمہارا قانون۔ یہ تو خدا کا قانون ہے جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں اب موقع آئے گا ان کے غور و فکر کا کہ جب ہمیں بھی پیغام دیا گیا ہے تو بھی اس پر غور کریں۔

### اسلام پرسنل لاء

اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے، یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابد الآباد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی۔ حشر میں اور ہوگی، جنتوں میں جا کے کچھ اور ہوگی۔ مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے ہوتی رہے گی۔

### پرسنل لاء کا تحفظ

بہرحال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جو ان کی

ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو، تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو، اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو۔؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں، کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی کہ اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے، وہ رکھا ہوا ہو اور آپ شور مچائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا، اس کی حفاظت آپ کریں۔

## طریق تحفظ

قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کر رہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رچالیں، اس پر عمل در آمد شروع کر دیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

## ذرائع حفاظت کی سعادت

پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے، کوئی کتنا ہی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔

"ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

تو حفاظت ہوگی اللہ کی، اس میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ۔

"تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے پھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی"۔

وہ اس دین کی حفاظت کریں گی اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سبب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے لیکن آج ان دشمنوں کا نام ونشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں انکار کرنے والے گزر گئے آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اس کی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدیوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ در حقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت لاء کی حفاظت کے لئے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مدمقابل سے لڑنے کو تیار ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہو گیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا ورنہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے، انسان کی برتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا و آخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا۔

## دین اور رسمی قوانین کا فرق

اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسمیں ادا کر لیں بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عملدر آمد کر کے آپ ظاہر افعال بھی ادا کریں مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے، یہی فرق ہے دین میں اور رسمی قانون میں۔

رسمی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا تو قانوناً اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کر سکتا جیل خانے میں جا کر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

توبھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظر عام پر وہ قانون چلتا ہے لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاظت اس کی سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاظت۔ توجرائم کی نفرت بٹھادینا جرائم سے بیزار بنادینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

## مسلم پرسنل لاء کا منشاء

مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور چہروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل در آمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسمیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسمی باتیں ہیں جن کی حفاظت کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ ہم اس کی حفاظت کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کر کے دیکھ لو ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو یہ زندگی بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

## مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد

تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شور اٹھا اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مضر نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہٖ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا شر اٹھا۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلی کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے آج آپ کے سامنے یہ سربراہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں ہر تنظیم کے سربراہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلی ہے اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی تو یہ شر ہمارے لئے مضر ثابت نہیں

ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہم میں جذبۂ اتحاد پیدا ہو گیا۔

خدا شرے بر انگیزد
کہ خیرے دراں باشد

بعض دفعہ شر اٹھتا ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اسی میں خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمت اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں، آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی، عناد و دشمنی عام آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آکر انہیں متحد کر دیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً

"اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے"۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ فاصبحتم بنعمته اخوانا یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم آپس میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

## نعمت تالیف قلوب

تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملا دینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ساری تنظیمیں آپ اکٹھی کریں مگر دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قوی ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ.

"اے پیغمبر! (ﷺ) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کر دیتے تو دلوں کو

نہیں جوڑ سکتے تھے۔ دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے"۔

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔ دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کردی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفتوں میں ابھرا ہے۔ مگر مخالفین نہ ہوں اور اس سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

## مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد

غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔ اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پانی، ہے ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ ویسی ہیں موجیں ہی جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کوئی ترقی نہیں۔ آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔ وہ پھول بوٹے نہیں بناتی زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔ آپ جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔ لیکن پانی کو اگر آپ ملا دیں مٹی سے اور ٹکرا دیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے کہیں اینٹیں بنیں گی کہیں سامان بنے گا۔ بس ترقی شروع ہو گئی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ آگ کو آپ ہوا سے ٹکرا دیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہونگے کہیں گرج ہو گی، کہیں بادل ہوں گے کہیں بجلیاں چمکیں گی۔ اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ رہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ کڑک نظر آئے نہ بارش برسے گی۔ تو بہر حال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزار ہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔ لیکن اگر اس کو کسی جاہل سے ٹکرا دیا جائے تو اور وہ اعتراضات کرے تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں کھلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔ اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کی ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک حکیم کا مقالہ ہے کہ:

القلب میت و حیاته بالعلم وَالعلم میت و حیاته بالمناظرة

"دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے"۔

اور علم کی ٹکر جہالت سے ہوگی۔ علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔ جو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آجائے تو داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔ نئی نئی صورتیں پیدا کرے گا تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ ترقی در حقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔ اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ.

"اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور قومیں بیٹھ جائیں"۔

ان کی ترقی رک جائے، لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھر نئے نئے عجائبات تمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ تمدنی ترقی ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم قوی ہے تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔ تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔ تو پرسنل لاء کو ٹکرایا لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔ اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہوئے۔ ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہوگئے انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔ آج سینکڑوں رسالے شائع ہوگئے سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔ سارے پہلو کھول کر رکھ دیئے۔ پتہ نہیں تھا کہ اس پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔ اتنے پہلو واشگاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس، اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کر لو اس پر، مگر ٹکر سے آپس میں ترقی ہوئی عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو، جتنی مخالفت

ہو گی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آجائیں گے۔

اسی لئے کفار کو ٹکر دی گئی مسلمانوں سے، فساق کو ٹکر دی گئی متقیوں سے، منافقوں کو ٹکر دی گئی مخلصوں سے تاکہ مخلص کا اخلاص کھل جائے منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر بر سر عام آجائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہو گئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔

تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنیوالوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں، مسئلہ اور زیادہ واضح ہو گا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آجائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات تو تھی جس سے لڑ رہے تھے اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا، یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

## مبنی بر حقیقت قانون

اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آکر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہدیں کہ یہ بیٹا ہے بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہدیں کہ یہ باپ ہے وہ باپ بن گیا۔۔۔ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنا دینا در حقیقت فرضی اور مصنوعی بات ہو گی۔ حالانکہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے، اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ بیٹی بن جاتی ہیں۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ.

"وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے" ایک قطرہ پانی سے جو مردہ محض ہے"۔

زندہ انسان پیدا کرتا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقۃً بنا ہوا ہے۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے جو باپ ہے وہ باپ ہے تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادم ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا بس ہو گیا تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون بناتی ہیں وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

## پرسنل لاء کی خدمت

بہرحال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلندیوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحاد طبقات کی، وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔

من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ.

"جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں"۔

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔

دے بھی رہے ہیں شرما بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی نسلیں باقی ہیں

آپ کے لئے دعاء ہے، اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام ونشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوامی کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوامی ہو۔

### دوام شکر

انسان تو ہے ہی دوامی، انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا اس سے پہلے انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا

"انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشی محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر"۔

کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زید کون ہے اور بکر کون ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ.

"ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پلٹتے رہے اس کو"۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔ زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کیا لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہو گیا یا ختم ہو گیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔ اس دار سے دوسرے دار میں اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔ تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف، ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا مگر مٹ جائے انسان، یہ نہیں ہو سکتا، نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے ایک عالم تھا۔ اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی وہاں سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گئے۔ اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ، ستر اسی سو برس کی ہے یہاں رہے، یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے جسے آپ قبر کہتے ہیں۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔ قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔ پھر قیامت آ گئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہو گا پچاس ہزار برس کا، لہذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔ اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزرنے کے بعد منتقل ہوں جنتوں کی طرف۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلتا رہے گا ابد الآباد تک۔ اس لئے آپ بھی باقی، ہم بھی باقی، آپ کے اخلاق بھی باقی، ہمارا شکریہ بھی باقی۔ دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنتوں تک ساتھ جائیں گی۔

## وحدت خیال ووحدت قلوب

بہر حال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلہ عظیم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے، اس کو عام کیا اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔ اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ در حقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔ وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنیوالے ہیں۔ ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔ یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں عبادات، معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ فلاں مسئلے کو اگر بدلا گیا تو یہ خطرات ہوں گے پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آرہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ آپ کا اتحاد باقی رہے۔۔۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست ہوں میں نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے، دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آجائے، جگر کے اندر پیوست ہو جائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے اور وہ دوستی کب ہو گی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور جب خیالات میں آگئی وحدت میں تو خود بخود اتحاد پیدا ہو گا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الٰہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن وحدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آنچ آپ کے میرے خیالات پر نہیں آرہی ہے اس وقت تو آنچ آرہی ہے کتاب وسنت پر ان کے مسائل پر لوگ تغیر و تبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کرلے قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہو گئے لہٰذا وحدیث خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

## اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی

اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہو سکتے اور اخلاص

اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک ' الگ الگ مقصد نہیں ہو سکتا ' تغیر و تبدل ہم یا آپ تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی ارشاد فرمایا گیا آپ بھی اعلان کر دیں:

قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ.

"میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں"۔

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں اللہ کی طرف سے جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم و کاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ تو حضور بھی جس تغیر و تبدل کے مجاز نہیں میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہو جاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہو جاویں گی؟ یہ تغیر و تبدل کرنے کھڑی ہوں گے تو لامحالہ مقابلہ بھی ہو گا اور مقابلہ ہو گا تو ہماری مدد بھی ہو گی۔

## بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی

مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں مدمقابل ہے بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آنچ آ رہی ہے آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑا دو اور کہہ دو کہ یہ قرآن و حدیث میں تغیر کرنا چاہتے ' قرآن والا خود ان کو سمجھ لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہو گی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے خدا کو کون مغلوب کر سکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آڑ لیں قرآن و حدیث کی۔ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہیں نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے ' سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ.

"اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو"۔

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد ہماری ذات

پر حملہ نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الٰہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑلو۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے، ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کر دیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کرو گے تو مجرم ٹھہرو گے خدا کے ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں، تم نمٹ لو۔

بہر حال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کر دیں اور یہ بھی کہدیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے، بس اتنا آپ کرتے رہیں۔

اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہو کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

### شاہ حبش کی شکست

آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابرہہ نے یہ حبش کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے، (معاذ اللہ) تاکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے ارد گرد اس نے گھیر اڈال لیا اور ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ مسمار کر دے اور ڈھادے۔ تو اس نے عبد المطلب کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آکر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ عبد المطلب آئے ان کی بڑی تعظیم کی بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں میری چند املاک ہیں ان کی آپ حفاظت کریں، ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب اسے مسمار مت کرو اس پر حملہ مت کرو تو اس نے عبد المطلب سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخصی ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھادوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

تو عبد المطلب نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے خدا آپ سے خود نمٹ لے گا میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے آیا ہوں خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس ہاتھیوں کے پرخچے چند چڑیوں کے ذریعے اڑا دیئے بیت اللہ اسی طرح قائم رہا اس کے ہاتھیوں کے اور اس کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

## پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ

ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اپنے اندر اس کو رچالیں اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں گے اور اسی کا اعلان کریں گے جو تمہارا جی چاہے کرلو تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل در آمد نہیں، اگر عمل در آمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بدعملی نے یہ راستہ دکھایا ہے اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے ہم اسے قائم کر کے رہیں گے۔ پھر کروڑہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں یہ سارے مل کر اگر عمل در آمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل در آمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دے دی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جا سکتی ہیں مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

## فریضۂ مسلم اور ادائیگی شکر

یہ اعلان کر دینا آپ کا فرض ہے اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے اس لئے یہ جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی بلکہ مقصد آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر جم جانا چاہئے۔ علماً بھی عملاً بھی اور اعلاناً بھی اور لزن عام بھی آپ کریں، مطلع کر دیں کہ یہ قانون خداوندی ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیر و تبدل گوارہ نہیں کر سکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت کی سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں۔ انہوں نے مجھے لا کر آگے بٹھلا دیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو

صدر بنا سکتے ہیں کیونکہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھادیں۔ میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے اس لئے ادا شکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کر رہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے! آمین۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم و تب علينا انك انت التواب الرحيم.

سبحان ربك رب العزة عما يصفون.

وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين.

............

# اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانے پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہو گی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں میں آزادی اور جرات کی فضا پیدا کی تا کہ اسی جرات و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے۔۔۔اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبر دار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا منادی ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ، وَنَسْتَعِيْنُهٗ، وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ،فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ، وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهٗ، اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّ نَذِيْراً وَّ دَاعِياً اِلَيْهِ. بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِيْراً اَمَّابَعْدُ

## آزادی کا مفہوم

بزرگان محترم!

اسلام، آزادی کا سب سے بڑا حامی و علمبر دار ہی نہیں بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیونکہ عقل کی تگ و تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیسٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو ولعب، نفسانی عیش ونشاط، ملکوں میں آمد ورفت، ہوائی یا بری و بحری سیر وسیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام و طبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے ہیں تو غلامی اور غلام سازی کے لفظ

کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت ' عدل و انصاف اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے' ضعیفوں کو ابھارنے' بے کسوں کو سہارا دینے' ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور قوی کو ظلم و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت و قدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست و پائی ختم ہو جائے۔

## آزادی کا اسلامی نصب العین

آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَافِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآئَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَ هُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ.

”فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کی بیٹیوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا۔ ہم ان کو پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں اور ان زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کی اہالی و موالی کو (زوال قوت و شوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے“۔

اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرا لیا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور قوت کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں تاکہ کمزور' آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون و ہامان اپنی اصلی حد پر آ جائیں ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت و قوت کا یہی مقصد ہے اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنہ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری تو پھر اسلام

کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت واخلاق کے ساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔

پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا مدعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

**آزادیٔ ضمیر**

اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور اس یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل ودماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو، عقل وفہم اور شعور وادراک آزاد ہو تا کہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر وقہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل در آمد کرے وہ اسی کا عمل در آمد کہلائے انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے۔ ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل وفہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اسے بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے لیکن دلیل صداقت مسائل نہیں بنایا۔ کیونکہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت وبرہان سے واضح ہوتی ہے، خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی، بغیر حجت ودلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جسے اکراہ واجبار کہا جاتا ہے جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اس کے رد وقبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔

نکاح وطلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع وشراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز، امن وجنگ کے یہ اوقات ومواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں اور دلیل یہ بیان کرے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی

بولیاں سمجھتا ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضروری کھل جائے گی مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا، کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتی اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرادینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلادلیل مسئلہ کو تسلیم کرلے۔ کیونکہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائے گا لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

## آزادیٔ عقل وفہم

پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔۔۔ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا۔ حالانکہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لئے خوارق نبی کو نبوت کی دلیل تو کہا گیا لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل بن سکتا تھا۔ حجت و برہان اور فراست و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تولنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا۔ (القرآن)

”اور یہ (مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل و فہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ رہے“۔

پیغمبر (ﷺ) کو یہ کہہ دینے کا ارشاد ہوا کہ:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (القرآن)

”آپ فرمادیجئے کہ یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف سے اس طور پر بلاتا ہوں

کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادت کے نمرود سے استدلال بحث ومناظرہ فرمایا جو حجت وبرہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرانے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا، بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت وبرہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔۔۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم ﷺ نے جہاں ہزار رہا معجزات دکھلائے ہیں وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت وبرہان اور عقلی وحسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم الانبیاء ہونے کے طریق استدلال کا معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں، خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کو منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا ہے جس سے عقل وخرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا اس کی عقل کو آزاد کیا اس کے فہم کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہر حال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے جس کے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

**آزادیٔ رائے**

آزادیٔ ضمیر کے بعد مافی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانتاً ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے، کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے، اس کی تصدیق وتکذیب یا تصویب وتردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے، لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں، اگر رائے کو آزاد نہ کیا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حد ہے کہ

عام انسانی رائے پر پیغمبر کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرتؐ نے حضرت بریرہؓ کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیثؓ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں' بریرہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا' نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا تو میں آزاد ہوں۔ یہ رائے مانوں نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانیں۔ ایک طرف پیغمبر کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں، دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہرحال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اسکے باطن کو آزادی بخشی ہے، اس کی عقل' اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اسی پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کردے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیری ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دبائو سونے چاندی اور زروجواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ تیرو تفنگ اور بم وگیس کے دباؤ کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کرسکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس کر آنے اور اتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کردیا ہے کہ:

لَآاِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ.

''دین میں زبردستی نہیں ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے''۔

پیغمبر کو ہدایت دی گئی کہ:

اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ.

''سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں''۔

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرون انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر' انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

## ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے

ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو لفظی ترجمانی نہ ہو جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹیفک حقیقت و اشگاف فرمادی کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔(القرآن)

"واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے"۔

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے، جب اندر آ چکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے، باہر غلامی اس وقت آتی ہے جب نفوس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کرے تا کہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا منادہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

## باطنی آزادی

پس باطن میں تو اسلام میں آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسوی اللہ سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے اگر یہ اختیار حق اور رد باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستاران حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستاران باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

## ذلیل قسم کی غلامی

لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں ہو گی۔ فرعون وہامان بر سر اقتدار ہوں

گئے صلحاء صدیقین بے یار مددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عوام کی آبادی نہ ہو گی بلکہ بربادی ہو گی۔ جس کو احادیث صحیحہ میں علامت قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے اور جو اقوام عالم اور عالم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب آنحضرت ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

**ان تلد الامة ربها وان ترى الغفاة العراة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان.**

"(قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہو گی جب) باندی اپنی مالک کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ تم دیکھو کہ ننگ پیرے ننگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے چرواہے یعنی کمینے قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں"۔

یعنی کمینے برسر اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرفا جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہو گا مگر بنگاہ غور ذلیل قسم کی غلامی ہو گا جو غلامی حق کی بجائے غلامی نفس کی دلدل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔

بہر حال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل وخرد اور فہم وفکر کی آزادی ہے جس سے انسان بذات خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری اور بیباک ہو جائے اور آزادئ ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت وقوت پیدا ہو جانا ہے جو امر حق کے نافذ کرنے میں کسی پس وپیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لومۃ لائم کی پرواہ رہے نہ نصح ناصح کی۔

## صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزادی کرانے نہیں آیا بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزاد بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس وشیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت، پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہو اوہی آزاد ہوا اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔ اس

سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت و برہان سے پابند حق بن جانے کے ہیں۔

### آزادی کا معیار

آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے۔ اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجہ استبداد کو توڑ کر اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سد راہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے، اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزادی شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوس زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہ ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعا میں رطب اللسان ہوں، مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فَاسِقُوْنَ.

### اسلامی آزادی کے آثار

اسلام ہی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پسماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آ گیا۔ مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرانے رک گئیں، صنف نازک باندیوں سے حرہ ہو گئیں، بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرش خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و

تو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیم یکسانی، مالی توازن، جاہی ہمرنگی امیر غریب کے سنگ، اونچے اور بیچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے باہم کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزادروشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کیساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کار فرما تھا جو خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھری بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

"اسلام اور آزادی" کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیز ہو سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو' اس کے پاس ہو۔۔۔ کھلی بات ہے کہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہوسکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ان کے ہاتھ میں ہیں۔۔۔ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرۃ الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَ وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآ فَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.............اَمَّابَعْدُ..............

## عروج وزوال کا معیار

ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی وتنزل اور فناء و بقاء پہچانی جاتی ہے' مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے گرد وپیش کے حالات ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے' پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آسکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے' جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء باور کیا جائے گا اور اس میں اسکی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو اس کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر ان کے سامنے سائل اور

بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی چہ جائیکہ بڑھے اور پھلے پھولے لیکن استغناء کے معنی یک سوئی انقطاعیت گوشہ گیری اور علیحدگی پسندگی نہیں بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہو سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جمگٹھوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ وہ سائل بن کر نہیں محسن بن کر اور ایثار پیشہ بن کر گھسیں جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔

اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو اس کے پاس ہو کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہوسکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

## معلم وامام اقوام

اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجۂ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں اصلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کی دعوت عام اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے اس لئے اس کی ترقی وتنزل اور عروج وپستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہوسکتا ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ دیانت وسیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی خطۂ زمین پر آرام وآسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص وآز اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی اضطراب وگھبراہٹ اور پراگندہ خاطری کی صورت میں نمایاں ہوگا جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کرسکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر وقیمت نہیں جبکہ اس کے ساتھ وہ معیار جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

## قلبی تمکین

ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کی بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر، دل جمعی اور استغناء اور تفوق لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار و نظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی۔ جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے، اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسرکار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے تو ان کے دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین اس طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے۔ جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔

## عظیم تعمیری خدمت

میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاقی گراوٹ نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار و اخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا جیسا کہ پہلے بنتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان و عمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے۔ اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل و کمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز و تفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیر اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن

میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی۔ مگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

۳۔ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

☆☆☆☆☆☆☆☆

# تیونس ومراکش کی جدوجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو 'یا اندھیری رات کا فرزند، جس طرح ایک انگریز' ایک فرانسیسی' ایک امریکن ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے' اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خودارادیت میں مختار ہو۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

## احوال واقعی

بزرگان محترم!

ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، میں خداوند برتر و توانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقعہ پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

### حق خودارادیت

زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہمارے میدان' ہمارے کھلیان ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گذر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگیں قوموں کا فرد خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند' جس طرح ایک انگریز' ایک فرانسیسی' ایک امریکن' ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکش بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خودارادیت میں مختار ہو۔

## آزادی کی حمایت

حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤقر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں نے ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی فوجوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ کامیاب ہوا۔

## تیونس کی صورت حال

محترم حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کر دوں، تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحر روم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں، یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہوگیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کر رہی ہیں، تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں لڑی جارہی ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنما جناب حبیب بورقیبہ سے گذشتہ سال اسی شہر بمبئی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا اس مختصر مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد وعدے کو دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے، آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جوان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

## مراکش کا مسئلہ

تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامۂ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۲۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحر روم اور آبنائے جبل الطارق ' مغرب میں اٹلانٹک سمندر، جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے ' اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلو

میٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بد قسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہیں۔ تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دار السلطنت فیق ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۹۴ ہزار ہے۔

دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے جس کا پایۂ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی امریکی، ڈچ اور بلجیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں اس کا دار الخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے، ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم یا زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔

## دو نئی سلطنتیں

پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دو نئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیا کی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

## مطالبات اور تائید

ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

۱۔ تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کر چکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

۲۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے۔ جن سے دنیا کے امن کو خطرہ در پیش ہے۔

۳۔ عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجدہانی میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کر دیا ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے۔ نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

۴۔ ۶ ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ --- کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کا مسئلہ پر زور طریقہ سے پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل کریں۔

### فرانس کا دیوالیہ پن

سیاسی واقعات کے اس صاف و صریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مرکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔ فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کا غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں مل سکتی۔۔۔ اندریں حالات ہندوستان عوام اور ان کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصر اور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہمنوائی کا فرض انجام دے رہے ہیں، تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کر سکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خود ارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زبان زد ہیں۔ اگر ان کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقۃً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بنا کر استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجۂ استبداد جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! اے امن و انصاف کے ٹھیکیدارو! اور اے خود ارادیت اور انسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن و انصاف اور انسانیت کی لاج نہیں تو کم از کم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرو اور ایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہو جن کی کمک پر

پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔

## مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن

حضرات! مجھے چونکہ ہندوستان میں ایشیاء کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اور اسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دیکر تیونسی لیڈر جناب حبیب بورقیبہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کردوں۔ جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں۔ اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف واضح اور روشن ہدایات دی ہیں۔ جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور ظالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے، فرعون سے نبی اسرائیل کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیلوں کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا۔ انہیں اچھوت بنادیا گیا تھا۔ اقتصادی حالت ان کی زبوں تھی۔ اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کردیا گیا تھا تاکہ ان کی سالمیت اور اجتماعی صلاحیت ختم ہوجائے اس کا نرینہ اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہیں تہ تیغ کردیا جاتا تھا تاکہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر ابھر جائے اور غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈر شپ قائم نہ ہوجائے۔ جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کے اندھیروں میں بالآخر موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل بنی اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا۔۔۔ اور آخر انہوں نے قوم کی اس بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کردیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پر روش جتاکر اور نعمتوں کے تذکرہ سے مطالبۂ آزادی کو ٹلانا اور رلانا چاہا۔ جس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تونے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے"

پھر اس نے دھمکیوں سے مطالبہ آزادی کو دبانا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا:

"اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا"۔

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"اگر چہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کردوں یعنی جیل اور قید و بند کی دھمکیاں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہوسکتا

ہے؟"

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبۂ آزادی رکھ دیا ہے کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کر دے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ درصورت خلاف ورزی فرمایا کہ ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق وصداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبۂ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبۂ آزادی ـــ ایک مذہبی حق ہے جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دبے ہوئے وطن اور سرزمین کو ظالموں کے ناجائز قبضہ سے نکلنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف وصریح ہدایت ملتی ہے۔

## استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار عتاب الٰہی

سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی اس سے محروم کر دیا تھا حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے، اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن وتوش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس وپیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا.

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تم ہی کو دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چرا گئے اور استخلاص وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک تو یہ غلبہ و قبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادی تیہ میں بھٹکتے پھرے گویا سزا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتوب الٰہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں،

سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس و پیش یا انکار کرنے سے اقوام معتوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

### آزادی، مذہبی اور انسانی حق

پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ انکا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم یا دنیائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبۂ آزادی کی حمایت میں فرنچ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی آزادی ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی متفقہ خواہشات کے مطابق ہے بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر و حکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف و صریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔

### جہاد آزادی میں شرکت

ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا 'اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور بمبئی کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شمالی افریقہ کے اس جہاد آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلا دینا چاہئے نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی عوام کے نقطۂ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دینے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے۔

وباللہ التوفیق

# آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند

پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشمکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حَکَم کے ہو جو سب کے قضیئے چکا سکے --- ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرۃً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے --- مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراو قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلامؒ

## خطبۂ صدارت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَافَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا　اَمَّابَعْدُ

## شکریۂ اکابر

بزرگان ملت و اعیان امت!

اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجۂ صفر میں پہنچا دیا ہے، اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی

نہیں رہتا۔ اس لئے جرات نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض و معروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر و تجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرما رہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرأت کی اور اکابر و اعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کے ہمت ہوئی۔

## نظریاتی فتن کا دور

حضرات محترم! آج کے حالات جن سے ہم گذر رہے ہیں نہایت پیچیدہ اور نازک ہیں، سطح پر سکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے 'اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار' اگر کوئی مخملین سبزہ زار میں گھس جاتا ہے تو نیچے کے چھبتے ہوئے خار اسے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے' خصوصیت سے مسلمانوں کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھرا ہوا ہے شریعت نے دین کے بارے ہمیں خبر دی تھی کہ دور فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھامنا دین تھامنے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے؛ کشمکشوں اور مصادمتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور، کچھ ان دونوں لائنوں سے الگ ہو کر دونوں کے مدمقابل ہیں افراد و جماعت ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ ان کشمکشوں میں مسلمان

"دوگونہ رنج و عذاب است جان مجنون را"

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ :-

ہر بلائے کز آسماں آید
بر زمین نارسیدہ می پرسد
خانۂ انوری کجا باشد؟

یعنی مسلم آزار اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جانے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

## متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی

ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے لب کشائی بھی آسان کام نہیں، البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہ جماعت آگے آسکتی ہے جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو' اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں

میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو سب کے قضیۓ چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے، جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سر زمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجمیری، نور ہند خواجہ کلیری، قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی و مشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہم نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کر کے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا ثمرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فلینگ سے بالاتری کا کرشمہ تھا۔ آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے جانشینوں کے اسوہ پر کار آمد اور موثر ہو سکتی ہے۔

## جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت

جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی جماعت ہے۔ گو اس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ قربانیوں کا لگاتار سلسلہ صفحۂ تاریخ پر ثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔ وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اسکی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہبی رجحانات۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اسکے حق میں عدم جواز کے تحت میں آگئی تھی بلکہ عام سیاسی مصالح کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعاً ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیر کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔

## قومی تعمیر کی دفعات

قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام گو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سمیٹ کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لاسکتے ہیں:

نظام تعلیم ' نظام تبلیغ ' اصلاح معاشرہ اور مذہبی و تمدنی حقوق کا سیاسی تحفظ --- قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل و دماغ بنایا جاتا ہے۔ تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت و سربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے' حق تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نظر و اشاعت کیلئے قائم فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی اقرأ نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارتا ہے۔ اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا' مگر اسے " دور جاہلیت" کا نام دے کر یہ بتلایا گیا کہ ہمہ نوع شرور و آفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال و خوبی کا سر منشا علم ہے' اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

## سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ

وقت کے لحاظ سے یہ بھی مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولرازم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد و اعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں' جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے ' اس لئے بتقاضائے وقت بھی اس کی شدید کی ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسان قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جابجا دینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔ یہ مدارس آج بھی بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے دار العلوم دیوبند ' مظاہر علوم سہانپور ' مدرسہ شاہی مراد آباد وغیرہ ' ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے جو قوم کی ہدایت و رہنمائی کے فرائض انجام دیں --- لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہریلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتب دینیہ پڑھے لکھے دیندار تیار کر سکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

### نصاب تعلیم اور ذریعۂ تعلیم

جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کر لیا ہے جو بتدریج ملک میں اپنی جگہ کرتا جا رہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کیساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس

کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جا سکتا ہے۔ جوان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ بلیک تعلیم کے ذریعہ دل ودماغ میں پیوست کیا جارہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ اسکا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ہلکی اور شریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کی خزینہ دار بھی بن چکی ہے اس کا تحفظ علوم وفنون کا تحفظ ہے جو بہر حال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی، اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی بلکہ دنیاء اسلام کے ہزار رہا افراد ان مدارس کی بدولت اردو داں ہو گئے اور آج افغانستان، ایران چینی ترکستان روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق جاوا، سماٹرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بیگانے اور بے تعلق نہیں اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پچھلے دونوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور تا بحد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

## ذوق عربیت کی اہمیت

مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہمارے وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین ومذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب وسنت سے بے تعلقی کا ذریعہ بن جاتی ہے اگر اقوام و ملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب وسنت کے لگاؤ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوائے دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے تو انہیں عربیت سے بیگانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری نے پورا کر دیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر پنج گنج ہے جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ

قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتب کا جزو بنادیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے جو کتاب وسنت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہو گی دنیائے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی مؤثر اور کار آمد ثابت ہو گی۔

## تربیت عوام

لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے بشر طیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر واشاعت اور الاہم فالاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسے مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑالو نہ ہو' ضدی نہ ہو' سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کر دیں۔ آج جبکہ پر چار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پراگندہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کر کے دلوں کو تشتت و پرگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

## اصلاح معاشرت

آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۂ مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جارہی ہے ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جارہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل و دماغ پر چھاتے جا رہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسول اور منکرات بطور جزء زندگی کے داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریکٹر اور مقام متخص نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ و پند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادریوں میں سے بااثر لوگوں کو چن کر ان کی عملی کمیٹیاں بنائی جائیں برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلایا جائے جس میں عملی مشقت اور جدوجہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیام مکاتب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمہ

تن لگ جائے گا' اسے دوسرے میدانوں میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنابریں ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمت میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی' معاشرتی اور عام اجتماعی خدمت کے لئے کمربستہ ہوگی لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی' معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اس سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگیٔ سیاست کا مخالف نہیں کیونکہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے لیکن اس سلسلہ میں گزارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم رہنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی' اور کش مکش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے لیکن خود اس کمیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرے میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو کلمہ خیر کہہ دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔

### جمعیت کا منتہائے نظر

جمعیت علماء اپنے نام و رسم کے اعتبار سے اہل عمل کی جماعت ہے جس کا منتہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے وہ صرف اپنے ہی حلقہ کے

لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امکانی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی بڑھ جائے گی۔خود عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

### تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار

۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام وہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظر انداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہیگا جب تک کہ حالات کلیۃً ساز گار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی حجاج اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جارہی ہے۔یہ مختلف وجوہ سے حجاج کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق وشوق پر بھی پڑ سکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھادیئے جانے کی پوری پوری جدو جہد کرے گی۔

### بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے۔جوان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔اس میں الجھ کر کبھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں۔کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بے کاری بہت سے فتنوں کی آبیاری کی جڑ ہوتی ہے۔برسر کار اور باروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے۔جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غربا کی بیکاری کا مسئلہ حل

کرنے کی کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہے۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جاسکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط سے اس مشکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

## جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت

بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمات کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوئیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاسیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تو اب اس کے کشکول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہوگی؟ اگر اس کی سیاسیات حقیقۃً مذہب کے مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کر رہی تھی اور آج بھی مذہبی حیثیت سے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے۔ اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور اس لئے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۴۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کیساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امنگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۴۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی، معاشرتی، تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شاندار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے، کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

رایوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت لیکن یہ کسی جماعت کیساتھ مل کر کام کرنے میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے اس لئے تمام مسلمان اس ارادہ کو بلا تفریق خیال و مشرب اپنا

سکتے ہیں۔

**سرمایۂ جمعیت**

جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو پچھتانا نہیں پڑا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بیٹھ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے یہی زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں ہیں اور انکا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و تجدید اور آپ سے طلب عمل ہے، کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے، اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یک قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے جائیں، بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلانے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کریں بلکہ لوگ از خود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگذاشت بھی ہے جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمربستہ خادم کی محض حوصلہ افزائی ہے، ورنہ اس مجمع اکابر و اعیان کے سامنے ایک ناکارہ و نااہل کا کرسیٔ صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر آبیٹھنا بھی جرأت و بے ادبی ہے۔ میں بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور "جمعیت علماء زندہ باد" کہتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# نصاب تعلیم کی تدوین

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور تھا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔۔۔ جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔۔ آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔۔۔ اس حقیقت کو میں بطور خلاصہ ان الفاظ میں لا سکتا ہوں کہ "مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں" ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

# عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق اسمبلی ہال لکھنؤ میں حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کی تاریخی معرکۃ الآرا تقریر

## پس منظر

حکومت ہند نے مدارس عربیہ کی تنظیم اور ترمیم و اصلاح نصاب تعلیم علوم مشرقیہ کے متعلق جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور لائق تشکر و امتنان ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے ۷ ربیع الاول ۶۶ھ کو ایک مفصل مکتوب عالی جناب حضرت مولانا ابو الکلام آزاد صاحب وزیر تعلیمات انٹریم گورنمنٹ ہند کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کی سند فراغ اور سند تکمیل کو معتبر اور موثر قرار دیئے جانے کے متعلق موصوف کو خصوصی توجہ دلائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آج اگر فضلائے دارالعلوم اپنی معاشی ضروریات کے ماتحت حکومت کے کسی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو وہ خواہ کتنی ہی بہترین استعداد رکھتے ہوں انہیں مولوی فاضل یا اسی کے مساوی کوئی سرکاری امتحان پاس کئے بغیر سرکاری ملازمت کا موقع میسر نہیں آتا، حالانکہ دارالعلوم کے فضلاء علمی قابلیت کے اعتبار سے ہر حیثیت سے یونیورسٹیوں کے

رسمی ڈگری یافتہ لوگوں سے فائق ہوتے ہیں اگرچہ دار العلوم کی تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے، مگر جو لوگ ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے خواہش مند ہوتے ہیں انکے حقوق مولوی فاضل، بی اے، ایم اے کے مساوی اور سند تکمیل کو ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مساوی تسلیم کئے جانے میں حکومت کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ دار العلوم ہر حالت میں اپنے نظام تعلیم، امور انتظامی اور حکومت کی امداد سے جس طرح اب تک بے تعلق اور آزاد رہا ہے یہی پالیسی اس ادارہ کی مستقبل میں بھی بدستور رہے گی۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس مفصل مکتوب کے جواب میں مولانا آزاد صاحب کی جانب سے جواب موصول ہوا کہ میں خود اس بارے میں جناب والا سے ملاقات اور مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا چونکہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اسمبلی ہال لکھنؤ میں عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی کے زیر سرکردگی ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی۔ جس میں دار العلوم کے نمائندے بھی شریک ہوں گے اسی میں جناب والا سے بھی اس معاملہ میں تبادلہ خیال ہوگا۔ براہ کرم اس موقع پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اس تعلیمی کانفرنس میں دار العلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب دار العلوم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دار العلوم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی دار العلوم دیوبند شریک کانفرنس ہوئے۔ ان حضرات کی معیت میں مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرسین دار العلوم مولانا عزیز احمد صاحب مبلغ دار العلوم اور احقر خلیق احمد صدیقی مدیر ماہنامہ دار العلوم مبلغ و ناظم شعبہ صنعت و حرفت دار العلوم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یوپی کے مختلف مشرقی تعلیمی اداروں کے نمائندوں سے اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا۔ حکومت یوپی کے۔۔۔۔ وزیر اعظم اور دیگر متعدد وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری صاحبان بھی شریک کانفرنس تھے ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کانفرنس مولانا آزاد صاحب نے ایک مبسوط تقریر صدارت تقریباً پونے دو گھنٹہ فرمائی جس میں تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے علمی تفوق اور اس کے تنزل کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی اور بتلایا کہ اس طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں۔ جنہیں بہت جلد پورا کر دینے کی ضرورت ہے، طریق تعلیم املا ہونا چاہئے۔ کتاب کی پابندی ایک فضول اور مضر چیز ہے۔ جس سے علم چند سطروں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ نظر و فکر اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہونا مفقود ہو چکا ہے، مولانا کی اس تنقید سے بعض حضرات علماء پر گرانی کا اثر ہوا اور وہ ایک حد تک بجا تھا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ختم تقریر پر خود مولانا

آزاد صاحب نے بھی اس کو محسوس فرمایا کہ موصوف اس تنقید میں حدود سے ایک حد تک تجاوز فرما گئے ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ مجھے ابھی اور بھی کچھ کہنا تھا اور پھر آپ حضرات کی آراء سے مستفید ہونا تھا لیکن چونکہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کانفرنس کا ایک دوسرا اجلاس کل ۳ فروری کو ڈیڑھ بجے سہ پہر سے اور رکھ لیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے سہ پہر کو حضرت مہتمم صاحب دار العلوم اور دوسرے حضرات علماء کرام اسمبلی ہال میں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ تقریباً پونے دو بجے مولانا آزاد صاحب نے تقریر صدارت کا سلسلہ شروع فرمایا جس میں نصاب تعلیم کے مسئلے کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج علم کو محض علم کے لئے جو طبقہ پڑھتا ہے جس کی غرض علم سے کسب معاش نہیں ہے بلکہ علم اور علمی کمال پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف یہ قومی مذہبی آزاد مدارس ہیں۔ جو دینیات کی تعلیم انتہائی استغناء اور لاغرضانہ طریق پر دے رہے ہیں۔ جن میں خصوصیت سے دار العلوم دیوبند ایک اعلیٰ ترین مرکزی درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے گزشتہ اسی (۸۰) سال میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دے ہیں اس مرکزی علمی ادارے نے مشرق و مغرب میں اپنے علمی آثار پھیلائے اور افغانستان، بخارا، بلخ، جاوا سماٹرا، عرب، ترکستان وغیرہ تک اس کے فضلاء پھیل گئے جنہوں نے اسلام کی سچی اور حقیقی خدمت انجام دی۔

میرے پاس اس بارے میں ایک جچی تلی تحریر بھی پہنچی ہے جس میں یہی دکھ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان فضلائے دار العلوم کو ان کی اعلیٰ ترین قابلیت کے باوجود آخر وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل اور مستحق ہیں (یہ اشارہ حضرت مہتمم صاحبؒ دار العلوم کے اس خط کی طرف تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) یہ خود میرے دل کی آواز ہے۔ مگر ضرورت اسکی ہے کہ وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے آگے بڑھیں اور ان کی تعلیمی زندگی میں کچھ خفیف سا تغیر ہو۔ ان کے نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کو کچھ پورا کیا جائے۔ زیادہ نہیں بہت تھوڑا سا تغیر کافی ہوگا۔ نصاب کی اصلاح طریق تعلیم میں قدرے تغیر اور تعلیمی رنگ کی ذراسی تبدیلیاں، بہر حال اس طرح مولانا آزاد صاحب نے آج کی تقریر میں دردمندانہ انداز میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور کریں اور پہلے دن کی تقریر میں جو شدت آگئی تھی اسکی کافی حد تک تلافی فرمادی۔ مولانا آزادؒ کی تقریر کے بعد ھلاہی خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب شیعی مدارس عربیہ لکھنؤ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کے لئے باجازت صاحب صدر، کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریری یادداشت سامنے رکھ کر مولانا آزاد کی حرف بحرف تائید کی۔ صرف انگریزی زبان کی تعلیم پر بحیثیت زبان ثانوی مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی مخالفت کی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند (جو تمام علماء دیوبند، علمائے مظاہر العلوم سہانپور اور مراد آباد کی طرف

سے اس بارے میں اظہار خیال کے لئے نمائندہ بنائے گئے تھے) اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور صدر محترم مولانا آزاد سے تقریر کی اجازت چاہی۔

صاحب صدر نے نہایت خوش دلی اور آرزو مندانہ انداز کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کو تقریر کی اجازت دی۔ چونکہ ابتداء میں آواز کسی قدر دھیمی تھی جسے صاحب صدر نہیں سن سکے۔ اس لئے صاحب صدر نے فرمایا کہ جناب! میرے پاس اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور یہاں سے تقریر فرمایئے۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب دار العلوم نے اسٹیج پر مولانا آزاد کی کرسی کے قریب کھڑے ہو کر اپنے مخصوص خداداد دلنشیں انداز میں نہایت فصیح و بلیغ جامع مانع تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

## خلاصۂ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ علیہ

**الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی**

(اس کانفرنس میں صرف اسی تقریر کی خصوصیت تھی کہ وہ اللہ کے نام سے شروع کی گئی)

صدر محترم و معزز حاضرین! تعلیمی کمیٹی کا یہ عملی اقدام جو عظیم الشان کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے اور کانفرنس میں صدر گرامی قدر کے ارشادات جو کل سے اب تک آپ نے سنے ہیں ایک نہایت ہی مبارک اقدام اور تعلیمی سلسلہ میں مستحسن قدم ہے۔

### صحیح تعلیم کے اسباب و عوامل

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقیاس کی بقاء بلکہ اس کا قیام جس بنیاد پر استوار ہے وہ صرف صحیح تعلیم ہے، صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصاب تعلیم موزوں ہو، طریق تعلیم موثر ہو، ذریعۂ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظام تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو یہ ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی، نصاب تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہو سکتا، طریقۂ تعلیم غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر نہیں ہو سکتا۔

استاذ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا۔ سب کچھ ہو اور نظام تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزاء کا ہونا از بس ضروری اور یہ تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت و سقم پر ان سب امور کی صحت و سقم موقوف ہے اور یہ ہے "تعلیم کا نصب العین اور مقصد" اس نصب العین کی خوبی و خرابی سے ان بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال و نقصان کا فیصلہ کیا جائے۔

### نصب العین کی اہمیت

نصب العین کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثلاً گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری تعلیم گاہوں کا نصب العین ملازمت قرار دیا تاکہ اس تعلیم کے ذریعے سے کلرک اور محرر یا دفتری کارکن تیار کر لئے جائیں یقیناً حکومت برطانیہ کا نصب العین انسانیت کی خدمت یا دیانتداری اور حق وصداقت کی خدمات نہ تھے اس لئے ہم سرکاری اداروں کو اسی کے نصب العین کے ماتحت پرکھ سکتے ہیں۔

ہمیں سرکاری اداروں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس معیار پر جانچنا ہی نہ چاہئے کہ وہ کس قدر سچے اور کتنے بہی خواہ ملک وقوم ہیں۔ پس خود اپنے مقرر کردہ معیار سے گورنمنٹ اور اس کے ادارے کامیاب رہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے معیار سے ان کو جانچیں۔ ہاں ہمیں اعتراض کا حق اس سرکاری نصب العین پر ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے پروردہ افراد پر کہ وہ تو اپنے معیار پر کامیاب ہیں۔

اس کے بالمقابل قومی اداروں اور دینی درسگاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی نہ کرسی بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو انسانیت کے سچے خدمت گزار ہوں اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ان افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے کمال ونقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا۔ جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔

### قومی اور سرکاری اداروں کا نقطۂ اشتراک

قومی اداروں کے فضلاء اور حکومت کے تعلیمی اداروں یا عام سرکاری محکموں میں آئندہ باہمی ربط کیا رہے گا؟

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے۔ موجودہ حکومت قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے۔ سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا جو بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا۔ لیکن اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہین وطبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم ہوں، آشتی ومسالمت اور پریم وصلح کے خوگر رہ کر ملک کو آسان ترقی پر پہنچا دینے کے جذبات رکھیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آجائے گا اور یہ ایک نقطہ سنگم کا پیدا ہو جائے گا۔ تعاون کے لئے قرب ضروری ہے اور قرب اس

اشتراکی نقطہ پر ممکن ہو گا اس لئے میرے خیال میں دینی عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کو تبدیل کیا جائے۔ یہی ایک مشترک نقطہ ہے جو سرکاری اور قوم کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔ اس صورت میں قومی مدارس کو اس کی ضرورت نہ ہو گی کہ وہ کسی سرکاری ڈگری یا امداد کی طرف جھکیں بلکہ شاید خود گورنمنٹ کو اس کی حاجت ہو گی کہ وہ وہاں کے فضلاء کی خریدار بن جائے اور ان کی تلاش میں رہے۔ سو اس صورت میں دینی مدارس ہر اخلاقی امداد کا حق ادا کر سکتے ہیں مگر اپنی آزادی کو برقرار رکھ کر وہ جیسے ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں اب بھی ان کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں آزاد رہیں گے۔ یہ ان کی آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب حضرت مولانا آزاد نے آزادی سے انہیں اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو قابل ستائش بھی نہ ہوتے اور جو آزاد نہیں انہیں یہ مقام حاصل بھی نہیں۔

## نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ

اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ، سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ جن تعلیمات کا وحی الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے، باقی جو فنون یا کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اسکی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا جس دور میں تصوف کا زور رہا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں لا سکتا ہوں کہ

مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں

ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے پس تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کر دیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جا سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے، اس لئے وقت کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی۔ خود درس نظامی کی تدوین ہی تبدیلیٔ نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیونکہ بہر حال یہ نصاب قرن اول کا نہیں ہے۔ وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے۔ جب اس کے آغاز کے وقت تغیر و تبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہر حال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ میں نے خود

۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلی نصاب کے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔

بہر حال نصاب تعلیم میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں۔ جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سرکاری اداروں کے لئے قابل تقلید ہونا چاہئے جس سے وہ قومی مدارس کے قریب لائے جاسکتے ہیں۔

نصاب کا تغیر و تبدل ہر دور میں ہوتا آیا ہے جو اس امر کی مستقل دلیل ہے علماء میں فکر و نظر کو ہر زمانہ میں اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دور میں مفکر و مبصر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ قرون اولیٰ، قرون متوسط، اور قرون اخیرہ میں اہل فکر و نظر کی امت میں کمی نہیں رہی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ خود صاحب شریعت کا ارشاد ہے۔

**مثل امتی کمثل المطر لایدری اوله خیرام اخره.**

جس سے واضح ہے کہ اہل نظر کسی خاص قرن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خلف میں سلف کے ہمرنگ ارباب نظر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب شریعت (فداہ ابی وامی) نے ارشاد فرمایا:

**یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل المجاهلین.**

اسی طرح ارشاد نبویؐ ہے:

**انااللّٰه یبعث لهذه الامة علی راس کلّ مائة سنة من یجدد لها دینها.**

اور دین کا حاصل جبکہ ایمان عقائد جبکہ ایمان عقائد، اسلام و احکام تزکیہ اخلاق اور اعلائے کلمۃ اللہ تو نا ممکن ہے یہ مجدد اس سے ناآشنا ہوں یا ان کے زیر تجدید تربیت یافتہ مفکر نہ بنیں اس لئے بہر حال فکر و نظر کا دروازہ ہر آن کھلا رہے گا۔ مگر ہاں اپنی بساط اور اپنی ہی استعداد کے مطابق ہم حدود سے گزرے ہوئے فکر کو فکر و نظر نہیں بلکہ تو ہم کہیں گے۔

بہر نوع بنیادی چیز نصب العین ہے۔ اس سے ادارے بنتے ہیں اور اس کے بگڑنے جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔ اس نصب العین کے ماتحت پھر دو بنیادی چیزیں ہیں جن کی تفاصیل پہلے عرض کی جاچکی ہے۔

میں اپنے ذہن میں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پاتا ہوں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں کیونکہ جناب صدر محترم ان تفاصیل پر بحث کرنے کے لئے خود ہی ایک کمیٹی کا تقرر منظور فرما رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس میں آسکتی ہیں۔ اس لئے اس اجمال پر قناعت کیا جانا کافی خیال کرتا ہوں۔

**تاثرات تقریر** حضرت حکیم اسلامؒ کی یہ تقریر مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر اصولی حیثیت سے اس

درجہ جامع تھی کہ بعد کے آنے والے مقررین کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ تقریر کے بنیادی نقطوں میں حضرت موصوف کی تقریر کا حوالہ دے کر پرزور تائید کریں۔ چنانچہ حضرت حضرت موصوف کی تقریر کے بعد مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محل نے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کی طرف سے تقریر فرمائی جن کی اصل تقریر کا ماحصل مناظرانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پر غم وغصہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب تعلیمی نقطہ کی بات آئی تو انہوں نے بالآخر حضرت مہتمم صاحب کی تقریر فرماتے ہوئے مولانا آزاد کی تائید پر نکتہ چینی کی اور آخر میں مہتمم کی تقریر کا بنیادی نقطۂ نصب العین لے کر اس کی تائید وتصویب نہایت پرزور الفاظ میں کی۔

آخر میں علامہ سید سلمان صاحب صدر قاضی و ڈائریکٹر علوم مشرقیہ ریاست بھوپال تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور موصوف نے ایک نہایت مفصل و مدلل تقریر فرماتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ "مسائل پرانے اور دلائل نئے ہوں" فرمایا کہ اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔

علامہ موصوف کی تقریر کی بعد مولانا عبدالمجید صاحب بنارسی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تقریر فرماتے ہوئے نہایت پرشوکت الفاظ میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی تائید کی۔

سب سے آخر میں مولانا آزاد صاحب نے اختتامی تقریر فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سے اس حد تک اپنے تاثر کا اظہار فرمایا کہ گویا اپنی اختتامی تقریر صدارت کا متن حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کو قرار دے کر اس کے مختلف جملوں کو بار بار اپنے الفاظ میں دہرانا شروع فرمایا جیسا کہ ابھی مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا اور یہ مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل بجا درست فرمایا۔

مولانا آزاد صاحب نے فرمایا کہ محمد طیب صاحب کی تقریر کا یہ جملہ کہ "مسائل قدیم ہو اور دلائل جدید ہوں" ہمارے ان تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔

مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں! مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل درست اور نہایت ہی بجا فرمایا کہ مدارس عربیہ کو اپنے نصاب تعلیم اور نصب العین میں اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ سرکاری تعلیمی اداروں کو ضرورت ہے۔ یہ اگر اپنا نصب العین اور طریقہ تعلیم وتربیت درست کر لیں تو وہ قومی مدارس کے قریب آجائیں گے۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ان قومی اور دینی مدارس کا تفوق ان کی آزادی اور آزاد روش پر منحصر ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ان کا آزاد رہنا ہی ان کا اونچا اور بلند مقام ہے اور انہیں اسی مقام پر رہنا چاہئے۔

پھر مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض وغایت اگر محض کلرک اور محرر یا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہو سکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوئی۔

بہر حال حضرت مولانا آزاد صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جملہ جملہ کو لے کر اس کی شرح نہایت وقیع اور شاندار انداز سے اپنے الفاظ میں فرمائی جس سے مولانا کے تاثرات قلبی کا اظہار ہو تا رہا اور جس کا تمام حاضرین نے نہایت اچھا اثر قبول کیا۔

ہم جملہ وابستگان دار العلوم کے لئے بالخصوص انتہائی مسرت وخوشی کا مقام ہے کہ اس پوری تعلیمی کانفرنس کے ہیرو اور دار العلوم کے حلقہ میں پوری کانفرنس کے ہیرو حضرت مہتمم صاحب ہے، جن کی تقریر کے ہر ہر جملہ بلکہ ایک ایک لفظ کو سنجیدہ اور باہوش علماء کرام نے دہرایا۔ پرزور تائیدیں فرمائیں اور تقاریر میں اس کی تشریح وتفصیل کرتے رہے اور ایک مرکزی تعلیمی ادارے کی تعلیمی لائنوں میں جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہی رہی۔

**فالحمد للہ والمنۃ**

خاتمۂ تقریر پر مولانا آزاد صاحب نے اعلان فرمایا کہ میں ایک عملی تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں ہو یہ کہ ۱۵ تا ۲۱ ارکان پر مشتمل ایک تعلیمی کمیٹی بنا کر جلد سے جلد نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم کا عملی کام شروع کر دیا جائے۔

یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور نہایت خیر وخوبی کے ساتھ یہ تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

احقر خلیق احمد صدیقی
مدیر ماہنامہ دار العلوم
(دیوبند)

# تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ ' دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے ' مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے ایران کے مجوسی یزدان وہرامن کے پیکروں کے سامنے رغبت ورہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستو نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سرنیاز ختم کیا۔۔۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنادیا۔

از حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہ

## مہلک دستکاری

بزرگان محترم!

آج تصویر اور صورت سازی اپنی غیر معمولی شیوئن کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزء لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا مکان، دوکان، خطوط، کتب، رسائل، سکہ، تمغہ، رقعہ، دستاویز، تلوار، ہتھیار، چھری، چمچہ، لیبل مارکہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گرویدگی شغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ وار دوڑتی چلی جارہی ہے۔

اقوام متحدہ کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین منکر ہی دکھلائی دیتی ہے جسے معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمان ذہنیت تبدیل کردینے میں کافی مداخلت حاصل ہے۔

**صورت محض وسیلۂ تعارف ہے**

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور واشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس صورت ایک درمیانی خاد

ہے جس کا منصبی فرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں حیوانات اور نباتات کی ہیئتیں صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنا دیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانیٔ حقیقتا درخو التفات ہی نہیں کہ کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہچاننے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پاسکنے کا ثمرہ اور ہمارے قصور کے ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لا سکتے ہوں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی نہ منعطف ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیئت سامنے رکھنا اصل کی یاد آوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ یہ صورت بینی کے تصور ادراک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطۂ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی کی ترجمانی کر رہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہو ظاہر ہے کہ بے اصل محض، بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے کہ وہ حقیقت کی بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کر رہی ہے۔ پھر بھی مگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنایا جائے تو یہ مقصود سے اعتراض اور وسائل میں شغف کے سوا کون سے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہماک و شغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا دانائی کی بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

### شرک فی المقصود

بس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کر لیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے۔ شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنا دیا جائے تو اس کا نتیجہ

بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمعیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف گویا اپنی اصل جبلت سے تو غیبات اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جبلی قواسر سے ظاہری نمود اور صورت واشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید مطلب بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصود کے باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود سے نہ بچنا عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا، اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں ساجھا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

**تصویر پرستی**

یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دو راستے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر و توانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداءً تصویر کو مرکز بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل و معرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کر دی۔ وہ تمام افعال عبودیت، رکوع و سجود، نذر و نیاز بھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے۔۔۔

اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسّموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حظ و کیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلے بت پرست قوم (امت نوح) جس نے پانچ مردان حق (ود۔ سواع۔ یغوث۔ یعوق۔ نسر) کی تصویروں کو ذریعہ خدا شناسی بنا کر اپنے معبدوں میں نصب کیا آخر کار انہی مجسموں نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف و خبیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جمے کہ پھر مستقلاً انہی سے استمداد کی جانے لگی۔ وہی اولاد دہندہ شمار ہوئے۔ وہی ابر و باراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی۔ عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے حال میں پھنس گئی۔ اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کی بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ و پند سے سوائے چند روزہ ظاہر داری کے کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بینی بھی ان کے دل و دماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے

تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے مجوسی یزداں واہر من کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشی لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنادیا اور خالص شرک کے راستہ پر لا کھڑا کیا جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی و تشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت و بشاشت خاک میں ملادی۔

**تصویر بازی**

دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے تصاویر سے مظاہر غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن و معاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچاننے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھادیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنی اور ذلیل مرتبہ پر آکر رکی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور مجسموں کو قبلۂ استقبال بنایا تو خدا شناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازیوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین و آرائش یا نمائش وزیبائش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت در صورت ہی سے ہے اور بس۔۔۔

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منتہائے مقصود ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت و صورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی فانی درجہ یعنی تصویر کو منتہائے مقصود بنادیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کردینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد وصورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتی اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ رکھ سکیں کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی، ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ تصویروں کی ساخت و پرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے

باتیں کرنا عشق و محبت کے جذبات کاغذ کے رنگین عکوس پر نچھاور کرنا ان کا شعار ہو گیا۔

**سطح پرستی کی انتہاء**

آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ کر شہوانی جذبات اس طرح مشتعل کئے جاتے ہیں جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کو کی کسی ادنیٰ توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے، وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دور صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے، حالانکہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں، یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شدومد سے کئے جارہے ہیں جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانے تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اسی مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس مصور کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشر عشیر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کر دیا جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک ایک فلم پر ہزارہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرار تنخواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب تمدن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں۔ آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی محرک تصویروں سے لیا جارہا ہے۔

نمائش و سطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے شغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔

غرض حب و بغض، نفرت و رغبت، عشق و محبت اور خرید و فروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح و صورت کے ساتھ جوڑتا جارہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بیگانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بے گانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل و دانش کیا فیصلہ کرے گی۔؟

**صورت پسندی کی آخری منزل**

بہر حال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردۂ نسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس توحید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو

مستحکم کر دیا۔ متدین اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالاستقلال خود مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چنانچہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلۂ قلوب ہو گئے اور تمدنی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب و مطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علو مضامین کے رنگینی تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے گھسیٹ سکے۔ مگر تصویر اپنی خالص محبوبیت کی بناء پر یہ جذب و کشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

## خزائن مخفیہ سے محرومی

خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالخاصہ حق پسندی سے ہٹا کر بہ سہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مندیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، پس کہاں انسان عالم غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں میں مصروف ہو۔ ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تاکہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے۔۔۔ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ کش ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلۂ نظر بنا لیا۔ خفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کر لیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کثافتوں میں دھنستے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحیات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

## شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہو تو کون سی جائے تعجب ہے؟

ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟

لاتدخل الملائكة بيتا فيه كلب و لاتصاوير (بخاری)

"جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے"۔

حضرت خاتم الانبیاء ﷺ جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم و نقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یترك فی بیته شیئا فیه تصالیب. الا نقضه' (راوہ البخاری)

"نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے"۔

## تصویر سازی کا اخروی انجام

حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟

اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یصاھون بخلق اللہ (وفی روایة) المصورون (بخاری و مسلم)

"یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)"۔

یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقل مرکز التفات نہ بنادیں۔

ان اللہ لاینظر الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم ونیاتکم (الحدیث)

"اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)"۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلا شرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل الاصول کے فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم و فراست اور قلب کی آنکھ کھولے تا کہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

## حقیقت الحقائق کی جستجو

پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکلیہ ناقابل التفات اور تشتت کی جڑیں ہیں۔۔۔ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو توجہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر اس حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات و جمالات کا سر منشاء اور حقیقی خوبیوں کا سر چشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے' اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الٰہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کئے ہوئے دشوار ونا ممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش و زیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بے گانہ محض کر دیا۔ حقیقۃ الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صور واشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویری خدوخال پر لا کھڑا کیا' پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہوگیا اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہوگا۔

### توحید پسند کا تصاویر سے تنفر

اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماک صور واشکال سے دور رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے :

۱۔ تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔
۲۔ ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔
۳۔ خود اپنا بغض اس سے بتلایا۔
۴۔ تصویر سازی اور مصور پر لعنت کی۔
۵۔ تصویر بنا دیئے جانے پر اس کے مٹا دینے کی تعلیم دی۔

فاروق اعظمؓ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ :

"میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر۔ اگر میں اللہ کے رسول ﷺ کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا"۔

### حقیقت پسندانہ ذہنیت

پس اسی لئے حقیقت شناسان باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے

گرفتار صورت ہو کر بعید از حقیقت ہو جانے کا ذرا سا بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیر الی اللہ میں جو کہ حقائق کو مختلف باطن صور و اشکال کے جامہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیز ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بننے کی سعی کرتا ہے کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے۔

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اور اس کے بنیادی مقصد، رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔ اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کر لینا بلاشبہ قلب ماہیت اور قلب موضوع ہے۔

حق تعالیٰ توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگڈنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور پھینک رہی ہوں اور منزل مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وباللہ التوفیق

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں ---اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو' اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا' وہی کامیاب ہوگا۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہ، وَنَسْتَعِیْنُہ، وَنَسْتَغْفِرُہ، وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہ، وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہ، لَا شَرِیْکَ لَہ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہ، وَرَسُوْلُہ، اَرْسَلَہ، اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْراً وَّدَاعِیاً اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْراً............ اَمَّا بَعْدُ.........

## اشتراک ذہن

بزرگان محترم!

اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنا دیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا پھرنا سہل بنا دیا ہے۔ پہلے بیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی' خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے' دوسرے سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے' لیکن آج سائنس کی ترقیات نے سفر کو سہل بنا دیا۔ رتھوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں' حالانکہ دریا کے راستہ سے یہ سفر (۹) دن میں طے ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہو گی اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں' کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا ہے اور سارے ممالک مخلوں

کی حیثیت میں ہو گئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات مٹتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا جارہا ہے یعنی جذبات ایک سے' افکار ایک سے' خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں برما کے وزیر صحت ہمارے یہاں آئے تھے' اس سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا' تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔ چنانچہ یونائیٹڈ نیشن کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جارہے ہیں۔ حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

## تبدیلیٔ اصول

چنانچہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو چھوت چھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو' اس وقت امن قائم ہوگا۔

گاندھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔ محض یہ ظاہر کرنے کے کے لئے اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آگیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رنکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے' پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔ پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب بر سر عام آگئی' مثلاً دولت' عورت پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے' لہٰذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

## اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو' اونچ نیچ نہ ہو' جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔

چنانچہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ۔

یَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى الخ.

گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔ ”بنی اعضائے یک دیگر ند الخ۔

”ہم نے تم میں قبیلے بنائے تا کہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو' تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں' البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی' پیدائشی اعتبار

سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں" آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتا بلکہ سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں، شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا توا اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں، جو زیادہ خشوع سے عبادت کرے گا بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

**عمومی مساوات**

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ سنو اور مانو ایک بڈھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تم خائن ہو۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسکا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دیدی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کر سکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہوگا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو۔۔۔۔؟

یہ اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندیو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہر حال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے امتیاز سے ہے، لہٰذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو کہ وہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

**حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول**

بہر حال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مقتداء کو برا کہا جائے لہٰذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ "ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشیوں، مینوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے، قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لنکا میں اترے، گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی اولاد میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے تو گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

## مہاتما بدھ کی پیشین گوئی

حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں' ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام اترے' دوسری وہ جگہ جس میں کعبہ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "النبی الخاتم" اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہندوستان میں آنحضرت ﷺ کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکنی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد نندا نے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتما بدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آچکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت ﷺ کو رحمت للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

## اجمالی ایمان

قرآن پاک میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا' مولانا مناظر احسن نے اسکے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے یہ مقام کپل ہے اور کپل وستو اسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں' ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہر حال مشرقی ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سرہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں' حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے' وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آکر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبرؑ کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیلؑ کی برکت سے جاری ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو برامت کہو' ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں' اس لئے نام لیکر انہیں کبھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کر دیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن وحدیث میں صراحۃً موجود ہے ان کا نام لے کر مانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

## مذہب کی بنیاد

اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے' یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ کے انکار پر ہے اور

عیسائیوں کا مدار آنحضرت ﷺ کے انکار پر، مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہو سکتی ہے نہ ماننے پر نہیں، یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہر حال چونکہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حد بندیاں قائم نہیں رہ سکتیں، یہی حال روحانی خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہٰذا اب سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حد بندی ختم کرنی ہوگی۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے، جزوی امور پر نہیں ہوتا۔۔۔ اور کلی امور عالمی امور ہیں، ان ہی پر ملک کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

### احترام انسانیت

انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح مذہبیت کا لہٰذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن ایہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کو طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔

یہ وہی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سنکر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

### مذہب واحد

بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی شروع کر دی، پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی بنی اسرائیل گرفتار کیے گئے۔ حضرت دانیال ؑ پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے (ان کی دیانت وامانت وراست بازی صدق وصفا اور عبادت وزہد کو دیکھ کر حکام جیل انکے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے، اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد) بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اسکی دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی، انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمایئے کہا کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔

انہوں نے کہا کہ پھر تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ۔

"میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی فبہا،

ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے"۔

اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپؑ نے جیلر سے فرمایا جو انکا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے کیونکہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پا سکے گی) جیلر نے کہا' مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرما رہے ہیں' یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے۔۔۔ فرمایا' تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے' جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیالؑ کو طلب کر لیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخل دربار ہو کر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا' اس کی وجہ ہے کہ میرا ایک رب ہے اس کا حکم ہے کہ میں اس کے سوا کسی سجدہ نہ کروں' میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کر لوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کر لے' تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کر ڈالے' اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بے چینی میں بتلا رہے جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب بتلا ہے' پس میں نے ترک سجدہ تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ الٰہ و معبود کا وفادار اور دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو رب کے عہد و میثاق کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں۔۔۔ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اسکی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا' ہاں ہے۔

"تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جسکے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے' درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے' ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی' حسن و جمال اور بے نظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت پر آ کر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہو کر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا اور اس کا سونا' چاندی' تانبہ' لوہا اور مٹی سب اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل ملکر

ایک ذات ہو گئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کر دیں تو نہیں کر سکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہو گئی ہیں کہ) ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پیس دینے کے بعد) اچانک فضائے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا' اور پھیلتے پھیلتے اتنا ہو گیا کہ پوری زمین پر چھا گیا' اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آرہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست' یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمایئے! حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سینے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کیساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے جس پر تیرا بیٹا حکمرانی کرے گا۔۔۔ اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے۔۔۔ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن اور ایک مغربی شام ہیں اور وہ پتھر جو اس خوشنما بت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا' وہ دین ہے جو کہ نبی آخر الزمان (ﷺ) لے کر آویں گے وہ اور انکی امت اس دین کو ان قومیتوں کے بت پر پھینک ماریگی تا کہ اس دین سے تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا جائے (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضاء میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کر دے گا' باطل کا سر نیچا ہو جائے گا' راہ ہدایت سامنے آجائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعفاء کو (جنہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا) قوت عطاء کرے گا' ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہو گی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا' جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے چینی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بار تبہ نہ ہو گا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کے بقدر ہی صلہ دوں گا۔

## دین خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس حدیث سے واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہو گا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس طرح دنیا کی متفاوت قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا' خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی' حتیٰ

کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اوراس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہو گی' ایک ازم ہو گا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہو گی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ سارے عقلاء مدبرین اصول مساوات کو تمدنی' معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً و عملاً و قلباً قبول کرتے جا رہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں۔۔۔ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابل غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے اسلام کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو انشاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہو گا جو شخصی جذبات کو تو نہیں لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# دنیاو آخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے' آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا الدنیا مزرعة الأخرة۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے' ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا' اچھا پھل نکل آئے گا'

گندم　از　گندم　بروید　جوزجو
از　مکافات　عمل　غافل　مشوو

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.........اَمَّابَعْدُ..........

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَاهُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ.

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝

# احوال واقعی

بزرگان محترم!

مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے۔۔۔وقت بھی تھوڑا ہے۔۔اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں۔۔۔عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت نہیں، مختصر طریق پر اس آیت کریمہ کی روشنی میں "چند باتیں" آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

## تذکرۂ دنیا کا مقصد

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ' نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ہمارے فرائض بتلانے کیلئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے' دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔۔۔"انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا" یہ ایمان ہے۔۔۔آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا' اسے ایمان نہیں کہتے۔۔۔کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔یہ ایک عقلی چیز ہے' ایمان لانے کی چیز نہیں وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔۔۔غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔۔۔اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں۔۔۔بہر حال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

## تذکرۂ آخرت کا مقصد

اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیونکہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں' آخرت کی پہلی منزل "عالم برزخ" ہے جسے قبر کہتے ہیں۔اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔۔۔بجز اس کے کہ مخبر صادقؐ کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں۔۔۔عالم آخرت کا برپا ہونا' میدان محشر کے حالات' جنت و دوزخ کا وجود' پل صراط کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل نے دریافت کیا۔۔۔اس کو ماننا یہ ایمان ہے۔۔۔غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

## آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان

جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے انہوں نے بہت ٹھوکریں کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیونکہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی۔۔۔

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے۔۔۔ لیکن غیبی امور کو پالینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل کا نشان بنایا انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔

## منکرین آخرت کا نظریہ

بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے صرف دنیا ہی کا عالم ہے، آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں جب آدمی مر گیا تو فنا ہو گیا' اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا' نہ آئندہ ہو گا' بس قصہ ختم ہوا' وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہو گی حساب و کتاب ہو گا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہو گی ۔۔۔وہ نہیں مانتے۔۔۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے وہ عقل پر پرکھتے ہیں۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی اس واسطے انہوں نے انکار کر دیا۔۔۔ اور موت کے معنی "فناء محض" کے سمجھے کہ بس گیا سو گیا جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہو گا۔۔۔ غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

## دنیا کو فقط "راہ گزر" ماننے کا نظریہ

بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے' دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا' پیدا نہیں ہوا اس کیلئے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آگیا' پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کیلئے عالم آخرت ہے۔۔۔ غرض دنیا ایک راستہ راہ گزر ہے' آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

## پہلے نظریئے کے دنیوی آثار

ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے' جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوبارہ نیست

کھانا' پینا' پہننا اور رہنا سہنا نیز کوٹھی اور بنگلے یہی ان کی دنیا ہے اور یہی انکی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت۔۔۔ جب دنیا ہی دنیا ہے

اگے کہیں جانا نہیں۔۔۔ کوئی حساب دینا نہیں۔۔۔ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ۔۔ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغ برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ کہ آدمی اچھا کھالے' پی لے اور اچھا پہن کر گزر کرے۔۔۔ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے' وہ تکلفات بھی پیدا کئے جا رہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجا دینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سجے گی تو انسان کی زندگی نہیں ہے۔۔۔ تو تمدن کے مبالغ عیش و آرام کی چیزیں' کھانے اور پینے کے سامان' رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغ اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آسکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی' عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے۔۔۔ غرض اس نظریئے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیونکہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس کو برپا کر لو' جتنا چاہو اس میں عیش اڑا لو' بقول شاعر کہ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑا لو آگے کچھ نہیں ہے۔۔۔ تو تمدن و مدنیت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا بھول کر بھی قبر یا آخرت کا کوئی تصور نہیں۔۔۔ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے بس جس طرح چاہو اسے چلا لو۔۔۔ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا' دنیا رہ گئی۔۔۔ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی' فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔

## دوسرے نظریئے کے دنیوی آثار

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے۔۔۔ اسکا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو۔۔۔ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو' جتنا اسباب عیش کو ترک کرو' جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے۔۔۔ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برما میں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہی جنہیں "بھکشو" کہتے ہیں' وہ نہ گھر بناتے ہیں' نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ۔۔۔ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے' بھیک بھی نہیں مانگتے۔۔۔ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے' قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا۔۔۔ جہاں وہ آئے انہیں دیدیا۔۔۔ یہ ان کا کھانا ہے۔۔۔ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں۔۔۔ ایک دھوتی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی۔۔۔ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر ہے جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش

ہو جائے گی۔۔ اور ہے اصل میں آخرت۔۔۔ بہر حال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا۔۔۔ پہلے نظریئے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریئے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی، ہیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھو دینا ہے۔

**عیسائیت اور دنیا**

عیسائیوں میں دیکھا گیا' ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت بنتی ہے' چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے' تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے اس میں پڑے برس گزارتے ہیں اور بڑی مکھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں' بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جا رہے ہیں' دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں' مکان بنانے سے غرض نہیں۔۔۔ اگر گرجا میں کوئی عورت "نن" **(NUN)** بن کے گئی (راہبہ) تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذات دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہو گا۔۔ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی' نہ گھر در ہو گا۔۔۔ غرض ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا برپا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی۔۔۔ اور ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی۔۔۔ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے۔۔۔ وہ بنتی ہے یا نہ بنے' یہ الگ بات ہے۔۔۔ یہ دو متضاد نظریئے ہیں۔۔۔ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے' آخرت ہی ایک چیز ہے۔۔۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے' آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

**اسلامی نقطہ نگاہ**

اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے' آخرت بھی ایک برابر کا علم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے' یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا

الدنیامزرعة الاٰخرة.

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

جیسا بیج ڈال دو گے' ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔۔۔ اچھا بیج ڈالے گا' اچھا پھل نکل آئے گا' برا بیج ڈالے گا برا پھل۔

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے گیہوں اگے گا' کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے بدبودار درخت اگے گا۔۔۔ غرض جیسا یہاں کرے گا ویسا ثمرہ سامنے آجائے گا۔ تو آخرت

سے دنیا بنتی ہے، یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

**دنیا میں رہنے کا انداز** اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟

تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال رہو، تم بھک منگے بن کر ہو گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو۔۔۔ فرمایا۔

**الیدالعلیا خیر من السفلی.**

"اونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے"۔

مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا۔

**کسب الحلال فریضة بعد الفریضة۔**

"حلال مال کا کمانا ایسا ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔

آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے، وہ مانگ کر نہ کھائے دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کو بھک منگا نہیں بنایا گیا، کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے، ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے، عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے۔۔ انکو دین کی طرف دعوت دے، اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر کی ہے۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

**ان اللہ یحب ان یری اثر نعمته علی عبده**

اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے کچھ ڈھنگ کا لباس ہو، کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو۔۔۔ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو۔۔۔ مبالغے کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گذرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا۔

**لاتغلوا فی دینکم۔**

"دین میں زیادہ مبالغہ مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر نبھا سکو"

اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھا سکو۔ یہ ضرور کرو۔۔۔ مگر اپنی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے۔۔۔ اس سے روکا ہے۔۔۔ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

## دولت وعبادت کا باہمی ارتباط

حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے) تم اس طرح زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ، اولاد بھک منگی ہو۔۔۔ فرمایا۔۔۔ "یہ بہتر نہیں ہے"۔۔۔ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔

یہ جبھی تو ہوگا جب آدمی کچھ کمائے گا، کچھ دولت فراہم کرے گا، کچھ بچوں کے لئے چھوڑیگا، کچھ ان کی خدمت کرے گا، کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا۔۔۔ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں، آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ تو حج کی دولت سے محروم ہو گئے۔ یہ آپکے ہاتھ میں دولت ہونے پر موقوف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد ہیں آپ نماز پڑھ رہے ہیں یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے، دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی۔۔۔؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے۔۔۔ تو دولت پر نماز بھی موقوف، حج بھی موقوف، زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف، ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بناتا۔۔۔ اس واسطے اس سے نے حکم دیا۔

### کسب الحلال فریضة بعد الفریضة

"حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔

مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں۔ اتنا کمائیے مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنادے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کردو یا سمندر میں بہا دو اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماؤ اور حلال طریق پر اسے صرف کرو تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے

## وسائل عبادت کا حکم

اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔

آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے۔۔۔ البتہ نیت شرط ہے۔ بلا نیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی، نماز بھی جائز ہوگی مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس

لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

### دنیا وسیلۂ آخرت

اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بن گئی ہے۔

ان الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للاٰخرۃ.

"دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو"۔

تو دنیا آخرت کیلئے کماؤ۔ خدمت واطاعت کے لئے۔۔۔۔ اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔

اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ".

"یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں"۔

تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔

دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا۔

نعم المال الصالح للرجل الصالح۔

"اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے"۔

تو یہاں مال کی تعریف کی ہے۔۔۔ غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے، مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔ مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔ وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی ہو تو صحابہؓ میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔ حالانکہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں، ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، ہزار پتی بھی ہیں۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑ پتی، لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔

### کروڑ پتی امام

آپ ہی کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جن کی فقہ پر آپ چل رہے ہیں، کے ہاں ریشمین کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمین کپڑا فروخت ہو گیا، بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا سپلائی ہوتا تھا جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑ پتی تھے حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر

کروڑوں روپیہ جمع تھا جسمیں کچھ وصیتیں تھیں۔ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

## تجارت میں امام ابی حنیفہؒ کی احتیاط

بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا۔۔ چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔

اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو' تب بیچوں۔۔۔ چنانچہ مہینہ بھر روکے رکھا۔ مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا۔کافی نفع ملا۔

دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک روپیہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھا دی۔ گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔

یہ رقم لا کر امام صاحبؒ کے خدمت میں پیش کی۔۔۔ امام صاحبؒ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر' اسی ہزار روپیہ نفع ہوگا' وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔

فرمایا اتنا نفع کیسے ہوا؟

اس نے کہا' اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تا کہ کچھ مانگ بڑھ جائے' کچھ گرانی ہو جائے اور اس کے ساتھ میں میں نے ایک روپیہ فی روپیہ بڑھا دیا۔

فرمایا۔

"نعوذ باللہ!۔۔۔ پہلی صورت "احتکار" کی بھی۔۔۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کرو تا کہ گاہک مجبور ہو کر خریدے۔۔۔ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کر دو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے' شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے"۔

پھر فرمایا کہ۔

"ایک روپیہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا' شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی"۔

فرمایا۔

"اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو' خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا۔۔۔؟ لہٰذا ایک پائی

میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے۔۔۔ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کر دیا جائے"۔

تو اڑھائی لاکھ روپے اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دے۔۔۔ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختگی ہوتی اور مال کمایا جاتا۔

## مصارف سے مداخل کا اندازہ

جب جائز پر طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا۔۔ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ۔

"میں مال کے مصارف کو دیکھ مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا"۔

غرض امام صاحبؒ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا تھا۔

## امام ابی حنیفہؒ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں

امام ابی حنیفہؒ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار' پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام' کوئی حدیث کا امام' کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ نکھر نکھرا کر جو اخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی ہو مرتب کر کے لکھی جاتی کہ یہ قرآن و حدیث سے قریب تر ثابت ہے۔۔ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے۔۔۔ تو ان چار' پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحبؒ کے خزانے سے دی جاتی۔۔۔ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر' کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

## امام ابی حنیفہؒ کا غرباء پر خرچ

پھر یہ الگ تھا کہ صدقات و خیرات کے اندر کوفے کے جتنے گھرانے تھے ان کی فہرستیں امام صاحبؒ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے ہیں' اتنے بچے ہیں' اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھا پی لیتے ہیں اور پس اندازہ اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کوفے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قدو قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے--- عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے کہ ہم غریب نہیں' ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ابی حنیفہؒ سلامت چاہئے--- غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھرانہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا--- تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

## ایک مقروض سے امام صاحبؒ کا معاملہ

پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحبؒ دے دیتے تھے' تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی' دینے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کروں--- تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحبؒ آرہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آرہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا--- سامنے نہیں ہوتا تھا --- شرمندہ ہوتا۔

امام صاحبؒ سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔

امام صاحبؒ آرہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا--- تو امام صاحبؒ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جاکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا--- فرمایا۔

"بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟"۔

اب وہ چپ۔ کیا کہے دل میں چور تھا ہی--- فرمایا:

ایسا معلوم ہوتا ہے پیسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا"۔

یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہیں۔ وہ خود مالدار آدمی تھا--- یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا --- کترانے کی یہ وجہ ہے--- فرمایا:

مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کیے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمد و رفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی"۔

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کر دیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا۔۔۔ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط کا تھا۔

## عبادت مالیہ کی توفیق کا معیار

اس لئے شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اسکے آنے کے راستہ کا پتہ چلا لیتا ہوں اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ ہے اور اگر مصرف غلط ہے تو آیا بھی غلط راستہ سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

## اظہار نعمت کا موقع

بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشی اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک منگے بن کے رہو دنیا میں بالکل ژولید حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو یہ نہیں فرمایا بلکہ :

**ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ.**

”جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے“

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو۔۔۔ کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو۔۔۔ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو۔۔۔ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو۔۔۔ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

## شخصی احوال قابل اتباع نہیں

اب بعض کو یہ شبہ ہو گا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ٹاٹ تک پہنا ہے۔۔۔ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔

وہ ان کا حال قانون نہیں ہوتا۔۔۔ یہ قانون شریعت ہے، باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم ﷺ نے جو قانون غیبی پیش کیا قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے، ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی انکی عزت کی جائے گی ان کے اس فعل

کو بڑا سمجھا جائے گا مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہذا تم بھی چھوڑ دو۔۔۔ غرض یہ قانون نہیں شخصی حال ہے۔۔۔ آپ کے اندر وہ حال آ جائے گا آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زندگی کا اتباع

بعض حضرات صحابہؓ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا۔۔۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے؟۔۔۔ آپ ﷺ چونکہ سید الانبیاء ہیں تو آپ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرامؓ گنے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں جو خالص ﷺ کی ذاتی شان تھی اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابوذر غفاریؓ۔۔۔ صحابہؓ میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمانؓ کا دور خلافت تھا۔۔۔ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا' پینا خوب تھا وہ غریبی تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں' کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں' لباس بھی عمدہ ہے۔۔۔ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دستر خوان پر دو کھانے تھے' بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا:

"حضور ﷺ کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکھنا کب جائز ہے؟"۔

یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا' بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ:

"حضور ﷺ کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی' ابھی صدقہ کرو"۔

حتی کہ لوگ عاجز آگئے۔۔۔ اور حضرت عثمان غنیؓ کو لکھا گیا کہ:

"انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانون شریعت پر چلتے ہیں' قانون میں گنجائش ہے' توسعات ہیں"۔

## نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک

اور حضور ﷺ کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو بہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں۔۔۔ اب آپ ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپ مصلے پر تھے' تکبیر ہو چکی نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی"۔

صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ!

"آج خلاف عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ، گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے کچھ دیر لگی کیا وجہ پیش آئی؟--- فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا، چاندی اس کے گھر میں ہو"۔

وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے--- اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دواڑھائی روپے کا سونا تھا--- فرمایا:

"جا کے اسے صدقہ کیا گھر کو اس سے پاک کیا تب آکر میں نے نماز پڑھائی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو"۔

تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے--- یہ کس کی مجال ہے اور کس کی ہمت ہے؟

## توسعات شریعت

شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو صدقات دے دو بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے، عام لوگ تو اسی پر چلیں گے--- اب یہ کیفیت کہ ایک پائی گھر میں نہ رہے، یہ حال ہوگا کیفیت ہوگی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا وہ قانون نہیں بنا کرتا حجت قانون شریعت ہے، ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے، سبحان اللہ! تم یہ کام کرو تمہاری بھی تعظیم کریں گے لیکن تم قانون بنا کر اس کو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو یہ جائز نہیں ہوگا بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہوگا۔

بہر حال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا۔ حال اس کے لئے حجت ہوگا جو صاحب حال ہے، وہ عمل کرے، اس کی عظمت کی جائے گی۔

## اتباع بلا حال

ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت جن کے بہت سے مرید تھے--- شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی تو شریعت نے اجازت دی ہے، انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہٰذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا--- یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل پیغمبر کی ہوتی ہے نہ کو لوگوں کے فعل کی--- پھر یہ

کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے' اتنی بیماری آنی چاہئے تھی جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی۔۔۔ بیماری تو ندارد ہٹے کٹے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔

### تعظیم صاحب حال

البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی' اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہوگی۔

### توسعات شریعہ کا دائرکار

بہر حال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہے' صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو' حلال کے دائرے میں رہو۔

دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو' اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے۔۔۔ ایسے شخص کو حضور ﷺ نے بد عادی ہے۔ فرمایا:

**تعس عبدالدرهم تعس عبدالدينار تعس عبدالخميصة**

"برباد ہو پیسے کا بندہ' برباد ہو گیبوں کا بندہ' برباد ہو شالی چادروں کا بندہ"۔

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یاد نہ آخرت یاد نہ فرائض یاد۔۔۔ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی۔۔۔ تو ایسے آدمی کو حضور ﷺ نے بدعاء دی ہے۔۔۔ لیکن جائز حدود میں رہ کے۔ "جمال پسندی" جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھالے بلکہ رکابی ہو پھر رکابی ذرا نفیس اور کچھ اچھی بھی ہو' دیکھنے والوں کی نظر میں نہ چبھے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں' البتہ مبالغہ نہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں' شام کی اور ہوں دوپہر کی اور۔۔۔ اسی طرح رات سونے کا لباس اور' دوپہر کا اور' یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالانکہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

### دولت دنیا کی مدح وذم کا معیار

بہر حال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی ہے اور مدح بھی آئی ہے' اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کردے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت کے پہنچانے کا ذریعہ بن جائے اسی لئے عارف رومی نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوا۔ کنارے پر جا لگائے گا اور منزل آجائے گی۔۔۔ لیکن اگر پانی

کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسان قلوب کشتیوں کی مثل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آگئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

## استعمال دنیا

مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے محبت نبویؐ رہ جائے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

## محبت طبعی

پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کریم نے توسع کر دیا ہے یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیونکہ ایک مطلقاً محبت ہونا ہے یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں حارج ہو جائے اس سے بچو چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

"حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم ﷺ لوگوں سے فرما دیجئے یہ تمہارے آباء واجداد' یہ تمہاری آل واولاد' یہ تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے بیوی اور بچے یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندا نہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو' یہ سب چیزیں اگر "احب" بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھننے والی ہے"۔

لیکن اگر یہ نہ ہو کہ "احب" نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے' اس کو

شریعت نے نہیں روکا کہ فطرۃً اپنے مال اور گھر بار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا احبیت کو روکا ہے۔

"احب" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب نہ واجبات --- اس محبت کو روکا ہے لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے حج بھی کر رہا ہے اور ذکر میں بھی مصروف ہے یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

### دولت دین و دنیا خدا کا شکر ہے

کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے تجارتیں بھی ہیں منافع بھی ہیں گھر بار بھی اچھے ہیں پہننا رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں --- بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوٹھیوں بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں بچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سجے سجائے ہوں۔

### اللہ میاں کے بنگلے

میں نے تو یہاں آ کے کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ --- یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلہ بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے کوئی مضرت نہیں ہے جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجالیں اس میں کیا حرج ہے اس طرح اپنے لباس کو بھی سجالیں اللہ کے گھر میں قالین بچھائے اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھا لیں تو اس میں کیا حرج ہے --- بس یہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑنے گے۔

ورنہ اگر یہ چیزیں بھی ممنوع ہوتی ہے تو صحابہؓ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا --- حالانکہ حضرت صدیق اکبرؓ مال دار لوگوں میں سے ہیں حضرت جابر بن عبداللہؓ بڑے مال دار صحابہؓ میں سے ہیں۔

## حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت

مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر تشریف لائے کچھ اداس، غمگین اور چہرہ اترا ہوا۔۔۔ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ فرمایا: "خزانے میں دولت اتنی جمع ہو گئے ہے کہ میرا دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے"۔

وہ بھی صحابیہؓ تھیں۔۔۔ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا۔۔۔؟

فرمایا: "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فرمایا۔

"گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، صدقہ کرنا شروع کر دو غریبوں کو دینا شروع کر دو"۔

فرمایا: "واقعی تدبیر تو اچھی بتائی"

چنانچہ جا کر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کر دو۔

صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔۔۔ صبح کو آکر بیوی کے ہاتھ چومے تجھے جزائے خیر دے، کیسی اچھی تدبیر بتائی' میرا دل ہلکا ہو گیا۔۔۔ تو اتنے دولت مند بھی تھے مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا' زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

## حضرت صحابہؓ کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسری صحابی سے زمین خریدی قیمت ادا کر دی زمین قبضے میں آگئی عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگچہ نکلا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا' گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا۔۔۔ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی۔۔۔ اور فرمایا:

"یہ آپ کا دیگچہ ہے؟"

انہوں نے کہا:

"کیسا دیگچہ ہے"۔

فرمایا:

"وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی' دیگچہ تھوڑا ہی خریدا تھا۔۔۔ یہ آپ کا حق ہے"۔

انہوں نے کہا:

"جب میں نے زمین بیچی تھی زمین میں تحت الثریٰ تک جو
کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آگیا 'لہذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق
نہیں"۔

اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے۔۔۔ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔

آخر وہ مقدمہ حضور ﷺ کی خدمت میں گیا۔۔۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟"۔

تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی۔۔۔ فرمایا:

"دونوں کی شادی کر دو اور اس میں اس دولت کو خرچ کر دو!
بس سکون ہو گیا"۔

ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں۔۔۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا حق ہے۔۔۔ وہاں لڑائی اسپر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں۔۔۔ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں۔۔۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔۔۔ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے۔۔۔ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کر لو اور خرچ کر لو۔ کچھ اچھا کھا پہن لو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

### دنیا آخرت کی کھیتی ہے

بہر حال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا راستہ اور ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چوراہے میں پڑ کے گزرے، چاہے میلے میں پڑ کے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے، بس آخرت میں پہنچ جائیں گے اس کا نام تو رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے اگر اس مذہب پر دنیا چلتی ہے تو ویران ہوتی ہے اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے بس دنیا ہے لہذا حلال و حرام کی تمیز نہ کرو بس کھاؤ، اڑاؤ عیش کرو اور مزے کرو۔۔۔ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے۔۔۔ اور یہ بتلایا ہے کہ:

الدنيا مزرعة الاخرة

"دنیا آخرت کھیتی ہے"

جیسا بیج ڈال دو گے ویسا ہی آخرت میں پھل کمالو گے اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے۔۔۔ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور "زقوم" وغیرہ ہے ملے گا جس کا تحمل کرنا مشکل ہو گا کیونکہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔

غرض دنیا کو نہ تو راستہ بتلایا کہ بھئی! مسافر کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ کھیتی قرار دیا جس میں "بونا" ضروری ہے۔

## کاشتکار کا فریضہ

ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا بیج بھی ڈالنا پڑے گا پانی بھی دینا پڑے گا اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی۔۔۔ تب جا کے وہ چھٹے مہینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا۔۔۔ غرض دنیا کو فرمایا یہ کھیتی ہے تو تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کہ میں بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کماتا، اس وقت حسرت میں مبتلا ہو گا۔۔۔ لہذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

## مقام آخرت

اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر کھی ہوئی ہے بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی۔ نکالتے رہو۔ انہی افعال میں سے نکلے جو ادا کر رہے ہو۔ نیت اچھی ہونی چاہئے اتباع سنت ہونا چاہئے اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہو گی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آدمی دستر خوان پر بیٹھے بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمد اللہ کثیر اً پر ختم کرے:

غفرله ماتقدم من ذنبه.

"اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے"۔

تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد و ثناء سے ابتداء وانتہاء نہ کرتا تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا۔۔۔؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص شفقت و محبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔۔۔ دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے۔۔۔ مگر نیت کی سچائی سے

نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتایا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟۔۔۔ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے صدقہ کیا اور "زوج" بنا کے صدقہ کیا یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے:

من انفق من کل شئی زوجین.

"ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا"۔

تو فرماتے ہیں۔۔۔ جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔۔۔ تو دنیا میں دو چیزوں کا یعنی جوڑے کا صدقہ کیا اس سے ہی تو آخرت بنی، تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی، آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔؟

بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

## تجارت میں مخفی آخرت

آپ تجارت کر رہے ہیں نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

التاجر الصدوق الامین مع السفرة الکرام البررة

" ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہو گا جنتوں میں ان کے ساتھ جائے گا"

کتنی بڑی فضیلت ہے، اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا:

غفر اللہ لرجل کان سھلاً اذا اشتری سھلاً واذا باغ سھلاً.

" اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے خرید تا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے"

بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گاہک کو نقصان نہ ہو۔ گاہک خرید تا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ:

غفر اللہ لرجل

"اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحمدلی سے بیچ رہا ہے اور

اس کی بھی مغفرت کرے جو رحمدلی سے خرید رہا ہے"۔

اگر تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا۔۔۔؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے' یہ نہیں کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے۔۔۔ اسی دنیا میں آخرت چھپی ہوئی ہے' نکال لینا آپ کا کام ہے جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول چھپے ہوئے ہیں' نکال لینا کاشتکار کا کام ہے کہ بیج ڈالتا رہے' پانی ڈالتا رہے پھل نکلتا رہے۔۔۔ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے کہ یہ آسمان پر رکھی ہوئی ہے' وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے' اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی۔۔۔ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ رد کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے۔۔۔ ہر چیز سے کام لے۔۔۔ حیات سے بھی کام لے' موت سے بھی کام لے۔

## موت میں مخفی آخرت

چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے اجر نکال لے' وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ بیان کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے' قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو' اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے' اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔۔۔ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا۔؟

حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا' وہ واویلا کر رہی تھی۔۔۔ سر کے بال نوچ رہی تھی کہ ہائے ہائے۔۔۔ نبی کریم ﷺ گزرے۔ فرمایا:

"بڑی بی! صبر کرو"۔

بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور ﷺ ہیں' اس نے کہا:

"ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو' تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے' مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی"۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اچھا تو جان!"

آپؐ آگے تشریف لے گئے۔۔۔ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور ﷺ تھے۔۔۔ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں' آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں"۔

آپ نے ارشاد فرمایا:

الصبر عند الصدمة الاولیٰ.

"جب صدمہ پیش آیا تھا جب صبر کرتی تو اجر ملتا"۔

یوں تو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آجاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے۔۔۔ تو وہ مجبوری کا صبر اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے۔۔۔ مجبوری کی چیز اور بے اختیار چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ اختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔

غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

### دوسرے کی نیکی ذریعۂ ترقی

علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھو تو حرص کرو۔ برائیاں دیکھو تو حرص مت کرو۔۔۔ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے۔۔۔ اور توفیق ہوگئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوا دینے کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

### دوسرے کی برائی ذریعۂ عبرت

اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت، نصیحت و موعظت موجود ہے انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کر دے۔ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے۔ ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے۔۔۔ یہ جبھی ہوگا جب دنیا بچی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

### حضرات کا احترام

اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ وقت بھی تھوڑا تھا اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور سفر کی آخری رات بھی ہے۔ اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہو گیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اعلان کے احترام۔۔۔ اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم و عمل کی توفیق دے۔ ہماری دنیا بھی درست فرما دے اور آخرت بھی درست فرمادے اور ہمیں عدل واعتدال پر قائم رکھے۔۔۔ افراط و تفریط

اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے آمین!

## دعاء

اللهم ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اللهم افتح لنا بالخير واختم لنا بالخير وا جعل ثوابه الجنة امين

اللهم انا نسئلك خير الدنيا والاخرة.

اللهم انا نسئلك خير الحيوة و خير الممات و ثقل موازيننا وثبت اقدامنا و انصرناعلى القوم الكفرين.

اللهم اغفرلنا ذنوبنا

اللهم انصرنا واعف عنا واهدنا سبل السلام واخرجنا مين الظلمت الى النور و جنبنا بالفواحش ماظهر منها ومابطن.

اللهم ربنا اتنا فى الدينا حسنة و فى الاخرة حسنة وقنا عذاب النار.

وادخلنا الجنة مع الابرار يا عزيز يا غفار برحمتك يا ارحم الراحمين.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی' شیطانی اور رحمانی' مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں
کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہست
کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے ع

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ سَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ............ اَمَّا بَعْدُ ............

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

# اقسام عالم اور ان کے حصص

بزرگان محترم!

انسان عالم صغیر ہے۔ عالم کبیر کے جملہ نمونے اور نقشے اس میں موجود ہیں' چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد اور عالم غائب عالم شاہد اجسام کا مجموعہ ہے جو آنکھوں سے مشاہد اور محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً دریا' پہاڑ' زمین' آسمان وغیرہ۔۔۔ انسان میں عالم شہادت بدن ہے۔ جس میں گوشت پوشت' ہڈی' چمڑہ وغیرہ اعضاء بدن وغیرہ۔ پھر جیسے اس دنیا میں عالم شہادت کے دو حصے ہیں۔ سفلیات' جیسے زمین اور اس کے سبزہ زار دریا' پہاڑ وغیرہ۔ علویات جیسے آسمان' چاند' سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں فوقانی حصہ جس میں قلب اور دماغ ہے' اس کے علویات ہیں۔ اور تحتانی حصہ جن میں مختلف حسی اعمال و حرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں' پیٹھ وغیرہ یہ اس کے سفلیات ہیں۔

## عناصر اربعہ کی کار فرمائی میں کمال درجہ تشابہ

پھر جس طرح عالم انسانی کی بنیاد عناصر اربعہ آگ' ہوا' پانی اور مٹی کے مادوں پر ہے بعینہ انسان میں انہی چار مادوں کے اثرات حرارت' برودت' یبوست اور رطوبت کار فرما ہیں۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کار فرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہٖ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔

## مٹی کی جملہ انواع

مثلاً زمین ایک تودہ خاک ہے۔ ایسے ہی انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے پھر جس طرح زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول و عرض اور عمق سب کچھ ہی ہے۔

ایسے ہی انسان کا بدن ہے۔ پھر جس طرح زمین کھودو تو تری نکلنا شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کاٹنے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے۔ سفید' سیاہ' سرخ' زرد۔۔۔۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے۔ مستور حصے جیسے زیر بغل' کنج ران سیاہ ہے۔ چہرہ پر سرخی رہتی ہے۔ ہڈیوں کے جوڑ کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے پوری نوع بشر پر نگاہ ڈالو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید' مشرقی اور افریقی سیاہ' ہندوستانی گندم گوں' چینی زرد اور عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے جیسے تفریح گاہ اور کوئی گندا جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں' ایسے ہی انسان کا لطیف اور صاف ستھرا حصہ چہرہ اور ہاتھ ہے جسے عزت سے چومتے ہیں۔ اور گندا حصہ زیر بغل یا اعضاء نجاست ہیں۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات و کیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

**آگ کی جملہ انواع**

پھر جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے۔ بعینہ بدن انسانی میں حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اسی حرارت غریزی و طبعی پر انسانی زندگی قائم ہے پھر جیسے مٹی اور پتھر اور لوہے کے آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی انسانی ران یا ہاتھ کے آپس میں رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جیسے آگ در حقیقت فیض ہے علویات یعنی سورج کا۔ یعنی سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں' ایسے ہی بدن انسانی میں حرارت اس کے علویات یعنی قلب اور دماغ کا فیض ہے۔ قلب ہی حرارت غریزی تیار کرتا ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے اور قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

**پانی کی جملہ انواع**

پھر یہ پانی جیسے زمین کے گوشے گوشے میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی انسانی بدن میں رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے۔ پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں کوئی بڑے دریا ہیں' کوئی چھوٹے' ایسے ہی بدن انسانی میں بڑی اور چھوٹی رگیں گویا دریا ہیں۔ پھر جیسے زمین میں نہریں' ندی نالے' پانی کے دو مگرے مثلاً تالاب ہیں' ایسے ہی انسانی بدن میں وہ رطوبات کا پانی رہتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں شیریں' نمکین اور شور مختلف قسم کے چشمے ہیں ایسے ہی انسانی بدن میں منہ سے آب شیریں اور آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے۔ پتے سے کڑوا اور معدہ سے ترش پانی چلتا ہے۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ سے یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں ہے کہیں کا جما ہوا ہے جیسے بحر منجمد شمالی تو بلغم وغیرہ منجمد چشمے ہیں۔ پھر جیسے کہیں گندا پانی ہوتا ہے۔ انسان میں پیشاب پاسنک گویا گندہ پانی ہے۔ بہتا ہے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے ہیں۔ اور کہیں گرم جہاں گندھک کا زور ہے۔ ایسے بدن انسانی میں ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری زبان سرد پانی کا چشمہ اور پیشاب گرم پانی کا چشمہ۔ پھر دنیا میں مجمع البحرین ایک مقام ہے۔ جس کا ایک حصہ شیریں اور دوسرا تلخ و شور ہے۔ ایسے ہی انسان کے دماغ کی حس مشترک میں شیریں چشمہ قوت ذائقہ اور نمکین چشمہ قوت باصرہ موجود ہے۔ پھر جس طرح دنیا میں برسات ہوتی ہے ایسے ہی بدن انسانی میں پسینہ ہے۔

**ہوا کی جملہ انواع**

پھر جس طرح عالم کا ہر خلا ہوا سے پر ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن کا ہر خلا ہوا سے بھرپور ہے۔ پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں سانس کے ذریعے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ سرد ہے اور جو ہوا باہر نکلتی ہے وہ گرم ہے پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی۔ ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو خوشبودار ہوتی ہے اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار' پھر جیسے زمین پر جس اور گھٹن ہونے سے انسان کا دل گھبراتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ ایسے ہی ریاح بند ہونے کے وقت حالت ہوتی ہے۔ پھر جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر

ہوا کھینچ لی جائے تو سارا عالم ختم ہو جائے ایسے ہی انسانی بدن میں سانس کھینچ لی جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔ غرض ہوا کی جملہ انواع انسان میں موجود ہیں۔

**انواع جمادات**

جمادات میں ہڈیوں کا سلسلہ گویا پہاڑ ہیں۔ جن میں سے پہاڑوں کی طرح کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔۔۔۔ پھر جس طرح پہاڑوں پر مٹی جمتی ہے ایسے ہی اقلیم بدن پر گوشت چڑھا ہے۔ پھر پہاڑوں کے بعض خطے گرم ہیں، بعض سرد، ایسے ہی انسانی بدن کے مستور حصے گرم ہیں اور سطح بدن کے تمام نمایاں حصے سرد، پھر پہاڑوں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں چہرہ مہرہ کی ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے اور بعض حصوں کو دیکھنا شرعاً و عقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر زمین کے بعض حصوں کو دیکھنے کی قوت ہے لیکن ایسا کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کے بعض حصوں کو دیکھنا (مثلاً پیٹھ وغیرہ) حماقت ہے۔ پھر جیسے پہاڑ پر نباتات اگتے ہیں، ایسے ہی انسان بدن پر بال اگتے ہیں۔ پھر جس طرح زمین پر کہیں گھنا جنگل ہے، کہیں جھنڈ، ایسے ہی انسان بدن کے چہرہ اور سر پر گھنے بال ہیں اور عام بشرہ بدن پر چھید ہیں۔

پھر جس طرح زمین پر بعض نباتات برابر بڑھتے اور نشو و نما پاتے رہتے ہیں اور بعض یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں یکساں رہتا ہے۔ پھر بعض جگہ زمین کے جھاڑ جھنکار کے صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی۔ ایسے بدن انسانی کے موئے بغل اور موئے زہار ہیں۔

پھر زمین کے بعض حصے قائم رکھنے سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور بعض حصوں کی تراش خراش سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں موئے ریش ہیں جن کے رکھنے سے انسانی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز انکی اصلاح اور موئے شوارب کی تراش سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

**انواع حیوانات**

پھر جس طرح زمین کے مختلف قسم کے حیوانات کی غذا زمین کی رطوبات ہیں۔ ایسے ہی انسانی جہاں میں سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدے میں ریسمانی کیڑے، بدن کے خون کو چوستے اور بڑھتے ہیں۔

پھر جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں مختلف صورتوں کے حشرات الارض ہیں ایسے ہی انسان کے بدن میں مختلف رنگوں کے جراثیم ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں۔

پھر جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے جانور مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی انسانی بدن کے حصہ میں نئی نئی شکل و شمائل کے جراثیم ہیں۔

پھر جس طرح زمین کی مخلوقات زمین میں پیدا ہو کر مرکز زمین میں ہی دفن ہو جاتی ہیں' ایسے ہی جراثیم بدن میں پیدا ہو کر مرتے اور بدن میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

### آثار زلزلہ

پھر جس طرح زلزلہ سے ساری زمین حرکت میں آتی ہے ایسے ہی بدن میں دھر دھری آنے سے پورا بدن اچانک متحرک ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر جس طرح زلزلہ کا سبب آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اندورنی گرمی' بھڑکاہٹ یا پریشانی دل سے انسان کے پورے بدن میں دھڑ دھڑی آجاتی ہے۔

پھر جس طرح اقلیم عالم میں عناصر کے غلبہ سے غیر معتدل آثار پیدا ہوتے ہیں مثلاً قحط سالی' آندھیاں' آگ برسنا' ایسے ہی اقلیم بدن پر غیر طبعی آثار مثلاً بخار' زکام' سرسام اور خارش وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔

### عقل وحکمت کے آثار

پھر جس طرح عقل وحکمت کی کمی اور شہوات عضلات کی زیادتی سے انسان' انسان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض دفعہ بحرانی مرض پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ پھر جس طرح کسی ملک پر بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے اور وزراء جنود وعساکر اس کے مددگار ہوتے ہیں' ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے۔ دماغ اور حواس خمسہ اس کے وزراء اور مشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں۔۔۔ پھر جس طرح علویات میں چاند اور سورج روشن ہیں۔ بعینہ اقلیم بدن میں سر میں دو آنکھیں منور ہیں پھر جس طرح ستاروں سے راستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کے نتائج اور نظریئے ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں۔

### ستاروں کے آثار

پھر جیسے ستارے مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں' ایسے ہی دماغی فکر غم ومسرت پیدا کرتی ہے۔ پھر جس طرح آسمان کے اوپر غیب میں جنت ہے۔ جس میں سوائے مسرت واطمینان کے غم کا کہیں نشان نہیں۔ بعینہ انسان میں آثار فرحت ومسرت اور بشاشت وطمانیت مثل جنت کے ہیں۔ جن میں مگن ہو کر نفس دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر جس طرح غیب میں جنہم ہے۔ جہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں۔ ایسے ہی انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات' مثل جہنم کے ہیں۔ پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے' جہاں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کا بلاواسطہ دور دورہ ہے ایسے ہی فوقانی اشیاء میں انسان کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے۔ جس میں بلاواسطہ اسرار الٰہی

متجلی اور منکشف ہوتے ہیں۔

## ملائکہ وشیاطین

پھر جس طرح آسمان پر فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں جن میں عصیان کا کہیں نشان نہیں‘ ایسے ہی دماغ میں حواس خمسہ ملائکہ کی طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔۔۔ پھر جس طرح غیبی عالم میں آسمان کے نیچے گمراہ شیاطن ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے نہیں جھکتے‘ ایسے ہی انسانی دماغ کے نیچے نفس ظلمانی ہے‘ جو قلب کے اشاروں پر نہیں چلتا اور فانی لذات میں منہمک ہو کر سارے اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا ہے۔

## عالم غیب سے تشابہ

دوسرا عالم‘ عالم غیب ہے جو جسمانیت سے پاک ہے اور صرف دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے‘ مثلاً ذات وصفات حق‘ ملائکہ‘ عالم اسرار غیب وغیرہ‘ انسان کا عالم غیب روح انسانی ہے جس میں علم کے سرچشمے ہیں اور لطیفہ روح معنویات و روحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔ گویا اس روح میں کمالات باطن کے نمونے ہیں جو اس کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ جس طرح ذات بابرکات مدبر و حکیم اپنی حکمت وقدرت سے سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا توجہ ہٹالے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

اسی طرح روح انسانی بدن کی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اگر ذرا بھی اپنا رخ بدن سے پھیرے تو اقلیم تن گل سڑ جائے‘ پھر جس طرح وہ مختلف رنگ کے جہانوں کے لئے ایک مدبر ہے‘ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح روح بھی انسانی بدن میں وحدہ لاشریک ہے۔

پھر جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود انسانوں سے اوجھل ہے اور۔۔۔ ادراک سے قاصر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی ہے۔ پھر جیسے وہ خالق اکبر عالم کے ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ ہونے کے باوجود کوئی اشارے سے نہیں بتلا سکتا کہ ذرا ادھر یا ادھر۔ ویسے ہی روح انسانی رگ رگ میں سمائے ہونے کے باوجود کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس کونے میں بیٹھی ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ‘ کو جو تعلق عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں جو بیت اللہ سے ہے وہ عام جہان سے نہیں۔ چنانچہ اگر مقامات مقدسہ پر آنچ آجائے تو سارا عالم زیروزبر ہو جائے‘ ایسے ہی روح انسانی کا سب سے زیادہ تعلق قلب سے ہے

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ‘ ملائکہ مقربین کو مامور فرماتے ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حکم الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کی صفت بھی رشد وہدایت ہے۔۔۔ پھر جس طرح ہر ادراک اور حواس خمسہ اس کے ملائکہ ہیں جن کی قوتیں دماغ میں پوشیدہ ہیں اور جن اعضاء کے ذریعے قوتیں نمایاں ہوتی ہیں‘ وہ آنکھ کان‘ ناک وغیرہ بمنزلہ انبیاء علیہم السلام کے ہیں۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی گوناں گوں صفات وکمالات ہیں۔ کسی نہ کسی خاص غلبہ کے تحت ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے۔ایسے ہی روح بھی کسی نہ کسی صفت سے ان کارکنوں پر متجلی ہوتی ہے اور ہر عضو آنکھ کان' ناک اس کی اس قوت احساس وادراک کا مظہر ہے۔

پھر حق تعالیٰ شانہ کی سب سے زیادہ جامع تجلی حضور ﷺ پر ہوئی اور آپؐ میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم وکمالات جمع کر دیئے گئے ہیں ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ تجلی قلب پر ہے اور قلب مجمع العلوم ہے۔ حواس خمسہ میں ادراک وشعور کا فیض قلب ہی کا ہے۔

پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت ومعرفت حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی نبوت ومعرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ ایسے ہی ان اعصاء حواس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے اور قلب بالذات مدرک ہے' چنانچہ آنکھ کان بند کر کے تنہا قلب تدبر وفکر کرتا ہے اور ساری کائنات کے نقشہ کو عالم خیال میں دیکھتا ہے اور حواس خمسہ کا محتاج نہیں۔

پھر جس طرح حضرت خاتم الانبیاء ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام کے حاکم اور جملہ ادیان کے ناسخ ہیں۔ایسے ہی قلب کا تمام اعضاء رئیسہ مردسہ پر حاکم اور ان کے علمی ذخیروں پر ناقد اور متصرف ہے کہ آنکھ نے صحیح دیکھایا نہیں کان نے صحیح سنایا نہیں اور قلب کے علوم پر اختیار نہیں۔

پھر جس طرح کمالات خداوندی آپ کی ذات بابرکات پر اولاً اترے 'اسی طرح روح کا فیضان بھی اولاً قلب پر ہوتا ہے۔یہاں تک کہ حیات وزندگی بھی پہلے قلب پر اترتی ہے۔

پھر جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر عمل کے لئے جبر واکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں' ایسے ہی روح انسانی اشیاء کے حسن وقبح دکھلا کر اعضاء بدن میں استعداد عمل کی قوت پیدا کر کے نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتی ہے اور عمل کے لئے نفس پر جبر واکراہ نہیں کرتی۔۔۔ پھر جس طرح غذا کے اثرات بدن پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنی تربیت سے اس کے (خیر وشر کے) ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے۔

آخر میں بطور تبرک حضرت قاری صاحب (نور اللہ مرقدہ) کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

غرض مبداء ہو یا معاد' نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا وجزاء' حق تعالیٰ کے کمالات وصفات ہوں یا افعال' ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب عینی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الہٰیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔۔۔ اور ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی' شیطانی اور رحمانی' مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہے۔

آسماں ہاست در ولایت جاں
کافر فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست وبالا ہست
کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے۔

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

(ماخوذ از ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# افادات علم وحکمت

## مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
## حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز
## کے علمی جوابات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اَمَّابَعْدُ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّؤُنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۵

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

### قرآن حکیم اور انسانی نفسیات

ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی وناپاکی تو مراد نہیں ہے جس کے کپڑے پاک ہوں وہ تو طیبین میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ خبیثین میں داخل ہو گیا طیبین وہ خبیثین بلحاظ عقائد واعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ طیبین وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست، اعمال بھی درست اور جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔

اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ خبیثین میں شامل ہو گی، طیبین میں شامل نہیں ہو گی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمادیا گیا:

اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ

وہ آپ کے اہل میں سے نہیں، آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطیع ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

**من اطاعنی فھوالی**

جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے، جو اطاعت نہیں کرے گا وہ آل اولاد سے خارج ہے۔۔۔ یہاں پر نسبی اولاد مراد نہیں روحانی اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہو اور اس دین پر چلے وہ میری اولاد ہے۔

اور بعض روایات میں آپؐ نے فرمایا بھی ہے کہ:

**انا لکم بمنزلة الوالد.**

''میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں''۔

اس سے بھی نسبی باپ مراد نہیں بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب و خبیث کے ہیں کہ جو اس فکر و عقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو ان میں داخل ہے وہ طیبین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طیبین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طیبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو۔۔۔ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے۔۔۔ بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بد آدمی بد چیزوں کی طرف۔۔۔ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آگے گی۔۔۔ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئے گی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طبائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبیؐ کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ بنیاد پاک ہے۔۔۔ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے یا کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت و مجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کر لی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا ناپاک چیزوں کو کبھی نہیں پسند کرے گا۔۔۔ غذا بھی ہو تو پاک غذا پسند کرے گا کیونکہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفارمر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآن

کریم نے صرف حلال وحرام بیان نہیں کیا حلال تک پہنچے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے، حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

## انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات

جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآن کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا صحابہؓ کا مجمع تھا آپؐ نے فرمایا:

**کیف بکم اذا فسق فتیانکم وطغیٰ نسائکم۔**

لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تمہارے نوجوان فاسق و فاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔

صحابہؓ تو خیر القرون میں ہیں ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ ہو جائے گا۔؟

**قال نعم واشدة**

"یہ بھی ہو گا اور اس سے زیادہ سخت بات ہو گی"۔

**کیف بکم اذا لم تامروا بالمعروف ولم تنهوا عن المنکر.**

اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا۔۔۔۔ تو صحابہؓ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہو گا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے، رات دن معروفات میں ہیں بدی کا تو ان کی ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا:

**وان ذلك لكائن يارسو ل الله**

"یارسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟"

**قال نعم واشد.**

"یہ بھی ہو گا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہو گا"۔

**کیف، بکم اذا رایتم المعروف منکراً والمنکر معروفاً.**

اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے اور بری چیزوں کو اچھا جاننے لگو گے یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق و فجور اور تعدی و زیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق و فاجر ہو گئے عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی

ہیں نہ باپ کی سنتی ہے نہ اولاد کی سنتی ہیں جو ان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو نصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ نصیحت کر رہے ہو۔ تو نصیحت کا کیا منہ رہے گا۔ تو نصیحت رک جائے گی تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں وہ بری بن جائیں اور جو بری چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

یہاں آکر فہم کا الٹا پن ظاہر ہوتا ہے، غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے، پھر عقیدے پر پھر نصیحت پر، پھر عقل وفہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زیغ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا فکر بعد میں بگڑے گا عقیدہ اس کے بعد بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا۔۔۔ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلا دیا کہ عمل کی حفاظت کرو تاکہ فکر محفوظ رہے، فکر کی حفاظت کرو تاکہ عقیدہ محفوظ رہے۔۔۔ عقیدے کی حفاظت کرو تاکہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفارمر نے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں قرآن کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھلائے گئے۔

اب جب قرآن کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گا۔ الٹا ہو جائے گا۔۔۔ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ.

"بہت سے وہ لوگ ہیں جو مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ شرک میں مبتلا ہیں یہی تو وہ مقام ہے"۔

## گائے علامت حیات ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کر کے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہو گا۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو۔۔۔ فرمایا۔۔۔

اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ.

”مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الٰہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہو گی؟“

فرمایا:

”وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو“۔

انہوں نے کہا رنگ کیا ہوگا؟

صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ.

نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہو اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی محنت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شانیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے یتیم بچے تھے کھانے کو کچھ نہیں تھا بس یہی ایک گائے تھی۔

سارے بنی اسرائیل جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟

اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا تو اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعونی غرق ہوئے۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہو گئے پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گیا۔ اور بارہ قبیلے اس سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا اقبال کیا۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔

مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا وزیر گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا وہ گھوڑی جو تھی آگے بڑھی۔ گھوڑا بھی لپک کے اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوتی تو سبزہ اگ آتا تھا اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چٹکی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیوارت جمع کرو سونے چاندی کے زیوارات جمع کر کے اس کا بچھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کودنے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔

اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آگیا۔ وہاں سے گو (گاؤ) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد

ہو گئے تھے بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں، تو جو کلمات حقہ حضرت موسیٰ کی زبان سے سنے ہوئے تھے ان میں کچھ اپنی چیزیں مل ملا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہو گئی۔۔۔ بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلواتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

## تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت

تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو معبر اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائیگا۔ اسی لئے سمجھ دار اور خیر خواہ سے خواب کہو تاکہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ نے خواب دیکھا کہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ کہ گائے کے برابر تھا ان کے مد مقابل آیا مولانا نے اس کے سینگ پکڑ لئے اب کبھی وہ ریلتا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینگ مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتویؒ صبح کو تعبیر دیا کرتے تھے، وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرتؒ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔

"موت کو دنبے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے۔۔۔ جو سینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا۔۔۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ عرف کا محاورہ ہے کہ جدی رشتوں کو بطن سے تعبیر کرتے ہوئے کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو افخاذ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ ران کی اولاد ہے یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔۔۔ فرمایا کہ بائیں ران میں جو سینگ لگا تو "ران" سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چونکہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں

چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائے گا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چونکہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی"۔

جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کے چچازاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی۔۔۔ فرمایا تعبیر آگئی۔۔۔

تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔ جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے ستنباط کیا۔ اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔

## تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل

اسی طرح اعداد و شمار کا بھی دخل ہے۔ حضرت نانوتوی ؒ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا۔۔ؒ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔ فرمایا:

"میاں! کشف تو صحیح تھا۔ تعبیر میں غلطی ہوئی۔ فرمایا جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ "مہدی" میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔ تو میں نے کہا۔ ابھی عمر کافی باقی ہے۔۔۔ لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چنانچہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۴۹ سال کی ہوگی۔ غرض ذات مراد تھی نام مراد نہیں تھا۔ اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔ کشف میں غلطی نہیں تھی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد و شمار کو بھی دخل ہے۔ اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں، آیات و احادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا، اعداد و شمار کا خیال رکھنا۔۔۔ بہر حال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔ اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر تعبیر دے سکتا ہے۔

## روحانی لحاظ سے رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار

حضور سرکار کائنات ﷺ کے عالمگیر ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حدیث میں ارشاد فرمایا:

اول ماخلق اللہ نوری.

''اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی''۔

اب ظاہر بات ہے کہ ''نور'' سے مراد حسی نور تو نہیں ہو سکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور اور حسی نور کی نور معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نور علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماہیتیں کھلتی ہیں اس لئے علم کا نور آفتاب و ماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ ''نور علمی'' ہے۔ تو آپ ﷺ کی ذات میں علم گوند دیا گیا اور آپ کو ''مجسم علم'' بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی شریعت کے ہر ہر حکم کے نیچے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے نیچے حقیقت ہے ہر حقیقت کے نیچے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتی کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا۔۔۔ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا۔ زمین میں بھی ظاہر ہوا۔ حجر و شجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا اس لئے حیوانات نے بھی آپؐ کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات آپؐ کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآن کریم ہے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے۔۔۔ تو حقیقت میں علم گوند دیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا تو آپؐ سر تاپا علم ہیں۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کی علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچ صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور علم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہو گی؟ تو ارادہ و قدرت علم کا محتاج ہوا۔۔۔ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا۔۔۔ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ

معلوم نہ ہو۔ قدرت ہو نہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جائے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں۔۔۔ حضور ﷺ کی ذات میں علم گوندیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ کی محتاج ہے۔ آپ ان کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو آپ کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابیؓ نہ ہوتا آپؐ کے کمالات بدستور تھے۔ غرض آپؐ کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں۔ آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام۔ تو یہ آپؐ ہی بتلانے سے پتہ چلے گا۔ غرض ساری دنیا محتاج ہوئی حتی کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپؐ کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولائتیں پیدا ہوئیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ کی اقتداء کی اور آپؐ کو امام بنایا گیا۔۔۔ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اللہ نے "صفی اللہ" بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھر دی۔۔۔ یہ میرے فضائل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے متکلم بنایا کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو ویسا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی جانوروں پر مجھے قدرت دی سب میری رعایا میں داخل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے "روح اللہ" بنایا مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا۔۔۔ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس ﷺ نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے "رحمۃ للعالمین" بنایا مجھے "شفیع المذنبین" بنایا۔ مجھے "خاتم النبیین" بنایا۔۔۔ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپؐ سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں۔۔۔ غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپؐ کے

نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا دنیا میں جو کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے، نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپؐ کے علوم سے ازل سے لے کر ابد تک روشنی پھیلی۔ تو رحمت تو یہی ہوئی۔

## مادی لحاظ سے رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار

دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیرؒ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ :

**لولاک یا محمد لما خلقت ادم**

اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود در حقیقت آپؐ کے طفیل ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔۔۔ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپؐ کے طفیل بٹی۔۔۔ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات علمی آپؐ کے طفیل پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔

## عالم آخرت میں رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار

پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپؐ ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپؐ شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں۔۔۔ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ لوگ پسینے میں غرق ہوں گے۔۔۔ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ۔ تو آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ :

"اللہ نے آپ کو ہم کو سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت و الفت معلوم و متعین ہے۔ آپؑ ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے"۔

وہ فرمائیں گے :

لست لها۔

"میں اس کا اہل نہیں ہوں"۔

میں نے ایک غلطی کی تھی۔۔۔ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔۔۔ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ

تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے، تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگئی، اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔۔۔ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے، خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔۔۔ تو معصیت پر اجر تھوڑا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری و اجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے کہ میں اللہ سے جا کر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں، تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر لوگ نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ:

لست لھا:

"میں اس کا اہل نہیں"۔

میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلایا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔

"جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا"۔

حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا۔۔۔ تو نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھ سے یہ خطاء سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے کہ تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیا منہ ہے تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔۔۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔۔۔ وہ بھی عذر کر دیں گے کہ لَسْتُ لَهَا میرے سے فلاں لغزش ہوگئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قبطی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس کی گردن اڑ گئی حالانکہ وہ خطاء عمداً نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑ گئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جا کر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں شاید کہ تم نے قتل کیا تھا۔۔۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔۔۔ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ لست لھا میں اس قابل نہیں ہوں۔ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا۔۔۔ اگر یہ فرمادیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

تو میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں تو لوگ آپ کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپ فرمائیں کہ انا لھا انا لھا میں اس کا اہل ہوں میں سفارش کروں گا چنانچہ آپ مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی حمد وثناء بیان کروں گا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔

مگر اس قدر رعنا کا دن ہو گا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کہا جائے گا ۔۔۔ سات دن کے بعد آپ کو فرمائیں گے کہ:

یا محمد! ارفع راسك سل تعطی واشفع تشفع

"سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے"۔

غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے ۔۔۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہو گا۔ وہ وہاں پہنچ جائے گا۔ غرض یہ کہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور ﷺ کو عطا ہو گا۔ اس دن آخرت میں سب اولین و آخرین پر آپ کی فضیلت اور آپ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہو گی ۔۔۔ اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے ۔۔۔ تو یہ تیسری "رحمت عامہ" ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہو گی۔

### رحمت نبویؐ کے ابدی آثار

اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور کہوں گا کہ دروازہ کھولو۔ پھر امتیں داخل ہونا شروع ہوں گی۔ گویا جنت میں داخلہ بھی آپ ہی کے طفیل ہو گا اسی طرح ابد تک آپ کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

### رحمت نبویؐ کے ازلی آثار

اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب عہد الست کیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا الست بربکم۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔؟

ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمر سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا:

کیا میں تمہارا رب نہیں ہو؟

تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمر سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل وشعور نہیں تھا اور صفت ربوبیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی

پیدا ہو گئی تو سب سے پہلے آپؐ نے جواب دیا کہ ۔۔۔ بلیٰ ۔۔۔ کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں۔

آپؐ کے جواب دیتے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان پر جاری ہو گیا۔ بلیٰ بلیٰ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اس کے بعد ساری مخلوق نے کہا بلیٰ آپ ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کر لیا اس آسمان وزمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کر لیا۔ اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا ۔۔۔ جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا ۔۔۔ غرض اس وقت سب نے بلیٰ کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ علیہ ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمۃ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ نے جواب سکھلایا ۔۔۔ تو حق تعالیٰ نے تعلیم کے ذریعے سے ربوبیت کا اقرار کرلیا۔ اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے؟ ۔۔۔ غرض ازل میں بھی رحمت' دنیا میں تشریف لائے تب رحمت' برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت' شب معراج میں پہنچے تب رحمت' قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہو گی تب رحمت اور،

**اول من یدق باب الجنة.**

"کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے"۔

تب رحمت ۔۔۔ غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

**رحمۃ للعالمین علیہ**

اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ "رحمۃ للعالمین" ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے بھی رحمت' عالم جنات کے لئے بھی رحمت۔

غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے سب کے لئے آپؐ رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ کے طفیل ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے' اس واسطے آپ کی رحمۃ للعالمین ازل سے چلی اور ابد تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہو گی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔

**رتل وارتق.**

"تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا"۔

ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم تو آپ ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآن کریم کے ذریعے ہوئی جو آپؐ کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآن کریم کی جتنی آیات ہیں جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔۔۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جو آیتیں ہیں یہی بعینہ جنت میں درجات کی صورت منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں وہاں جا کر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی۔۔۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور قومیں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں جو جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآن کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے۔۔۔ غرض آپ کی رحمت قلوب سے لے کر قوالب تک۔ ازل سے لے کر ابد تک۔ دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے' اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا' رحمۃ للعالم نہیں کیا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا ہدیہ جو مخلوق کو دیا' وہ آپ کا وجود مسعود ہے جو عطا کیا گیا۔۔۔ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

**حقیقت توسل** توسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے۔؟ وہ خود موثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا۔۔۔ یہاں تو توسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے' اس میں مجھے بھی حصہ عطاء فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ وسیلے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلے والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے' اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں۔۔۔ لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء علیہم السلام اس طرح تھرتھرائے ہوئے ہونگے جیسے میدان میں پڑا ہو پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟

وہ عرض کریں گے میں نے موسیٰ علیہ السلام کو پہنچادی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے' جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟

عرض کریں گے۔۔۔ میں نے امت کو پہنچادی۔۔۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھرا تھراتے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھرتھر کانپتا ہے۔۔۔ یہی صورتحال اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اس طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟

عرض کریں گے میں نے محمد ﷺ کے قلب پر پہنچادیا' تو آپ طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپ عرض کریں گے' جی ہاں پہنچا۔

فرمایا جائے گا' آپ نے کیا کیا؟

عرض کریں گے' میں نے امت کو پہنچادیا۔

فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ۔۔۔ تو آپ کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین وآخرین کے مجمع میں آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قران کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں' لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کے حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار ومصالح اور حکمتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کر کے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ وبہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے۔۔۔ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں یہ تو عجیب وغریب قرآن ہے۔۔۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ' موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود' اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس ﷺ ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں عملی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ تو ایک عظیم باغ وبہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہؓ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھر تھراتے ہوئے ہونگے تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے توسل کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف' توسل کے یہ معنی ہونگے کہ جس رحمت وبرکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرمالیجئے' کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور ومجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے توسل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس توسل کی نعمت میں ہمیں داخل فرمالیجئے' یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس توسل میں کوئی حرج نہیں ہے اس کی شریعت نے اجازت دی ہے توسل کے اس معنی

کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعا مانگیں، خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے، قبر پر بھی جائز ہے۔۔۔ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں اس کی اجازت نہیں ہے لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس توسل کی اجازت دی گئی ہے۔

## میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟

عید میلاد النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں تو سب سے پہلے صحابہؓ کرتے، تابعین کرتے، آئمہ مجتہدین کرتے۔۔۔۔۔۔

لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ بھائی! کر لیا۔۔۔ لیکن یہ جو نمائشی صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدیٰ ہیں ان کی صورتیں بنا بنا کر اونٹوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو۔ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق و محبت مبتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑ جائے گا اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کا طرف التفاف کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔

## اکمال دین کا طریق

### سوال اول

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہتی ہے، ورنہ اسکی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہو گی؟

جواب الیوم سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دور حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کے بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ "آج بڑا نازک زمانہ ہے" یا "آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہو گیا ہے"۔۔۔۔ "یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے"۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد

نہیں ہوتی بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے متکلم اور مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں۔۔۔ پس یہاں بھی الیوم سے مراد دور حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضور اکرم ﷺ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔۔۔ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی دائرہ اکمال سے خارج ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزول آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ میں داخل رہے گا۔ گو یہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

## تشہیر اکمال دین

رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیۃً آخر میں بلکہ یوم وفات نبویؐ میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہو جاتا اور الیوم کے معنی مطلقاً دور حاضر کے نہ لینے پڑتے؟۔

جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے، پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہؓ کی عددی اکثریت حج نبوی کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیئت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتار دی گئی تا کہ بیک دم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کر کے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہو چکا ہے، تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور علی رس الاشہاد اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ.

## اکمال دین کے بارے میں ازالہ تشکیک

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعویٰ (اکمال دین) عین یوم وفات نبویؐ میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا تو قطع نظر اسکے بروقت اعلان عام نہ ہو سکنے کی ایک

مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے اتمام وکمال کو مشتبہ بنادیتے اور بعد میں آنے والے تیس دجال جو بہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آسکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے لیکن جب اس آیت کے نزول کے بعد حضور نے ۹۰ دن اس دنیامیں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرمادی۔ صحابہؓ بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبرؐ بھی ابھی دنیامیں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آرہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوائے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک وشبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبویؐ میں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنالیا، محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آسکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدار نجات ہونے کا بنیادی دعویٰ تھا عین یوم وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے جبکہ نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیامیں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہر حال آیت کا نزول تو حجت الوداع کے موقع پر رکھا گیا تا کہ ایک وقت میں ’ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص وعوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا علان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبویؐ میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضور ﷺ کو کچھ عرصہ دنیامیں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک وشبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے‘ اور پھر الیوم سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تا کہ بعد کے اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورے کا پورا اپنے اجزاء سمیت کامل پکارا جائے‘ اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب

ہو یا تدوین کی ترتیب ہو، کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

## خلق وکسب

سوال دوم۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔

جواب۔

اس آیت سے بندہ مجبور محض ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہر زدگی اگرچہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق وایجاد سے عمل میں آئی ہے مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کر لی تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا، پس بندہ اس فناء استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے، پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب وخلق جمع چلے آرہے ہیں جب بھی بندہ کسی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ وہ ارادہ کرتا ہے تو اسکے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں، ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے، ایسے ہی اس کے افعال قلب وقالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق وایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبور محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اس کے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلاف عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شئے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھدے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالانکہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو، نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری وباطنی قویٰ پر کوئی پابندی عائد نہ ہو بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزم فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہو گیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا، ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوئچ اور قمقمہ کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوئچ ہلایا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قمقمہ روشن ہو گیا۔

پس حرکت سوئچ کسب عبد کی مثال ہے اور قمقمہ میں روشنی خلق الٰہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوئچ ہلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قمقمہ میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہور افعال اور وجود نتائج میں کوئی دخل نہیں، اس کا کام

صرف کسب ارادہ و فعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے' اس ارادے کی تخلیق وایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بد عمل نے ظالمانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشنا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آگیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت و استعداد ہی فنا ہو گئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلان استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔

بس اسی فناء استعداد کے فعل ایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگادی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہو گا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشتا رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرماتا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشنے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برا نہیں ہو سکتا' ہاں خود شئے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہو گی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برا نہ ہو گا کیونکہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے کہ وجود جیسی نعمت کسی شئے کو بخشی جائے' اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شئے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشنے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقاً نہ کہ اکتساباً اور مجرم کاسب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطی وجود۔

## قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ

سوال سوم۔ ۱

قرآن مجید حمد اور تسمیہ سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چونکہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ دل کی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

جواب۔

تقریر اعتراض کو واضح کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدح چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ انداز کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے' اگر ایک جگہ ایک

دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو، پس ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تا کہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہو جائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں تا کہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اس الجھن میں نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الٰہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم مہم کام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چنانچہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء و صفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مفطور کیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آتی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت و صفت سے ہو، اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیونکہ نہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات و صفات اور افعال ہی اصل ہیں۔ اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔ اسی کی ذات و صفات و افعال اصل ہیں اس کے سوا ہر چیز مجاز اور اس کا ظل محض ہے۔ اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الٰہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظلی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت و توصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا نہ اس کے صفات و افعال سے کسی کے افعال و صفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف و تعریف سے کوئی ثناء و صفت بڑی۔

اس لئے کلام الٰہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنے ہی توصیف سے شروع فرمائے، بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء و صفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی کے نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔ اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں اسکی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ:

کل امر ذی بال لم یبدا باسم اللّٰہ تعالیٰ فھوا قطع۔

"جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے"۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔ اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے۔۔۔ تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہوگا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔ وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں کہ وہ خود سرچشمہ خیر و برکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر و برکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں، اسی لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت و مدد کا حاصل کرنا ہوگا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت و مدد کا اظہار اور پھیلانا ہوگا۔ اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پر عظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بنا ظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کردی گئی، اعتراض کا کوئی موجہ پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا۔

سوال چہارم

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى.

خدا کی مکانیت اور اس کے احتیاج الی المکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم وحدوث کا خاصہ ہے، لوگ اس کو متشابہات میں سے کہتے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ.

عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیونکر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں تخاطب ہی اس کا بیکار ہوگا اور ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل وانشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیین مراد میں احوال متکلم کا دخل

جواب ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے بلکہ اس کے احوال و اوصاف اور شئون کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی انا الرب کہا اور منصور

نے بھی انا الحق کہا۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعوی کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعوی کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعوی و کلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر وجود اور اللہ و رسول علیہ السلام (موسیٰ) کی تکذیب و تردید کے ہیں اس لئے اس کا انا لرب کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلال وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا انکار اور اپنا اثبات ہے گویا فرعون کے متمردانہ احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر کوئی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق و محبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہ ہی وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعوی کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے کلاموں کا مطلب لیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم و کافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادت اجر اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادۂ وزر۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی، جس کے عام احوال نیکی و تقویٰ کے ہوں، اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کر گزرے تو اس کی بھی تاویل حسن کرتے ہیں اور ایک بد آدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہو اتفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خود غرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناء ہی نکلتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال و شؤن اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ از خود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا، بلکہ خود سے ہے، وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو، وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لامحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو، جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطی وجود صرف وہ نہ رہا، دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شئے کو اس کے

وجود سے موجود اور اس کے احاطہ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا' پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کر کر کے دوسروں کو بانٹے جائیں۔ ورنہ ٹکڑے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہو جائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے' یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتو ہی سے منور ہو جاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا از خود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے' کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان و مکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے ٹکڑے نہیں ہوتے' جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ وجود خود لطیف ترین شے ہے' جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا از خود ہونا' محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر استوی علی العرش کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے' اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسیم ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے' بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور اس کی فت میں ہیں۔ تو الرحمٰن علی العرش استوی سے آخر اس کی جسمانیت کیسے ثابت ہو جائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہوم ہوگا؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شانوں اور صفات سے قطع نظر کر کے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا جسامت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

### عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے

بلکہ غور کیا جائے' تو عرش سے اگر ثابت ہوتا ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظروفیت کا کیونکہ اَللّٰهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى نہیں فرمایا گیا' بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے' اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے جس سے سلطنت الٰہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے' رحم و کرم اور رافت و ترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ پیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنا دیا کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا' تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی' جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر و سیاست پر مبنی نہیں' بلکہ رحمت و کرم پر مبنی ہے اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر و معصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور باران رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم و ستم انتہاء کو پہنچ جائے' تو بطور تنبیہ سزا بھی لائی جاتی ہے۔ سو اس کا منشاء بھی رحم و شفقت ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شئون الٰہیہ کا مقتضیٰ ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانیت یا محدودیت حدوث کا کیا تعلق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

### کیفیت استواء غیر معلوم ہے

ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لامعلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لاعلمی کی بناء پر اللہ اعلم بمرداہ بذلك کہا جاتا ہے' نہ یہ کہ استواء علی العرش کا مفہوم نامعلوم ہے' استواء علی العرش صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الکل ہے کیونکہ جسمانیت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے' تو صفت رحمت محیط الکل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا' لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت احاطہ سے' نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شان رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں تخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنا سپرد بخدا کر دینے ہی کے مکلف بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت

کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی شان رحمت ہے کہ بقدر استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

فسبحان اللہ رب العرش العظیم

## پس منظر

جناب محترم و مکرم زید فضلکم!

سلام مسنون، نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۴ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں "داستان عمل" اور "اخلاق و آداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نور علی نور اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ و تشریح کا ایماء فرمایا ہے جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایماء کیا کم تھا کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے تو اسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابل برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں، پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنو کا سفر پیش آ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوری دار العلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آ گیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کانپور کا سفر در پیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تعمیل ارشاد سطور ذیل قلمبند کیں اور بلا نظر ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

علم کی غایت عمل ہے۔ اس کا جوہر تقویٰ ہے۔

اس کا زیور ادب ہے

**شعراء کا ادب**

لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء و اصطلاحات اس ادب کو پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کے صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے معنویت یا واقعیت براہ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی

مطمح نظر ہوتی ہے۔

اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر و بیشتر داد خواہی اور زر طلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین و آفریں اور مدح سرائیوں پر ممدوحوں کی داد ودہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجے کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتیٰ کہ فاسق و فاجر بھی اپنی طبعی ذہانت و ذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاء عرب بلند پایہ شاعر، پرگو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا۔

مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانے کا نام تک زمانہ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تا با دب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزارہا ادیب امراء و سلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔۔۔ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے' شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشر گاہوں سے اسی ادب کے باربردار سینکڑوں ادیب' مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیونکہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں' زیور علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ.

"وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔

حالانکہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں"۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبرؑ کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف و کامل شعراء جیسے عارف رومیؒ، سعدیؒ، عطارؒ اور سلف و خلف کے دوسرے شعر گوا کابر دلوں میں اگر باعظمت ہیں تو

شاعری کی بدولت نہیں بلکہ معرفت کی بدولت یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمال باطن کے۔ اس لئے اس قسم کا اکابر سے مذکورہ بالا نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

**عوام کا ادب** عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام و تعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال و افعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے باادب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر خشمگین ہو جاتے ہیں۔

برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیمات و تسلیمات اور اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سروقد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ و ہیئات کو من و عن ادا کر دینے والا متادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو جو اپنے وقت پر کافی جوش و خروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کی بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے متادب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہر داری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت و معنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں ہوتی بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھرکم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

مخاطب کی حقیقی عظمت و توقیر کا اکثر بیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اسکی برائیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس رسمی شائستگی اور ظاہر داری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جا سکتی ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ. (القرآن)

"یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہر داریوں کو جانتے ہیں اور انجام و عاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں"۔

**تلبیس ادب** مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے

خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں بلکہ خدا اور رسولؐ اور اکابرین دین ودنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال وہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جا رہی ہو لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کئے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا وہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جو ان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔ وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ وحسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شعری رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرف محض رسمی اور نمائشی ہو کر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔ فرق اتنا ہو گا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیادار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلا خشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے' چنانچہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت وانقیاد جذبہ عشق وگرویدگی اور حقیقی نیاز مندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب واحترام اور رسمی آداب وتعظیمات سے گریز نہیں کرتے۔ مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر وغرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں جس سے کبھی تو ان کی زبان قال پر فعلی شیخی اور اپنے علم وادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جس کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب ولہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی کیونکہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہو جانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے۔ کیونکہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی

ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگرچہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہر حال اس رنگ تعلّی و کبر اور عجب وریا کے ڈھنگ کی رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب و تعظیم نہیں بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب و تقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔ پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزارہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے

فساد كبير عالم متهتك واكبر منه جاهل متنسك هما فتنة فى العلمين كبيرة لمن بهمافي دينه يتمسك.

"دنیا میں وہ عالم فساد عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے"۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔

احذروا من الناس صنفين عالم قد فتنه' هواه وصاحب دنيا قد اعمته دنياه ٥.

"دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیادار سے جسے دنیا نے اندھا کر دیا ہو"۔

ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیونکہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقوی باطن ندارد ہوتا ہے کیونکہ تقوی باطن کے ساتھ دعویٰ، شیخی، کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا بلکہ فنائیت، محویت، کمال تواضع، اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت و توقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا، یعنی صورت ادب ہے، ادب نہیں حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

**کمال ادب**

لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب، بے روح ڈھانچہ نہ ہو بلکہ باکیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب

کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر واحکام ہی کو پیش نظر رکھے گا بلکہ اس کے منشاء او اشارہ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا' بلکہ اس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا' بلکہ دل ودماغ اور نفس وروح سے بھی ادب و توقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب وعظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیان علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آسکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کردے گا یعنی ظاہر وباطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عالموں اور دینداروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ وہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز مندی باطنی اور فدویت روح وطبیعت کے سات شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندی احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو نہ گھمنڈ نہ شیخی نہ اتراہٹ نہ اپنی توقیر ہو نہ دوسروں کی تحقیر کی نہ روایت ہو نہ حکایت بلکہ محویت و گرویدگی ہو اور فنا نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کررہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر دوگنا تگنا ہو جاتا ہے اسی طرح علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق وتکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت و اشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتوی کہا جائے تو اس اقتضائی دلالتی اور اشارتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری وباطنی اور فتویٰ وتقویٰ احکام اور حدود

موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امنگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوق حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

**زیور علم**

یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقوی حدود زیر عمل نہ ہو جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال و جمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت و شوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا' پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارات میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مستمر اعملدر آمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیاز مندی اور فدویت کا ملکہ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارات سے گزر کر ان کی دلالات و اشارات میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سر تا پا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے سامنے نہیں آتے یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیاد استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیونکہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل مامور و منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام "آداب شرعیہ" ہے۔ اس لئے یہی آداب در حقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آنچ نہ آئیگی اور جونہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہو جائے گا۔

## حدود ادب

البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق وہ۔ ان ہی نصوص کتاب وسنت کی دلالت واشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے' جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی وصحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع' پیروی ء سنت اور محبت نبوی اور عشق خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت وقرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدر ناشناسوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب ودواعی زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہ چاہے ممنوع نہ ہوں مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آکر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا' اس کی آواز پر کان دھرنا' اس کی خوشبو پر ناک رکھنا' اس کی طرف چل کر جانا' اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیر گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب ودواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے' ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے ورنہ فی نفسہ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائے گا جو اس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچالے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر ودھیان دوڑانا بھی جائز نہیں بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر وتصور سے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحۃً اسے زنا کے تصور ودھیان سے روکنے کا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوال قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوق احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے

کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جب کہ ظواہر اعمال کی مشق وتکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل سے بھی باز آجائے عمل یا شریعت یا شریعت کی حدود سے متعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ اسی سلسلہ عمل کو ایک باطنی کفارہ تصور کیا جائے گا۔۔۔۔۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اٹھتی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آداب شرعیہ کہیں باہر سے لاکر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔

## تحفظ دین کا طبعی نظام

اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچنے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے گئے' جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے تاکہ ان کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔۔۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترک شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نہیں' لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیت کبیرہ تک پہنچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترک تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظام شریعت کی لائنوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا جس کے لئے فتویٰ کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تقویٰ کا کلمہ استعمال کریں گے۔

سطح پرست نگاہوں میں تقویٰ کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیال نظر آئیں لیکن دور بین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارم شریعت کی شاہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں تاکہ غیر محتاط چرواہے ان ڈول بندیوں سے بھی باہر ہی باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب وسنت کے الفاظ میں صراحۃً نظر نہ آئیں معانی کتاب وسنت کا جز بن کر مامورات ومنہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

## ذوق ادب کا نتیجہ

فقہاء و مجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نور اجتہاد سے کھولدیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر ان کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا و شراب کے جزئیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ۔

اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کرلیا۔

پس اگر نصوص کتاب و سنت میں لفظوں میں اسی خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا' بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی کھلی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوق ادب اور ذوق تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگیں شربت پیتے ہوئے (جو بلا شبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیونکہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاءً ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائیگا تو دیانۃً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائے گا۔

## مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات

ہاں پھر جیسے افعال زنا و شراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا قضاءً نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دی جائیں تو انفسی ہی سہی یعنی فعل زنا و شراب پر اگر سنگساری اور درہ زنی کی حد جاری ہوتی تو اس ذہنی زناکاری اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں' آفات غم والم تشویش و پراگندگی فتنے اور پریشانیاں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت و کدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے ۔۔۔۔

"نیست بیماری چو بیماری دل"

پس یہ تشریحی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیونکہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر وخیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے من اللہ ہی ہیں۔

بہر حال ظاہر وباطن میں سے بھی شراب خوری وزناکاری کا صدور ہوگا اور ان سے کسی پر بھی آدمی مؤاخذۂ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِی اَنفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

”اور جو باتیں نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا دل میں پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے پھر بجز کفر وشرک کے جس کے لئے بخشنا ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں“۔

حاصل یہ نکلا کہ:

قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور رسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب وارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب وزنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود تعزیرات جاری ہوتی تھیں لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت وجلال اور ظاہر وباطن میں اس کے حاضر وناضر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا وشراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

**وسائل عبادت پر اجر وثواب** آداب کے سلسلہ میں دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں یہی صورت ماموارت کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے، مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی ہیں مثلاً جماعت ہے جو موجب پابندی نماز اور باعث ترقی اجر وقرب ہے تو وہ سنت موکدہ قرار دی گئی پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت موذن (یعنی کلمات اذان سننا اور موذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی آواز سے انہیں دہرانا مستحب قرار دیا گیا) جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت

ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت موذن اور حاضری کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب و تاکید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت موذن کا اور اجابت موذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعت اور یہ اقدام جماعت وسیلہ ہے پابندی صلوٰۃ کا جو اصل مقصود ہے اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزیل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت موذن کے اختتام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا' حاضری مسجد کے اقدام پر قدم قدم ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا' حاضری مسجد اور انتظار صلوٰۃ کو حکم میں صلوٰۃ کے رکھا گیا' شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر و ثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اسے فحش و منکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل و تکمیل کے وسائل اور حدود ہیں اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

## تارک آداب تارک شریعت ہے

پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ مامورات میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافع محرمات ہے' فرائض کے آداب اقتداری حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجا لانے سے فرائض کے آداب میسر آئے گا فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب و نقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی ترکیباتی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کر کے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض و محرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے' اس لئے کتاب و سنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے جن میں بعض آداب قرآن و حدیث کی عبارت میں صراحتہ

موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت واشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہا ملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہر کس وناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اس لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

## فقہاء کا مقام معرفت

الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوا یا سرے سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کی الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قید وبند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شرک فی النبوت وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں لیکن حقیقت شناس مبصر جو ان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان فقہا نے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے بلکہ احکام کے ظاہری وباطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری وباطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با' کے بتیس حروف میں ہزارہا کلمات وعبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با' سے گذر جانے والا مبصر ہی ان حروف کی ترکیب وتحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے مبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔ پس یہ فقہاء امت کسی ناتمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آجانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ نویسی کر دینے تک محدود نہیں رہ جاتے بلکہ امت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلل اور پھر آثار ونتائج سے باخبر رہ کر ہی شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزء کی تشخیص اور دواء مرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں جس سے ان کا مطب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول وقواعد پر کرتی آرہی ہے تاآنکہ دوست دشمن کوئی بھی ان کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ راسخین فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مظہر احکام ہیں، اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے، اس لئے آداب شرعیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرہ سے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطن نصوص کو ترک کر دیا جانا اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان ہی ہے بلکہ خسران بھی ہے۔

**ذوقی آداب** پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی ادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے اگر کوئی مکان اللہ ورسولؐ کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ وبیت الرسول یا آثار ومشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ ورسولؐ کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا اور رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث ودینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطور رغبت جھک جاتا ہے گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل وعیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابوایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکڑ کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ ان کی سیدھ میں نیچے نہیں ہوں گے۔

حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ ﷺ کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علیؓ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعمیل ہوا۔ جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل و طاعت تھی۔

امام ابو حنیفہؒ زیارت مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبیؐ اور مرقد صحابہؓ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔۔۔ امام مالکؒ نے جو امام دار الہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے عرصہ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑھ جائیں جہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے مکہ معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے، میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دار العلوم دیوبند، حضرت صابر کلیرؒ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پاپیادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔۔۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر متبعین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

**اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ** حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس و خاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید و اتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیونکہ یہ ان اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے تھے اور جن آداب کی دعوت

شریعت اسلام نے پیش کی خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت واشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ و بیان کے مقررہ کلمات ادا کر دینا یا سر جھکا دینا ہوں بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر و نظر کے ساتھ نصوص کے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عمل در آمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال و تصور وریاضت نفس مجاہدۂ عمل تادیب جوارح تزکیۂ باطن و تصفیہ قلب اور لوجہ اللہ ترک شہوات ولذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحاء نے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ س اپنے دین ودیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

**سر چشمۂ ادب** اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے نہ تزئین الفاظ وفقرات نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے ہیں نہ سلاست بیانی کے نہ مروجہ رسوم ہیئت و بدن باقی رہتی ہیں نہ بناوٹی تعظیم وتوقیر بلکہ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت وادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کی بجائے، خلوص آرائش کی بجائے فنائیت و محویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام و بیان کو حدیث نبویؐ میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت ورطۂ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنا دیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سر چشمہ ادب ہے۔ ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است
عشق راخود صد زبان دیگر است

بوئے او دلبر چو پراں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم وادب کو حدیث نبویؐ میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں، اسی طرح علم وادب بھی محض رونق محفل کا آلہ بن کر رہ جائے نہ رونق باطن بنے اور باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے، رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں، مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں اسلئے الفاظ ورسوم ادب کا یہ

بے روح نقشہ ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے اور نہ ان کے شایان شان ہے اور نہ اسے جوہر عمل کہا جا سکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جائے جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالارہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ، عامیانہ، رسمیانہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب و اخلاق اور منکسرانہ حدود و رسوم پر لگا دے تاکہ انسان میں فناء نفس اور رضاء حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نماز پورے اسلام کی میزان

## نماز میں عبادت کا پہلو

شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے، نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضاء بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء سے فاتحۂ سورت تک پھر تسبیحات سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت، غلامی اور فدویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے سوا کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا اور ہیئات کے لحاظ سے نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً بیتہً اعتراف ہے جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے۔

## نماز تمام کائنات کا جامع ہے

ارشاد ربانی ہے:

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ.

یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے، مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے، ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں، چوپایوں کی نماز رکوع ہے، وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں جس سے انحراف نہیں کر سکتے، پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے، ان کی خلقی ہیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں گویا ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں رہتے ہیں، پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔

گویا ہر وقت زمین پر دوزانو جمے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں، جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے، پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔

پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آجاتے ہیں۔ جیسے ایک نمازی رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے۔ پھر زمین کی نماز تکوینی جمود اور سکون

ہے گویا ساکت اور صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔

پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پر کردے پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جو ان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں نبی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام کسی قوم کی نماز نیم قیام کہ گھٹنوں کے بل ڈنڈوٹ کھیلنا کسی قوم کی نماز محض رکوع کسی قوم کی نماز اوندھا لیٹ جانا (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعہ صلوٰۃ اقوام ہے ہیئات میں درختوں کا سا قیام چوپایوں کا سا رکوع فرشتوں کی سی صف بندی آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے جس کو دوسرا انہیں سمجھ سکتا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ.

یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کئے گئے کسی قوم کو تعوذ کا حکم تھا کسی پر سوال و دعاء کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا دین مکمل کر دیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کر دی گئی جو فطرت الٰہی نے اقوام عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

**اوقات کی جامعیت** اوقات نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لیا ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا مغرب کا وقت انقلاب آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے ختم الخیر کر دیا پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔

گویا اگر ایک انسان تمام اذکار و اطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب و نفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔

نماز میں روزہ اعتکاف، حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔

روزہ کی حقیقت ہے، صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متمتع ہونے سے بچنا' یہ چیزیں نماز میں بھی ممنوع ہیں بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام' کلام' عورتوں کو چھونا' ہنسنا' بولنا'

چلنا، پھرنا اور عام نقل و حرکت سب ہی ممنوع ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بستر پہ پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفسد صلوٰۃ ہیں بلکہ مسجد میں ٹہلنے نقل و حرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی ---- حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط وصحت صلوۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہو سکتی، پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے تعظیماً رفع یدین کر کے نماز شروع کرتے ہیں پھر جس طرح طواف اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے، نماز میں ہمہ قسم اذکار (تلاوت، درود شریف، تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحد عرفات یاد حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے، بعینہ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے، پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے، بعینہ نماز میں سلام ودعاء کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے، غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہ یا بمثلہ موجود ہے، زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے، یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا نماز میں بھی تزکیۂ نفس اور تزکیۂ روح ہے کہ نفس ماسویٰ اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہو رہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے کہ نماز کے لئے مسجد، چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

### نماز سے انانیت نفس کا ازالہ

نماز سے انانیت اور کبر نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزارہا بد خلقیوں اور بد اعمالیوں کی اساس ہے کیونکہ کبر نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

### نماز میں فن تصوف کا موضوع

فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے یعنی نفس کے

رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں، نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں نفس اور رب، نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی ہے تو وہ مر جاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نماز سامنے کر دیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں اور وہ اپنے فضائل سے نواز تا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

## روحانی اور اخلاقی مقامات

نماز چونکہ تزکیۂ نفس کر دیتی ہے اس کے بعد نفسانی احوال و مقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہو جاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے لیکن بلا واسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہو جاتے ہیں، آدمی بلند پایہ ہو جاتا ہے، شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے، اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی الحمدللہ رب العالمین ہے جس کی حقیقت ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے، رضا بالقضاء کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے، شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نزاع کا خاتمہ

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

## اجماعی مسلک

امابعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور و معروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیو بند حسب عقیدہ اہل سنت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں اور ان کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارک کا ویسا ہی تعلق قیام ہے جیسا کہ دینوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں نمازیں پڑھتے ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ و سلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیو بند نے یہ عقیدہ کتاب و سنت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متوارث ہی رہا ہے۔ حتی کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا، لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں از خود ایک مفصل استفتاء مرتب کر کے علما دیو بند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری ؒ نے ایک مفصل جوابی فتوی بنام المھند علی المفند میں بھی علماء دیو بند کا نقطہء نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات 'حیات دینوی ہے، نیز اسی ذیل میں اس نقطۂ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دار العلوم دیو بند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ آب حیات کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پر از حقائق و معارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ یہ بھی تھا کہ علماء دیو بند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توارث کے ملا ہے۔ کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور ہنگامی فتوئی نہیں ہے جو حوادث کے پیش آنے

سے اتفاقاً سامنے آگیا ہو۔

**مفاہمت کی بنیاد**

پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیو بند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلہ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکورہ سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیو بند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض دیو بندیا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا موہوم ہوں سو اگر اس سلسلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کی مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جاسکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جاسکتی تھی کیونکہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے مسلکی اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہو سکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کی قدر مشترک کے مکلف ٹھیرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے، اسی لئے مسئلہ حیات النبیؐ کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفاصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کی قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

**اجتماعی نقصان**

بخت واتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیو بند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا مبنی متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے مدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں، جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیتہً مسلوب نہیں سمجھی جاسکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آگیا اور اس میں ردوقدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی

پیدا ہو گئی اور آخر اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی بس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع وجدال کی باہمی صورت اختیار کر لی گروپ بندی شروع ہو گئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آگئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آگیا اور خود جماعت دیوبند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے' جانبین سے رسالے لکھے گئے اخباری بحثیں چھڑ گئیں جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات ورسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا دوں دوں دل کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع وجدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانہ قیام لاہور' جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے دوران ملاقات احقر نے اس نزاع وجدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ یہ صورت بہر نہج ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے اور اس کی وجہ سے تفریق و تفرق و تخریب کے ان مضر اثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے' کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آجائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور دردانگیز لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرادیں۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں' اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریقوں نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے' اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام و قبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہو گئی اور ارادہ کر لیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صوت پیدا کی جائے چنانچہ جواب میں کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے چنانچہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ' شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کروں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تاکہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلاف دیانت رائے تبدیل کر دینے یا مسئلہ کو کم وبیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آجانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کی قدر مشترک پیش کر کے اس کی تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی جو مضر ثابت ہو رہی ہیں پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضر اثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدر مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تاکہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جا سکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا۔ اس موقعہ پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ علیحدہ رکھ کر گفتگو کی طے یہ پایا کہ قیام ملتان کی قلیل مدت اس مسئلے کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبے کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کر دی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے، احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا، جس کو ان حضرات نے بہ خوش دلی منظور فرمالیا مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہو گئے اور مسئلہ حیات النبی کا قدر مشترک زیر غور آیا طے یہ پایا کہ قدر مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑ سکے اور عوام بطور عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبند کی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان

حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کر کے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

**قدر مشترک** چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہو گئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اول سے آخر تک ساری روداد بیان کر کے مسئلہ کی وہ منقح قدر مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھی گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختم مجلس تک الحمدللہ یہی ماحول قائم رہا، نہ اس میں ہار جیت کے جذبات تھے نہ غلبہ ومغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدر مشترک کے عنوان کو قبول کرلیا۔

اور اس قدر مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی فریقین نے دستخط فرمائے اس یادداشت کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

> "عامۂ مسلمین کو فتنۂ نزاع وجدال سے بچانے کیلئے مناسب ہوگا کہ مسئلہ حیات النبی ﷺ کے سلسلے کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدر مشترک ہوگا ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے گا تفصیلات پر زور نہ دیا جائے عبارت حسب ذیل ہے:
>
> وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں"۔

____ احقر محمد طیب وارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

____ (مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ۔

____ لاشئ (مولانا) غلام اللہ خان

____ (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چونکہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے، بناء بریں اس عبارت پر ان کے دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عبارت بالا ان کی مسلمہ سمجھی جائے۔

### حق گوئی اور انصاف پسندی

چونکہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بوجہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لا سکے' اس لئے احقر کے عرض کرنے پر اور مسودہ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

"ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں' اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبیؐ میں اس تحریر کی حد تک ان پر برأت کا اعلان کر دیں گے' نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبیؐ پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے"۔

نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ

لاشئ غلام اللہ خان (۲۲جون ۱۹۶۲)

اس تحریک پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

### سکوت مصلحت

تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود و سلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپؐ کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے' بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل نہیں ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ مؤول سمجھا جائے گا۔ گو ان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے کہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے ان پر زبان طعن و ملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قرین انصاف و صواب نہیں بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنّت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں' اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کر لیا جانا ہی قریب مصلحت اور جانبین کے لئے

مفید ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے محترم سید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنّت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل السنّت والجماعت ہی ہو مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جا رہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روا نہ رکھا جائے۔

## فروعی اختلاف کی حیثیت

اس طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی اختلافات کو مناقشات اور جدال ونزاع کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اس قسم کے اختلافات امت کے لئے آسانیوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا' اس لئے علماً و اعتقاداً جمہور سلف وخلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خو پیدا نہ کریں۔

آج امت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کی متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔

## خوشی کی لہر

آخر میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبردہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گذارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سمع قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا'

**فجزاهم الله عنی وعن جميع المسلمين خير الجزاء.**

اس نئی اصلاح صورت کا سبب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدارت حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاسنامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔۔۔ تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی۔ جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اور ان ہزارہا انسانوں کے ہجوم نے بے تحاشا تبریک وتہنیت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

## اعتراف شخصیت

ختم تقریر پر ایک جانب مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس

بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخدلانہ اور مخلصانہ لب ولہجہ سے فرمایا کہ ہم نے مہتمم دارالعلوم کے درمیان میں پڑ جانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کو ختم کر دیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آرہی تھی وہ اس شخصیت (احقر ناکارہ) کے درمیان میں آجانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی بلکہ واقعہ ہو کر سامنے آگئی اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کو مہتمم دارالعلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سرابراہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دارالعلوم دیوبند حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وہ قاسمی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کو اس پر متحد کئے ہوئے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پاسکتی تھی۔

### جذبات مسرت

بہر حال ہم نے اس نزاع کو ختم کر دیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ ان دو تقریروں کے بعد ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے "مہتمم دارالعلوم زندہ باد" "دارالعلوم دیوبند زندہ باد" اور "علماء دیوبند زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کئے، کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجب حرکت تھی جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آرہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہو گئیں۔

بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جو تحریک احقر کے قلم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان، سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حداتم تک پہنچ گئی۔

خدائے برتر توانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چار سال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار روبہ زوال نظر آنے لگے۔

الحمد للہ اولاً وآخراً۔

حق تعالیٰ اس یگانگت کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کو جزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کو ان پر لگائیں۔

احقر محمد طیب غفرلہ
(۱۹۶۲/۶/۲۴ء)

## مولانا مدنی قدس سرہ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں
اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے‘ آج مولانا مدنی قدس سرہ کہہ رہے ہیں مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ‘ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور وابستگان کو غم واندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر‘ جمعیت علماء ہند کے صدر‘ جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی‘ دینی‘ روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۸۵۷ء ہی پر انتہا ہو گئی۔ اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۷ تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہو گیا۔

**کمال جامعیت** حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی‘ عزم و ثبات‘ ہمت مردانہ‘ اٹل ارادہ‘ علم و بصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی‘ آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی‘ اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص و عوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام اسلامی علوم و معارف اور ایشیائی فنون اور آداب کے علمبردار تھے اور آپکی ہمت ظاہری و باطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے جو اس مرکز علم و فن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی‘ آپ اپنے اساتذہ و شیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر شیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے‘ اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ شیوخ کی علمی و عملی یادگار تھے۔ قرآن و حدیث‘ فقہ و تفسیر‘ ادب و خطابت‘ منطق و فلسفہ کی مہارت و حذاقت آپ کے قول و فعل سے نمایاں رہتی تھی۔

آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔

باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگی، نفس، تقویٰ و طہارت، ضبط اوقات تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی و قومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ "ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو" آپ کی ذات گرامی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

## ایک حسین امتزاج

مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے، حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث و قرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے، ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کر سکتا تھا۔ دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کا نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس و تدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کے میدان کو بھی سر کر لیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا، ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت و عظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر و باطن کے معترف رہے۔

## شیخ العرب والعجم

حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب و عجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پا کر حرم نبویؐ میں درس قرآن و حدیث اور تدریس علوم فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوت کی خدمت کی جس سے عرب و عجم کے لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے، آخر کار عمر کے آخری

حصہ میں ۳۳ برس کامل دارالعلوم دیوبند کے صدارت تدریس پر فائزرہ کر مشرق ومغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

**سیاسی نقطۂ نظر**

ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے۔ جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی سیاسی فلسفہ وحکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے، آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی جس کے لئے انہوں نے اپنی محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کا قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس آزادی کی وہ روح جوان کی روح میں پیوست تھی، صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط واقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لامذہبیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستاں کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آسکتا انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزدی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی اسی لئے جہاں آزادی کی

جنگ ان کے دست و بازو کا اثر تھی وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الٰہیہ کی عطاء فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود متقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کے مزاج الگ الگ ہیں لیکن فوجی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے۔ اگر یہ بیماری رفع ہو گئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلامؒ نے اپنے بزرگوں کی ظاہری و باطنی رہنمائی میں کام اور علم و تحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس طاقت ور نصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیاو مشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔

آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیۃً نہیں ٹوٹیں تو ان کو توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والا ضروری پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی‘ ایشیا کی آزادی اور آخر کار اخلاق و انسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

### مرکب نصب العین

اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دار العلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب و سنت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح و تربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ و خانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑ کر رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور ماہیت اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

**مینارۂ نور** بہر حال حضرت شیخ اس دور الحاد و بے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان ؂

"شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے"

یہ نور ان سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کار فرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس جوش و جلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے۔ جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پر فتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاوداں ہو گئی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی ۔۔۔ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا' لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی' جو یقیناً مقبولیت عند اللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت و طمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں وہی موت کے بعد بھی ہے مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتی کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اس محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہند و بیرون ہند سے تعزیتی فون' تار' اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا' ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہو گیا' لوگ جس شخصیت کے ارد گرد پروانہ وار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگان حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقۃً مرتے ہی نہیں' صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے جس کی بناء ان کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے۔ بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں' اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

**معنوی معیت**

آج حضرت مدنیؒ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود' ان کا نمونہ عمل موجود' ان کا علم موجود' ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کے محبوبیت موجود' اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون و قرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے' ان کی معنویت موجود' اس سے استفادہ اور اسکا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہو گا۔ اور ایصال ثواب کے ذریعے حضرت مرحوم کے لئے وجہ سرور و انبساط ہو گا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور ان کے حق میں سکون و راحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اس کو دعاء و ایصال ثواب میں یاد رکھتا ہے اس لئے غم غلط کرنا اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہو سکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمربستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہو گا۔

حق تعالیٰ شانہ' حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب و درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل' اجر جزیل اور ذوق تعمیل عطاء فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آسکتے تھے' بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے ذکروا محاسن موتاکم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روانہ رکھا جائے۔

وھو الباقی من کل شیءٍ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انٹرویو

# قندیل راہنمائی

انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے، کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں بناتا ہے لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لاثانی اور لافانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الٰہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔ وہ علم و عمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔ دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔ انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔ علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم و جدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش بر آواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی متنفس موجود نہ ہو۔ کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر و نظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے قندیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام پاکستان کی تقدیر ہے

پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے

اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا۔ ہم زبوں حال رہیں گے۔

## نفاذ اسلام کا مرحلہ ترتیب

یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ

اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے۔ تو خیال گزرا کہ جتذکرہ بالا سوال پر ان کے علم ونظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لئے گئی۔ وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میرے سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا۔

”فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔

(1) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کردے جو قرآن وسنت کے منافی یا ان سے متحارب ہوں مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدرآمد ہو۔

(2) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الٰہی پر دل کی گہرائیوں سے کاربند ہوں۔ رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید وفروخت، لین دین غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے“۔

## علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت

ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنادیا جائے کہ کوئی بھی دین سے ناآشنا نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں رہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترھویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

”اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو“۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں جب دلوں

میں یہ لگن پیدا ہو جائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے' جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کرلیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اسی طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہ رجحانات فلاحی برگ و بار لائیں گے۔ خود رسول مقبول ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرامؓ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک ایک پہلو آنحضرت ﷺ سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرز جان بنا لیتے تھے۔

قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھرانے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی' محلے محلے' قریہ قریہ اور شہر شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

## نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری

قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں' نجی گھریلو' اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کرلے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہٰذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ ؎

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں' نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زبانی تبلیغ کار بے خیر ہے۔ کیونکہ قول موثر نہیں ہوتا' اصل اور

موئثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔

لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے۔۔۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنالیں۔

## نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار

جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنت کو ٹھہرا لیا جائے، عوام قانون پر چلتے ہیں لہٰذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن وسنت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد، اخلاق اور معاملات کی کماحقہ، تعلیم دی جائے، پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرا لیا جائے جو رسالت مآب ﷺ کا معمول تھا۔ اگر ہر بچے کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کرلے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہو جائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

## بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر

اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

اسلام، انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب البدر میں آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت مآب کا ارشاد ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازمادر کار ہیں۔

(۱) کسرہ خبز ــــــ روٹی کا ٹکڑا۔

(۲) قطعہ ثوب ۔۔۔۔۔۔ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔
(۳) قطعہ ارض ۔۔۔۔۔۔ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔

اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضروریات سے محروم نہیں دیکھتا' لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کمر پر غلے کی بوری لاد کر ضرورت مندوں کے جھونپڑوں تک پہنچایا کرتے تھے' جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا' اس سلسلے میں اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں کچھ نیچے اتار اجائے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انہیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضاء قائم کی جائے۔

## اتحاد مسلم

مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت واہمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ۔

"مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ ضمنی اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیونکہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ ومجادلہ نہ کرو' لہٰذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہو جائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں عمل پیرا رہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم اہم شرط یہ ہے کہ منفی انداز فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ رسول مقبول ﷺ کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخدلی اور وسعت قلبی کا تھا۔ آپؐ کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی تکریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے' جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاج وضاحت نہیں"۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل تکریم قرار پائے گی۔

## اکابر دیو بند کا مشن

مزید فرمایا کہ ۔

دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبولؐ سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے ۔
”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد' والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے' مزید فرمایا کہ اکابر دیو بند کا مسلک اور مشن یہی تھا' جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔ حتی کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپادیں“۔

### ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبے اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتادی کا لہجہ نمایاں ہو تا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔

بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں ۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانان حد پورے عالم اسلام کے لئے درد مندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعاء مانگتے رہتے ہیں۔ پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔ اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

### حضرت مدنیؒ اور قیام پاکستان

شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے انداز فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے۔۔۔ ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابو الکلام کے سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنیؒ اور مولانا ابو الکلامؒ اپنی دینی وجاہت اور جہاد حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیام پاکستان کیخلاف تھیں۔۔۔ آخر

کیوں ؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت مدنیؒ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔ حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آرا ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہر دم لازم ہے۔ پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جا سکتی یہی حال قیام پاکستان کا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہو گیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

## مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان

مولانا ابوالکلامؒ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے۔۔۔۔؟ اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کر مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرما رہے ہیں۔ میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔ مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں یاد فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوازئیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ اس بارے میں آپ کو بلا جھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہئے۔ لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستانی ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلامؒ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر یا نادانستگی میں غلط اطلاع دی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔ سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیب داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بنا ڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متاسف ہوئے اور انٹیلی جینس کے عملے پر بڑا ملال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔

جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

## خدا حافظ

قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر و نظر اور علم و خبر کی پھول لٹا رہے تھے' خاصا وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جارہی تھی راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت و مرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۷۶ برس کے لیل و نہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (آمین)

از شاعر شیریں مقال جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام **حضرت مولانا محمد طیّب صاحِب** (قدس اللہ سرہٗ العزیز)

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخش علومِ نو ہے
تیری جبیں پر جبیں قاسم کی دل نواز و حسین نو ہے
تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے
'حکیم الامت' نے ایک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے
خدا کے فضل و کرم سے دین کا مقام محمود مل گیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے
ترے تفکر میں قرن اول کی عظمتوں کا نشان ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا
مری نظر میں نئے زمانے کا فخر مصر و حجاز تو ہے
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے
رشید کے باغ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
ملا دوام بہار جس کو گل ریاض رسول تو ہے
فریضہ حج کے بعد اپنے وطن میں باعزوشان آیا
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیل نوجوان آیا
جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزاز دیں بڑھایا
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ
حوادث دہر تیری شہرت زندگی بھر نہ مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

نعمان پبلشنگ کمپنی
اردو بازار، لاہور